تاریخ ڈیرہ غازیخان

(حصہ دوم)

ڈیرہ غازی خان

در ملک قاضی محمد رضاف چیچہ تونسوی

1961ء

عبدالقادر خان لغاری
ایم ایس سی

انتساب

اُس عظیم خاتون کے نام جو میری

ماں

تھی جس نے نہایت غیر مساعد حالات میں بھی
اپنے یتیم بچوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کیا۔

نام کتاب	تاریخ ڈیرہ غازیخان حصہ دوم
نام مصنف	عبدالقادر خان لغاری
مطبع	المحسن آرٹ پریس بلاک ۱ ڈیرہ غازی خان
کتابت	محمد ظفر اقبال الحمرا دارالکتابت بلاک ۲ ڈیرہ غازیخان
تعداد	پانچ سو
قیمت	پچاس روپے
سال اشاعت	جولائی ۱۹۹۰ء

ملنے کے پتے

۱۔ بولان نرسری قادر آباد بالمقابل اللہ آباد کالونی ڈیرہ غازی خان

۲۔ مکتبہ زکریا بلاک نمبر ۱۰ ڈیرہ غازیخان

۳۔ پیرا ماؤنٹ نیوز کارنر بالمقابل اڈا گورنمنٹ ٹرانسپورٹ ڈیرہ غازیخان ۔

۴۔ بلوچ کتاب گھر اینڈ نیوز ایجنسی ریلوے روڈ بلاک ۱ بالمقابل گرلز ہائی سکول ۱۱ ڈیرہ غازی خان ۔

۵ جمہوری کتاب گھر تونسہ شریف ۔

عرضِ ناشر

تاریخ ڈیرہ غازی خان حصہ دوم کی کتابت کا مسئلہ اس مرتبہ بھی بڑا مشکل رہا۔ کام کی ابتدا جناب طاہر رضوان نے شروع کی۔ انہوں نے ۳ تا ۶۷ صفحہ تک کتابت کی تھی کہ وہ تربیت پر لاہور چلے گئے۔ تلاش بسیار کے بعد جناب محبوب الٰہی کھوکھر سے کام شروع کرایا اور انہوں نے صفحہ ۶۸ تا ۱۴۲ تک کام کیا تھا کہ ان کو یہ کام اپنی صحت کی بنا پر چھوڑنا پڑا۔ آخر کار ظفر اقبال نے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا جن کا میں بے حد مشکور ہوں۔

ارادہ تھا کہ ذاتی مجموعہ نوادرات قدیمہ کے اکثر و بیشتر حصے کی فوٹو کتاب میں شامل کرونگا تاکہ اس طرح سے ڈیرہ غازیخان میں عجائب گھر کے نہ بننے کی کچھ کمی پوری ہو جائیگی مگر جب فوٹو تیار کرانے شروع کئے تو وہ غیر معیاری اور صاف نہ تھے۔ مجبوراً یہ ارادہ ترک کرنا پڑا اور صرف چند تصاویر شامل کیں وہ بھی چنداں اچھی نہیں۔ ان میں کچھ میری ذاتی فوٹو ہیں جو ۱۹۵۲ء میں دلورائے کے ٹھیڑھ میں لی گئی تھیں۔

کتاب کی تیاری کے سلسلہ میں جناب چودھری محمد یعقوب ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر حال لیہ کا میں بے حد ممنون ہوں۔ چونکہ وہ خود بہت بڑے عالم و فاضل اور وسیع مطالعہ کے مالک ہیں۔ لہٰذا ان کے ڈیرہ غازیخان کے قیام کے دوران اُن سے علمی تبادلۂ خیال ہوتا رہا۔ انہوں نے کتاب کی تیاری میں مفید مشوروں سے نوازا جس کے لئے میں اُن کا تشکر گزار ہوں۔

عبدالقادر خان لغاری
ڈیرہ غازی خان
جون ۱۹۹۰ء

فہرست مضامین

صفحہ نمبر

صفحہ نمبر

باب نمبر ۹

صفحہ نمبر

صفحہ نمبر

باب ۱
ڈیرہ غازی خان کے بلوچ قبائل

ضلع ڈیرہ غازی خان میں بلوچوں کی آمد کے متعلق پہلی جلد میں ذکر ہو چکا ہے کہ وہ ابتداء میں جھیل کیسپین کے جنوبی ساحل پر آباد تھے۔ پھر سفید ہن یا ھیطال کے دباؤ نے انہیں جنوب مشرق کی طرف نقل مکانی کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ کرمان میں آباد ہو گئے۔ ان خانہ بدوش قبائل کے اتحاد نے بلوچ قومیت کو جنم دیا۔ تاہم بلوچوں کے متعلق یہ صرف ایک نظریہ ہے۔ کئی مؤرخوں نے اس سے مختلف نظریات پیش کئے ہیں جو درج ذیل کئے جاتے ہیں:۔

نسب:۔ بلوچوں کے اپنے بیان کے مطابق وہ حضرت امیر حمزہ کی اولاد ہیں۔ انکی روایت جو اب ایک بلوچی نظم کی صورت میں موجود ہے، بلوچی شاعر کہتا ہے ؎

"ما مریدوں یا علی اے دین ایمان ثابتیں
حمزہ اولاد بلوچ صوب درگاہ گریں"

یعنی ہم بلوچ حضرت علی کے مرید ہیں اور ہمارا دین ایمان ثابت ہے۔ بلوچ حمزہ کی اولاد ہیں۔ اور ہمیں فتح درگاہ الٰہی سے نصیب ہے"۔ یزید کے وقت حلب سے نکل کر ایران میں داخل ہوئے۔ اس مفروضہ کو تسلیم کرنے میں تاریخ مانع ہے کیونکہ ظہور اسلام سے قبل بلوچوں کا ذکر ملتا ہے اور امیر حمزہ عم رسول اللہ کی کوئی اولاد نرینہ نہ تھی۔ یہ ممکن ہے کہ بلوچوں نے کسی حمزہ کے دست مبارک پر اسلام قبول کیا ہو اور اس طرح سے وہ ان کی روحانی اولاد بن گئے ہوں۔ بعض اوقات مرور زمانہ کے ساتھ نام خلط ملط ہو جاتے ہیں۔ وہ کوئی حمزہ ہو گا جس کو امیر حمزہ عم رسول اللہ سے بدل دیا گیا کیونکہ ہر قوم نے اپنی نسلی برتری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ دنیا میں ایسے کئی ناموں میں غلط فہمی پیدا ہوئی ہے۔ عراق میں دجلہ اور فرات کے سنگھم پر قرنا نامی قصبہ میں ایک شیشم کا درخت ہے جسے شجر آدم کہا جاتا ہے۔ مقامی لوگوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت آدم جب جنت سے نکلے تو ان کے ہاتھ میں درخت کی ایک ٹہنی تھی جو انہوں نے یہاں گاڑھ دی۔ وہی لکڑی پھوٹ کر درخت بن گئی۔ اب اس درخت کیلئے زائرین دور دور سے آتے ہیں۔ حالانکہ اس درخت کی عمر تین سو سال سے زیادہ ہرگز نہیں۔ یہ درخت آدم نامی کسی شخص نے لگایا ہو گا۔ جو وقت گزرنے کے ساتھ حضرت آدم سے بدل گیا۔

(۱) The Peoples of Pakistan P. 96 YuvGankovsky
(۲) تاریخ بلوچستان 8-155 لالہ ہتو رام

شاہنامہ فردوسی میں بلوچوں کا کئی بار ذکر آتا ہے جہاں وہ ایران کے فرمانرواؤں کے موافق اور مخالف جنگ آزما نظر آتے ہیں۔ عاشقش، کیخسرو اور کیکاؤس کے عہد حکومت میں بلوچ ایرانی فوج کا بھاری عنصر تھے۔ اُن کی دلیری اور بہادری ضرب المثل تھی۔ دشمن نے میدان جنگ میں بلوچ کی پیٹھ کبھی نہیں دیکھی تھی کیونکہ وہ میدان جنگ سے جان بچاکر بھاگنے کی بجائے کٹ مرنے کو باعث افتخار سمجھتے تھے۔ اُس وقت کے بلوچ فوجی کے سر پر کلغی طرہ امتیاز تھی۔ اردشیر پاپکاں اور نوشیرواں کے عہد میں اُن کا ذکر بطور ایک سرکش قوم کے ملتا ہے۔ "برہان قاطع" مصنفہ محمد حسین التبریزی نے بلوچ کی وجہ تسمیہ میں لکھا ہے "مرغ کی کلغی، چوٹی یا ایک وحشی قوم جو کرمان کی سرحد پر آباد ہے۔ کہا جاتا ہے کہ وہ حجازی عربوں کی اولاد ہیں۔ اُن کا پیشہ جنگ اور غارت گری ہے" برہان قاطع ایک لغات ہے اور کلغی اس لحاظ سے درست ہے کہ ایران قدیم میں بلوچ فوج کا قومی نشان کلغی اور شیر کی کھال تھی۔ ہندو مورخین نے لفظ بلوچ کی بناوٹ بَل اور اُوچ سے کی ہے یعنی طاقتور۔

ایڈورڈ۔ ای۔ آلیور کے خیال کے مطابق "بلوشش اور کشش وبلوشش ایران میں خانہ بدوش قبائل کے معنی میں لئے جاتے ہیں"۔ سر ہنری پوٹنگر کے مطابق بلوچ ترکمان ہیں۔ اسلامی حکومت کے ابتدائی دور میں بلوچوں کا ذکر ملتا ہے۔ "86ھ میں خلیفہ ولید بن عبدالملک نے محمد بن ہارون مکران بھیجا۔ اُس نے وہاں پہنچ کر اس مملکت کو فتح کیا اور وہاں کے اکثر باشندوں کو جن کی اکثریت بلوچوں کی تھی شرف اسلام سے مشرف کیا"۔ ایک اور جگہ لکھا ہے کہ "22ھ میں جبکہ تمام ایران پر اسلام کا قبضہ ہو گیا تو عبداللہ بن عامر بن ربیع نے کرمان پر حملہ کیا۔ کرمانیوں نے اپنی بہادر قوموں کوچ و بلوچ سے مدد مانگی مگر اُن کی کمک سے کوئی فائدہ نہ ہوا"۔ تحفۃ الکرام نے امیر کی ایک پری سے شادی کی کہانی لکھی ہے جس کی اولاد بلوچ کہلائی۔

بلوچوں کی پنجاب میں آمد

بلوچ جب بلوچستان میں آباد تھے تو اسوقت اُن کے چوالیس قبیلے تھے اور اُنکا سردار میر جلال خان تھا۔ میر جلال خان کے پانچ بیٹے تھے جن کے نام رِند (بمعنی ثابت قدم)، قرائی

Across The border — Pathan & Baloch Edward E. oliver

تاریخ فرشتہ مطبع منشی نولکشور لکھنو ھ66 ابوالقاسم فرشتہ

تاریخ سندھ ، مولانا عبدالحلیم شرر

تحفۃ الکرام ، علی شیر ٹھٹھوی

ہوت (اعلیٰ نسب) اور جتو تھے۔ جتو کے متعلق بلوچوں میں اختلاف ہے کہ بیٹا تھا یا بیٹی مگر حقیقت یہ ہے کہ میر جلال خان کے بیٹے کا نام جتو تھا جبکہ بیٹی کا نام جتو تھا اس طرح کے کئی بلوچی نام بیان کئے جا سکتے ہیں مثلاً وسّو اور وسو، کٹّو اور کٹو، جندُو اور جندو وغیرہ جن میں مؤنث اسم ہنسو اور کرو کے وزن پر واؤ مجہول جبکہ مذکر اسم بروزن لٹّو واؤ مجہول ہے۔ میر جلال خان کی وفات کے بعد تمام قبائل رند، لاشار، ہوت، قرائی اور جتوئی میں مدغم ہو کر اُن کے گروپ کا حصّہ بن گئے۔ قدیم مورخوں نے بھی بنی نوع انسان کو حضرت نوحؑ کی اولاد حام، سام اور یافت پر تقسیم کیا ہے حالانکہ قرآن کریم میں صاف فرمایا گیا کہ "ہم نے دیگر ایمان لانے والوں کو بھی سفینہ میں بچا لیا تھا۔" (بنی اسرائیل: ۳- مریم: ۵۸- ہود: ۴۰)۔ اس کا مطلب ہے کہ طوفان نوح کے بعد صرف اولاد نوح ہی نہ بچی تھی بلکہ دیگر مؤمن لوگ بھی بچا لئے گئے تھے مگر وہ بھی اولاد نوح میں شامل ہو گئے۔

گونکووسکی لکھتا ہے "پندرھویں صدی کے اختتام کے بعد بلوچ جو جنوب مغربی پنجاب میں وارد ہوئے انہوں نے بھی پنجابی نسل کی تشکیل میں حصّہ لیا۔ بلوچ سرداروں نے مظفر گڑھ اور ڈیرہ جات کے جنوبی حصّہ پر قبضہ کر لیا۔ پھر اپنے عزیز و اقارب اور قبائل کے ذریعہ وہاں قابض ہو گئے۔ بابر پنجاب کے شمالی حصّہ یعنی وادی جہلم میں بھیرہ اور خوشاب، جو کوہستان نمک کے جنوب میں واقع ہیں سولھویں صدی کے ابتدائی حصّہ میں بلوچوں کی علیحدہ علیحدہ آبادیوں کا ذکر کرتا ہے۔ سولھویں صدی کے وسط میں مغل شہنشاہ ہمایوں نے کچھ بلوچ قبائل کو مشرقی پنجاب میں آباد کیا اور انہیں اُس امداد کے صلہ میں اراضی دی جو انہوں نے سوری خاندان کے مقابلہ میں اُسے دی تھی[1]۔

بلوچ بھی افغانوں کی طرح دسویں صدی عیسوی تک صرف نام کے مسلمان تھے[2]۔ آہستہ آہستہ اِن میں اسلام کی تبلیغ ہوئی اور تمام بلوچ دائرہ اسلام میں داخل ہو گئے۔

بلوچ اور نکوداری یا قرونہ ڈاکو

بلوچ کی نظر میں جنگ و جدل زندگی کی معراج تھی اور اسی سبب سے نظام الملک نے لکھا ہے کہ "بلوچ جنگ کیلئے جیتے ہیں اور جینے کیلئے جنگ کرتے ہیں"[3]۔ مسٹر ٹیٹ لکھتے ہیں کہ "جب چنگیز خان کے حملوں سے وسیع و عریض علاقوں میں نظام سلطنت ختم ہو گیا تو وہاں پر ترک اور منگول ڈاکوؤں

(۱) The Peoples of Pakistan P. 109 Yu-V- Gankovsky
(۲) احسن التقویم ص۴۸۷ المقدسی
(۳) سیاست نامہ ص۶۸ نظام الملک طوسی

کے گروہ پیدا ہو گئے جن کو نکوداری یا قرونہ کہا گیا ہے۔ ابتداء میں یہی لوگ تھے مگر جب جن کو بھی ڈاکہ زنی کی عادت پڑ گئی وہ بھی ان میں شامل ہو گیا۔ آخیر دنوں میں کئی اقوام کے لوگ شامل ہو گئے۔ ابتداء میں یہ لوگ 9-1298ء میں خراسان میں ظاہر ہوئے اور ان کا صدر مقام گواچک تھا۔ یزد کا مظفریہ خاندان انگورو کے رہا۔ ان جنگجو نکوداری سرداروں میں سے ایک امیر نوشیرواں ایک جنگ میں زخمی ہو گیا۔ امیر تیمور نے 1384ء میں نکوداری سرداروں اور انکے رفقا کا زاھدان میں قتل عام کیا۔ جلک کے مغرب میں ایک گھاٹی میں "ملکوں کے مقبرے" گوالک میں موجود ہیں۔ اس قبرستان میں نو خاص مقبرے ہیں۔ یہ دو منزلہ مقبرے ہیں۔ اوپر والے حصہ میں بھی قبریں ہیں مگر نچلے کمرے میں انسانی ہڈیوں کے ڈھیر ہیں۔ اوپر والی قبروں میں بھی انسانی ڈھانچے ہیں۔ لوگوں کو ان کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ وہ انہیں صرف ملکوں کی قبریں کہتے ہیں۔ ان پر انسانی اشکال، مسلح سوار وغیرہ کے نقش بنے ہوئے ہیں۔ دفن کرنے کا یہ طریقہ چین میں بھی مروج ہے۔ جب خاندان کا کوئی فرد فوت ہوتا ہے تو اوپر سے ہڈیاں نکال کر نیچے لے جاتے ہیں اور نیا مردہ وہاں دفن[1] کیا جاتا ہے۔ یہ آتش پرست قوم کی باقیات ہیں۔ لاش کو ایک چبوترے پر رکھ کر دیوار تعمیر کر دی جاتی ہے۔ ان میں سے اکثر کی چھت نہیں بنائی جاتی تھی۔ چبوترے پر لاش اسلئے رکھی جاتی تھی تاکہ ناپاک میت زمین سے متصل نہ ہو۔ قبر میں عموماً پاؤں کی طرف ایک سوراخ رکھا جاتا تھا جہاں مخصوص ایام میں ورثاء اکھٹے ہو کر ماتم کرتے....... اسطرح کی آخری تدفین ملک گلزار خان کی موت پر ہوئی۔ یہ رواج اب تقریباً ختم ہو گیا ہے کیونکہ اس پر قبر کی نسبت خرچ زیادہ آتا[2] ہے۔

ان لوگوں کے ساتھ مل کر بلوچوں نے بھی راہزنی کے لیے گروہ بنا لئے جن کا تذکرہ محمود غزنوی، سلطان مسعود، عضدولہ اور معزالدولہ کے دور حکومت میں ملتا ہے۔ مسعود غزنوی نے انہیں خالبس کے مقام پر شکست دی۔ مسعودی متوفی 943ء اور اصطخری متوفی 951ء لکھتے ہیں کہ کرمان کے پہاڑوں پر بلوچ قابض ہیں۔ یعقوبی لکھتا ہے کہ تمام قوموں میں سے بلوچ سب سے زیادہ خوفناک ہیں تاہم ان لوگوں کو کرمان سے چنگیز خان اور سلجوق کی وجہ سے نکلنا پڑا تھا۔ مغلوں کے ساتھ رہن سہن اور ڈاکہ زنی کرتے ہوئے ان کے کئی الفاظ اپنی زبان میں شامل کر لیے مثلاً۔ اڈا بمعنی بھائی، تمندار بمعنی سردار وغیرہ۔ اسی طرح سے کئی نام مثلاً یالاچ، چاکر خان وغیرہ بھی شامل کر لئے۔ چاکر خان

(۱) Sistan ... P. 322 G. P. Tate

(۲) " P. 226-7 "

بھی دَراصل ترکی نام ہے کیونکہ چاکر سلجوقی نے سلطان مسعود ابن سلطان محمود غزنوی کو 1036ء میں امداد دی تھی مگر بعد میں چاکر بیگ نے 1037ء میں مرو پر قبضہ کرلیا۔ نامور سُلطان الپ ارسلان اسی چاکر بیگ کا بیٹا تھا۔ بلوچی تاریخ کا نامور بطل بھی چاکر خان رند ہوا ہے۔

بلوچوں کا اولین گروہ جو پاکستان میں داخل ہوا وہ بروہی کہلایا۔ دوسرا گروہ رند لاشار کہلاتا ہے جو کوہ سلیمان سے گزر کر ڈیرہ غازی خان، مظفر گڑھ اور ملتان میں آباد ہوا۔ اِس گروہ کا ایک حِصّہ صوبہ سندھ اور راجپوتانہ میں داخل ہوا۔ بلوچوں کا تیسرا گروہ ناروہی کہلاتا ہے جو بلوچستان کے شمال مغربی علاقہ، افغانستان اور ایران میں آباد ہے۔

ڈیرہ غازی خان میں مندرجہ ذیل منظم قبائل آباد ہیں:۔

کھتران، بزدار، قیصرانی، تنگانی، کھوسہ، لنڈ، لغاری، گورچانی، سوری لنڈ، دریشک، مزاری،

تاہم مری، و بگٹی قبائل کی تاریخ اور حالات بیان کئے بغیر تاریخ مکمل نہ ہوگی حالانکہ یہ دونوں قبائل ڈیرہ غازیخان کی سرحدوں پر بلوچستان میں آباد ہیں۔

ڈیرہ غازی خان کے دودائی (میرانی) خاندان کی حکومت کے زوال اور خاتمہ پر بلوچ قبائل اپنی اجتماعی حیثیت کھو کر مختلف آزاد قبیلوں میں بٹ گئے جو ایک دوسرے پر اقتدار حاصل کرنے اور لوٹ کا مال حاصل کرنے کی غرض سے ہمیشہ آپس میں اُلجھے رہے۔ اگرچہ بلوچ بہادر اور دلیر تھے مگر اُن کی وفاداری صِرف اپنے قبیلہ تک محدود تھی۔ وہ اجتماعی شعور کبھی نہ حاصل کرسکے۔ قبائل میں نسلی تفاخر اور حسَد نے اُن کو کبھی متحد نہ ہونے دیا۔ وہ اپنے ہمسایہ قبیلہ تک کو "سیال" یعنی غیر کہتے تھے اور ہیں۔ معمولی معمولی باتوں اور رنجشوں پر مدتوں جنگ رہتی تھی۔ اس کے علاوہ قبیلوں کے سردار اپنی رعایا یعنی بلوچ سے کوئی ٹیکس بھی وصول نہ کرتے تھے لہٰذا وہ مالی لحاظ سے غریب ہوتے تھے۔ اِسی سبب سے اُن کے پاس کوئی مستقل فوج نہ ہوتی تھی بلکہ جنگ کے وقت بھی ہر فرد اپنا خرچ اور رسد ساتھ لاتا تھا۔ جب رسد ختم ہوجاتی تھی تو وہ بھی واپس گھر آجاتا تھا۔ اسی سبب سے بلوچ قبائل میں اتحاد نہ ہوسکا کیونکہ وہ کوئی طویل المیعاد منصوبہ نہ بنا سکتے تھے۔ اُن میں قومیت کے وسیع اور بلند نظریے کا فقدان رہا۔ بعض اوقات قبائلی سردار مخصوص موقعوں پر متفق اور متحد بھی ہوجاتے تھے مگر یہ اتحاد اُنکی قبائلی خود سری اور حسَد کی وجہ سے دیرپا ثابت نہ ہوا۔ کسی فرد یا قبیلے کی ناموری بھی بعض اوقات حسَد کی بنا پر خون خرابہ کا باعث بن جاتی تھی کیونکہ حاسد اُسے پھلتا پھولتا نہ دیکھ سکتا تھا۔ یہی وجہ

(۱) History of Persia 1.29 Brig. Gen. Sir Percy Sykes

ہے کہ جب بھی اُن کا کسی بیرونی طاقتور دشمن سے واسطہ پڑا ہے تو وہ اپنی تمام تر دلیری اور شجاعت کے باوجود اکیلے اکیلے آسانی کے ساتھ دشمن کا شکار ہو گئے ۔ رنجیت سنگھ نے جب خوشاب اور ساہیوال کے بلوچوں پر حملہ کیا تو وہ ایک دوسرے کی تباہی تحسین کی نظروں سے دیکھتے رہے ۔ ایڈورڈز اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ جب وہ خوشاب میں مقیم تھا تو وہاں کے سابق بلوچ حکمران کا بیٹا جواہر خان بلوچ اُسے ملنے آیا اور استدعا کی کہ خوشاب کی حکومت اُن کو بحال کر دی جائے ۔ دراصل جواہر خان کو یہ یاد نہ رہا کہ حکومتیں قوت بازو سے حاصل کی جاتی ہیں اور کوئی بھی شخص پلیٹ میں سجا کر اُنکے حوالے نہ کریگا ۔ افغان قبائل میں بھی خون خرابہ ہوتا رہا ہے مگر اُن کا یہ وصف قابل تعریف ہے کہ بیرونی دشمن کے مقابلہ میں وہ اپنے اختلافات بھلا کر متحد ہو کر دشمن کا مقابلہ کرتے رہے ۔
بلوچ قبائل میں دلیری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور وہ اپنے سردار کے نہایت وفادار ہوتے تھے جن سے اُن کا خاندان وابستہ ہوتا تھا ۔ اُس وفاداری میں عقیدت کا پہلو نمایاں ہوتا اور اُن کے دلوں میں سردار کے لئے احترام کا جذبہ اس قدر تھا کہ وہ ہر قسم کا حلف تو اٹھا لیتے تھے مگر سردار کے سر کی قسم کبھی گوارہ نہ کرتے تھے ۔

یہ قبائلی سیر و شکار کے بے حد شوقین تھے اور اپنی جنگجو فطرت کی تسکین کی خاطر بیرونی قبیلوں سے ہمیشہ الجھے رہتے ۔ اگر انہیں بیرونی دشمن میسر نہ آتا تو اسی آسانی کے ساتھ آپس میں غارت گری شروع کر دیتے ۔ اس بری عادت نے آخر کار انہیں آزادی کی نعمت سے محروم کر دیا اور وہ انگریز کے غلام بن گئے ۔ بدقسمتی سے سکھوں کے دور میں قبائل نے دشمنی کی بنا پر ایک دوسرے کے متعلق معلومات مہیا کر کے اور مخبری کر کے دشمنی مول لے لی ۔ اس سے اُن میں خانہ جنگی کو ہوا ملی ۔ جب انگریزوں نے ڈیرہ غازی خان شہر کو فتح کرنا چاہا تو سکھوں اور انگریزوں کے لیے لغاری اور کھوسہ اپنی جانیں قربان کرتے رہے تاکہ ایک دوسرے کو نیچا دکھا سکیں ۔ یہ عادت انگریزوں کے ابتدائی دور میں بھی جاری رہی ۔ سردار کوڑا خان قیصرانی کی گرفتاری کیلئے تمام قبائل دوڑ پڑے تاکہ زیادہ سے زیادہ انگریزوں کی خوشنودی حاصل کر سکیں ۔ غلام حسین خان مشوری کے خلاف مہمات میں انہوں نے وہی کردار ادا کیا ۔ سنڈیمن کے مشن برائے قلات میں جمال خان لغاری اور امام بخش خان مزاری نے اسی کا بھرپور مظاہرہ کیا جو اپنی قوم کے مفاد سے روگردانی تھی ۔
معمولی جھگڑوں نے کئی دفعہ خونریز معرکوں کی صورت اختیار کر لی اور ان واقعات کو شعراء نے اپنی

(1) Political Diaries of Lt. H.B Edwardes P.25 ed.-1911

جولانی طبع کا موضوع بنایا۔ اس سلسلہ میں ایک نظم جو اسد خان کھڑد مزاری کی زبانی سُن کر لکھی گئی تھی ملاحظہ ہو:۔

اللہ الہی تھئے بھنجو گڑاں
ہر کھادِ لاگواز دامٹرھ منان
خواجہ سخی ایں تھئے ناواں گراں
سندھ چو دھار ابڑزا صاحواں
دیرین بلوچ ماکھوئی سراں
شاہ کارےء دچاہڑز دکھلپراں
فرنگی بغاں ایں ماتھراجے بھلاں
غلام حسین سرین نش مابگے جناں
ہفت شہر بیامے مابگے جناں
ڈاھی تھشانا کولہے گماں
ڈاچی لے جھوکا جھئزار ہبزناں
ٹھار اگشغیں کھڑیں مامٹرھاں
خدا صوبہ دادوں مابگا پھلاں
پیارانہ سجھی رستم دستاں
گگڑاں میوہ سے ترکی بھراں
میرل اللہ داد سے کیعنی بھراں
میری اوپیری شے بازیں بہاں
چھیار پہر دھمنرش سوری ولاں
جھتر دکھوراضوفی چھلیش کھوسغاں
ہردو پہاز ھاہر دو سراں
دھوباہہ وڑتھش از تو پکاں
کھایا بہانا ہون بیستھاں
دھودیم دڑتھاں گوں مٹرداں تماں

اے اللہ تیرے احسان بے انتہا ہیں ۔
ہر شخص خود ہی کو دلیر سمجھتا ہے ۔
یا خواجہ سخی تیرا نام ہونٹوں پر ہے ۔
سندھ کو انگریزوں نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے ۔
بلوچ بہت زور پہاڑ پر آباد ہیں ۔
کھلپر (بگٹی کی ایک شاخ) کو بے انتہا زور اور طاقت ہے ۔
فرنگی میرے مقابل نہیں ٹھہر سکتا لہذا مجھے طبع آزمائی کیلئے اور علاقہ تلاش کرنا
اس لئے اے غلام حسین! میں کسی اور علاقے کے اونٹ ہانک کر لاؤنگا ۔
سات شہروں کے اونٹ سمیٹ کر لاؤنگا ۔
اطلاع دینے والے پوری کوشش کر کے مطلع کرینگے ۔
کہ رہزن اونٹوں کو لے جا رہے ہیں ۔
ٹھاریہ نے بہادر اجتماع کر کے سراغ رساں جماعت لے جائینگے ۔
اگر خدا نے فتح دی تو اونٹ واپس لائیں گے ۔
شاید اُن کو یہ نہیں سوجھی کہ پیارا موجودہ وقت کا رستم ہے ۔
گگڑ اور میوہ ترکوں کی طرح دلیر ہیں ۔
میرل اور اللہ داد کس قدر تیز رفتار ہیں ۔
اُن کو میری اور پیری کی تیز رفتاری کا کس قدر مغالطہ ہوا ۔
اُنہوں نے چار پہر سوری میں سفر کیا ۔
کھوسوں نے جب جھترو اور کھورا کی غضبناک آنکھیں دیکھیں ۔
تو دونوں فریق مد مقابل ہو گئے ۔
بندوقوں کے چلنے پر بھی اُن کے پاؤں میں لغزش نہ آئی ۔
جب انسانی لہو اُنکو بہا کر قریب لایا ۔
تو انہوں نے ایک دوسرے کے گلے انگلیوں سے چیر ڈالے ۔

ڈھال باد ردش زمانگوں مانٹراں	ڈھال کی موجودگی میں تولڑنے والے بہت تھے ۔
مڑوخیں بہادر حسن ملنگ جورکھاں	مگر اصل دلیر (بغیر ڈھال لڑنے والے) حسن اور ملنگ تھے جو کسی سے رکتے نہ تھے ۔
شنگو ہشت شانگو ہفت کھوہی بہادراں	اِس طرف سے آٹھ اور اُس طرف سے سات پہاڑی دلیر مارے گئے ۔

ان لڑائیوں اور خون خرابہ میں قتل ہونے والی جگہ پر پتھروں کا ڈھیر بنا دیا جاتا ہے جو مقتول کے عزیز واقارب کو انتقام پر اکساتا رہتا ۔ جب تک قاتلوں سے انتقام نہ لے لیا جاتا یہ نشانی برقرار رہتی ۔ ایسی علامت کا موجود رہنا خاندان کی کمزوری تصور کی جاتی ۔ انتقام پورا ہو جانے پر یہ ڈھیر منہدم کر دیا جاتا ۔ اس طرح سے خون خرابہ اور انتقام کا لامتناہی سلسلہ چل نکلتا جو کئی پشت تک جاری رہتا ۔ آپس کی سر پھٹول کی بجائے اگر ان قبائل کو اتحاد کی لڑی میں پرو دیا جاتا تو ان لوگوں کی دلیری اور بہادری قومی لحاظ سے سود مند ہوتی مگر بد قسمتی سے قدرت نے میر نصیر خان اعظم جیسے سردار پھر پیدا نہ کئے جو اٹلی کے عظیم فرزند گیری بالڈی کی مانند ان کو ایک قومی رشتہ میں جوڑ کر انہیں تنگ قبائلی عصبیت سے نکال لاتا ۔
ان قبائل کی خود مختیار ریاستوں میں کوئی ہومر بھی پیدا نہ ہوا جو ان کے حالات لکھ کر انہیں لافانی بنا دیتا ۔ بالاچ گورگیج ، صوبھا اور گھاہی کے افکار اشعار کی صورت میں بہت کم زندہ رہے ہیں ۔ ان کا اکثر و بیشتر حصہ تحریر میں نہ آنے کی وجہ سے ضائع ہو گیا ۔

قبائلی تنظیم

بلوچی قبائل میں نسلی یک جہتی لازمی نہیں بلکہ مختلف گروہ بلوچاں کسی خاص مرکزی گروہ کے گرد جمع ہو کر قبیلہ بن جاتے ہیں کیونکہ بلوچ کے ہاں اخوت کا ظرف بہت وسیع ہے ۔ "بلوچ اور افغان کو پنجاب میں غیر ملکی تصور کیا جاتا ہے تاہم اُن کی ذات پات کی بے جا پابندیوں سے آزادی اور قبائلی نظام میں غیر خاندان میں شادی کی اجازت نے مقامی اقوام کو بڑی حد تک متاثر کیا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ آخر کار ذات پات کے بندھنوں کو پنجاب میں کم کرنے کا باعث بنے ۔"(۱)
اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کسی بلوچ قبیلہ کا کوئی جز اپنے سردار اور قبیلہ سے اختلاف کر کے کسی دوسرے قبیلہ کی پناہ میں چلا گیا تو وہاں کا سردار اُن کا محافظ جان و مال بن گیا ۔ اور پناہ گزیں لوگوں کا فرض تھا کہ وہ اُس قبیلہ کے سردار کی اطاعت کرتے ہوئے اپنا سود و زیاں نئے قبیلہ سے وابستہ کر دیں ۔ موجودہ زمانے کی اصطلاح میں حقوق شہریت کا حصول تھا ۔ اس طرح سے بلوچ قبائل کی مختلف ٹکڑیاں

(1) The Punjab under The Mughals P. 5 Mohammad Akbar

مختلف اوقات میں کٹ کٹ کر دوسرے قبائل سے پیوست ہوتی رہیں اور آج وہ اُن قبائل کا جزِلاینفک بن چکی ہیں ۔ جروار لغاری تھے مگر اب کھوسہ قبیلہ کی شاخ بن چکے ہیں ۔ حسنی بذات خود ایک نہایت طاقتور بلوچ قبیلہ تھا مگر میر نصیر خان اعظم سے شکست کھا کر کھترانوں کے ہاں پناہ لی اور اب کھترانوں کا حصہ ہیں ۔

بلوچ قبیلہ میں کئی پھلیاں ہوتی ہیں اور ہر پھلی کی کئی شاخیں جن کو پاڑہ کہا جاتا ہے ۔ اِسے لغاری قبیلہ کی ترکیب سے یوں بیان کیا جا سکتا ہے :-

قبیلہ، پھلی اور پاڑہ کے نام عموماً مورثِ اعلیٰ کے نام پر ہوتے ہیں مثلاً احمدانی، علیانی، قیصرانی وغیرہ مگر بعض اقات یہ نام جائے سکونت کو بھی ظاہر کرتے ہیں مثلاً بگٹی، ڈومبکی، کلاچی، لہڑی، میرانی وغیرہ جو بالترتیب دریائے بگ، ڈومب، کلاچ، لاہڑ اور شہرانی کی نسبت سے ہیں ۔
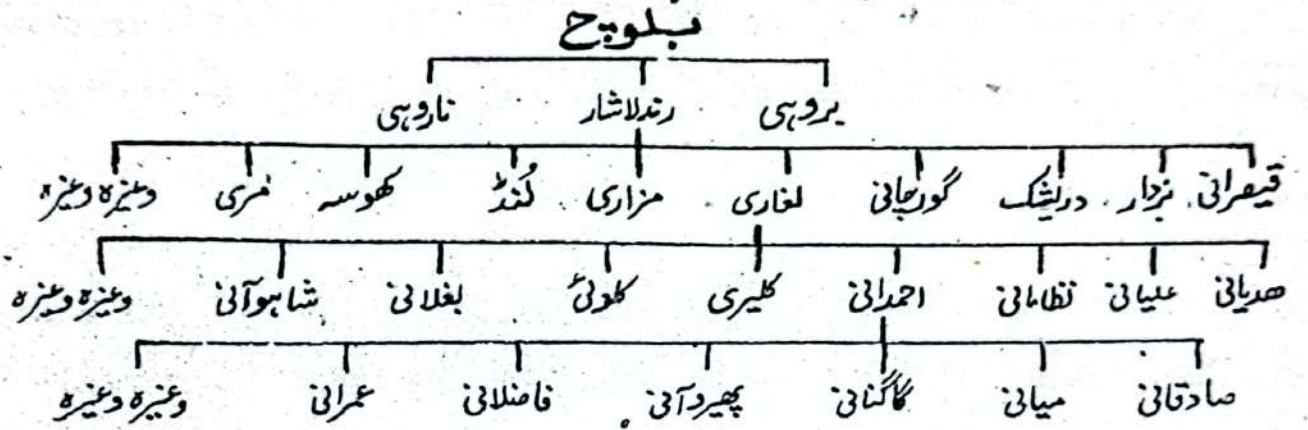
قبائلی حکومت میں ہر پھلی کا سردار مقدم کہلاتا تھا جو اپنی پھلی کے انتظامی امور کا ذمہ دار ہوتا اور اُس کے عہدہ کو متمدن دنیا کے علاقہ مجسٹریٹ سے تشبیہ دی جا سکتی ہے ۔ مقدم اپنی پھلی کے تمام مقدمات کا فیصلہ کرتا اور اگر اُس کے فیصلہ سے کوئی فریق راضی نہ ہوتا، جو شاذ و نادر ہی ہوتا تھا، تو وہ سردار قبیلہ کے پاس اپیل کر سکتا تھا ۔ اگر قبیلے کی دو پھلیوں کے درمیان کوئی جھگڑا پیدا ہو جاتا تو مقدمان متعلقہ پھلیاں باہمی طور پر مقدمہ کا فیصلہ کرتے ۔ اگر جھگڑے کی نوعیت ایسی ہوتی کہ مقدم کسی فیصلہ پر نہ پہنچ پاتے تو آخری فیصلہ کیلئے سردار کے سامنے پیش کیا جاتا ۔ سردار اپنے قبیلے کے تمام مقدمان کی مجلس بلاتا جس کو قبائلی اسمبلی کا نام دیا جا سکتا ہے ۔ اسے انگریزوں نے جرگہ کا نام دیا ہے ۔ اس جرگہ میں سردارِ قبیلہ صدر کے فرائض سرانجام دیتا اور فریقین اپنے اپنے فرقہ کی طرف سے مقدمہ کی پیروی کرتے ۔ ایسے موقع پر مقدم اپنی پھلی کے وکیل کی حیثیت سے کام کرتا ۔ فیصلہ کثرتِ رائے سے ہوتا ۔

بلوچی قانون

بلوچوں کے پاس کوئی تحریری قانون نہ تھا بلکہ وہ رسم ورواج کے قائل تھے۔ سردار قبیلہ اپنے فیصلوں میں
اسلاف کے وقت کے فیصلوں کو مدِنظر رکھتے۔ اس طرح سے ایک رواجی قانون معرض وجود میں آیا۔ یہی
رواجی دستور اکثر معاملات میں میر نصیر خان اعظم کے وقت قبائلی قانون کی صورت میں ظہور پذیر ہوا۔
وراثت کے معاملے میں بلوچ منگول کی پیروی کرتے تھے اور شریعت کی بجائے تورہ چنگیزی پر
عمل کرتے تھے۔ اس قانون میں عورت کو جائیداد غیر منقولہ میں ورثہ کا حقدار تسلیم نہیں کیا
گیا کیونکہ یہ جائیدادیں قبائل کو فوجی خدمات کے صلہ میں ملا کرتی تھیں۔ اگر عورتوں کو زمین میں
ورثہ دیا جاتا تو فوجی نظام میں گڑبڑ کا احتمال تھا۔
بلوچی قانون میں زنا کی سزا مرد کیلئے موت اور عورت کو حکم کے تحت خودکشی کرنا پڑتی تھی۔ اغوا
کے معاملات میں صلح وصفائی اس صورت میں ممکن ہوتی ہے جب مغویہ کو واپس کر دیا جاتا او
اغوا کنندہ بطور سزا اپنی بہن یا بیٹی کا رشتہ دے دیتا۔ بعض اوقات رشتہ کی بجائے املاک
کو بھی قبول کر لیا جاتا۔

قبائلی سردار

قبائلی حکومت کا صدر قبیلہ کا سردار ہوتا جو عموماً موروثی ہوتے تاہم عوام نالائق اولاد کو محروم بھی کر
دیتے تھے۔ عوام اور سردار قبیلہ میں دنیاوی جاہ وحشمت کا فرق نہیں ہوتا تھا بلکہ جس طرح پیدائش
کے وقت انسان مساوی پیدا ہوتے ہیں اسی طرح قبائلی نظام میں بھی قبیلہ کے کسی فرد کو دنیاوی
لحاظ سے برتری حاصل نہ تھی۔ سردار قبیلہ دراصل قبیلہ کا باپ تصور ہوتا تھا جو دن رات اپنے
قبیلے کی فلاح وبہبود کی خاطر کام کرتا۔ موہن لعل جب ۵ مارچ ۱۸۳۵ء میں روجھان آیا تو وہ
مزاری قبیلہ کے نامور سردار میر بہرام خان سے ملاقات کی غرض سے اس کے "دربار" میں آیا۔ یہ
دربار محض قبائلی دربار تھا اور اس نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ "میر بہرام خان اور عوام میں
کوئی فرق نہیں۔ وہ انکی طرح رہتا ہے حالانکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اس کے پاس بڑی دولت
ہے"۔ یہاں یہ ذہن نشین رہے کہ یہ دولت قبیلہ کی دولت تھی اور سردار اسے قبیلہ کی

(۱) Travels in Punjab P.427 Mohan Lal

فلاح و بہبود پر خرچ کرنے کا مجاز تھا۔ وہ اُسے اپنی عیش و عشرت پر صرف نہیں کر رہا تھا۔ قبائلی عوام سردار کی اطاعت نہایت معصومیت اور سچے دل سے کرتے تھے کیونکہ یہ سردار ہر دلعزیز ہوا کرتے تھے۔ اُنکی عمر ذاتی مفاد کی بجائے قبیلہ کی بہتری اور برتری میں صرف ہوتی تھی۔ یہ حالت اُسوقت تک برقرار رہی جب تک سردار قبیلہ (تمندار) عوام کا نمائندہ رہا مگر جب انگریزوں کے عہد حکومت میں تمندار عوام کی بجائے انگریز کے ایجنٹ بن گئے، تو وہ ذاتی اغراض کی خاطر قبائل کے ذرائع آمدنی پر ڈاکہ ڈالنے والے بنے۔ اور انگریز کی شہ پاکر قبائل کی مشترکہ ملکیت (اراضی) پر قبضہ جما کر جاگیردار بن گئے۔ جب حرص اور بڑھی تو اپنی قوم کی بہو بیٹیوں کو "سیاہ کار" قرار دے کر دولت جمع کی۔ اُنکی حرص جسقدر بڑھی، اُسی نسبت سے عوام کی محبت اور اخلاص میں کمی واقع ہوتی گئی۔ آخر کار وہ عوام سے کٹ کر صرف انگریز کے دسترخوان کے ریزہ چیں بن گئے۔ پھر عوام اُن سے شدید نفرت کرنے لگے اور پاکستان بنتے ہی لوگوں کو اُن سے چھٹکارا مل گیا۔

اب ڈیرہ غازی خان کے قبائل کے حالات درج کئے جاتے ہیں۔

کھتران

یہ قبیلہ ڈیرہ غازیخان کے شمالی حصہ میں آباد ہے اور اس کا مرکزی مقام وہوا ہے۔ اس قبیلہ کا بڑا حصہ بارکھان میں آباد ہے۔ یہ قبیلہ بلوچوں اور افغانوں کے درمیان رہتا ہے اور اسی سبب سے دونوں اقوام کے لوٹے پھوٹے قبائلی اجزا اس میں شامل ہو گئے ہیں۔ ابتداء میں یہ قبیلہ بلوچ قبائل میں شامل ہونا پسند کرتا تھا مگر اب اُنکی کوشش ہے کہ وہ افغانوں میں شامل تصور کئے جائیں۔ یہ خواہش بالخصوص تمندار گھرانہ میں موجود ہے جو اب دُرانی کہلانے لگے ہیں۔ مسٹر ڈینزل ابیٹسن نے اپنی کتاب "اقوام پنجاب" میں اُن کو جاٹ شمار کیا ہے اور انکے قبیلے کے اجزائے ترکیبی یعنی کھیتی ران بھی اسی طرح اشارہ کرتے ہیں۔ بالغور کے انسائیکلو پیڈیا کے مطابق کھتران سندھ کے اصل ہندو ہیں جو مسلمانوں کی آمد پہ پہاڑوں پر آباد ہو گئے۔ مری بگٹی پہاڑوں سے بلوچوں نے انہیں نکال دیا مگر وہ بارکھان پر قابض رہے۔ کھتران قبیلہ کے سابق تمندار سردار رب نواز خان مرحوم سے مؤلف کی اس بارے میں کئی دفعہ گفتگو ہوئی تھی۔ اُنکا خیال تھا کہ کسی زمانے میں شہر وہوا کا نام کھاہی ترین تھا (یعنی ترین قبیلہ کا گڑھا) کیونکہ ترین قوم اردگرد کے تمام علاقہ پر آباد تھی لہذا قوم کو منفرد کرنے کیلئے وہوا کے گرد و نواح کے ترینوں کو کھاہی

ترین کہنے لگے جو رفتہ رفتہ بگڑ کر کھتران بن گیا مگر اس سے بات بنتی نہیں کیونکہ درانی سدوزئی ہیں مگر ترین نہیں۔ بعض تذکرہ نگاروں نے سدوزئی کو ترین کی شاخ قرار دیا ہے مگر درانی یا ابدالی صرف سدوزئی افراد سے منسوب ہے۔ تاریخی طور پر ترین اس علاقے پر کبھی آباد نہ تھے۔ اس کے علاوہ کھترانوں کا ذکر کم از کم اکبر کے دورِ حکومت میں ملتا ہے۔ کھترانوں کا ایک سردار یا جنگی امیر رام سنارہ گزرا ہے جس کے عہدِ حکومت میں کھترانوں نے اکبر کی فوج کا مقابلہ کیا۔ اس واقعہ کی یادگار اب بھی درہ لتڑہ کی قلعہ بندیوں کی باقیات ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ "رام سنارہ کا قلعہ" درہ لتڑہ کے اندر واقع تھا۔ درہ کی حفاظت پوری طرح سے کی جاتی تھی۔ شہر میں ایک تجارتی قافلہ آیا جو ریشم کے تھان بطور مال تجارت لایا۔ رام سنارہ کی ایک نہایت حسین وجمیل اور دانا بیٹی تھی جو اپنی سہیلیوں کے جھرمٹ میں سیر کرنے اور کپڑا خریدنے آئی۔ اس نے دیکھا سوداگر ریشم کے تھانوں کو بانس کے ڈنڈوں اور پتھروں سے ناپ تول کر بیچ رہے ہیں۔ اسے بڑی حیرت ہوئی کہ پٹ (ریشم) کو سوداگر ایسے فروخت کر رہے ہیں۔ پس وہ خطرہ محسوس کر کے فوراً محل کی طرف پلٹی تاکہ اپنے والد کو خطرہ سے آگاہ کرے مگر اب دیر ہو چکی تھی۔ اونٹوں پر مال تجارت کی بجائے مسلح افراد لدے ہوئے تھے اور انہوں نے شہر کو تہ و بالا کر دیا۔ ہزاروں کی تعداد میں شہریوں کا قتل عام ہوا۔ اکثر لوگ وہاں سے نکل کر بارکھان چلے گئے۔ ان میں سے کچھ واپس آ گئے۔

اس کہانی پر اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہاں پر ہندو جاٹ آباد تھے۔ کھترانوں کے جہاں تک رسم ورواج کا تعلق ہے تو وہ بلوچ معلوم ہوتے ہیں اور انکی زبان جو کھترانکی کہلاتی ہے سرائیکی سے ملتی جلتی ہے تاہم زبان کا مختلف ہونا کوئی بڑی بات نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مغلیہ دور میں جالٹوں نے اسلام قبول کیا۔ اس قبیلہ کا سردار گیجورہ شاخ سے تعلق رکھتا ہے۔ کھترانوں کا ایک حصہ دھاریوال یا پچھ ہے جو دودائی (میرانی) بلوچ ہیں۔ بارکھان کے کھترانوں میں حسنی خالص النسل بلوچ ہیں۔ حسنی ایک زبردست قبیلہ تھا جس کے سردار صادق خان نے اردگرد کے علاقوں میں لوٹ مار کا بازار گرم کئے رکھا اور بڑی تباہی مچائی آخر شکست کھائی اور پناہ لی۔ کھترانوں کا ایک اور حصہ ناہڑ ہے جو شکل وصورت اور تاریخی لحاظ سے افغان ہیں۔ ان لوگوں کو غازی خان میرانی بلوچ نے ڈیرہ غازیخان کے جنوبی علاقہ (داجل، ہڑند، بھاگسر وغیرہ) اور مظفر گڑھ سے نکال دیا۔

انگریزوں کے دور میں کھتران سردار عملی طور پر تمندار کے درجہ پر فائز تھا مگر حقیقی معنوں میں

اس کا درجہ رئیس کا تھا۔ جب میجر ریورٹی 1857ء میں اس علاقے میں آیا تو دموا شہر سردار مسو خان نتکانی کے ماتحت تھا جس کا صدر مقام منگروٹھہ تھا۔ نتکانی سردار تقریباً ایک لاکھ روپے سالانہ کی آمدنی حاصل کرتا تھا جس میں سے ساٹھ ہزار روپے وہ کابل کو ادا کرتا تھا۔ "آئین اکبری" میں کھترانوں کو سلاسہ کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

نتکانی

یہ قبیلہ تونسہ تحصیل میں آباد ہے جس کا صدر مقام منگروٹھہ ہے۔ انگریزوں کی آمد پر اس قبیلے کیلئے تمندار کے مقرر کرنے کا کام التوا میں پڑتا رہا اور اس قبیلے کا کوئی تمندار انگریزی دور میں نہ تھا۔ تمندار کا نہ ہونا اس قبیلے کیلئے باعث رحمت بن گیا۔ چونکہ تمندار لوگوں کو جاہل اور غیر تعلیم یافتہ رکھنا چاہتے تھے (ماسوا چند) تاکہ من مانی کر سکیں لہٰذا انہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں سکول نہ کھلنے دیئے۔ چونکہ نتکانی علاقہ میں ایسی کوئی رکاوٹ حائل نہ تھی لہٰذا لوگوں میں علم کا خوب چرچا ہوا اور اس کی برکت سے تحصیل تونسہ خواندگی کے لحاظ سے ضلع بھر میں ممتاز ہے۔ تعلیمی ترقی میں تمندار کی عدم موجودگی کے علاوہ زرعی رقبہ کی قلت اور بڑے بڑے گاؤں بھی معاون ہوئے۔ ضلع کے دیگر حصوں میں بڑے گاؤں مفقود ہیں۔ لوگ منتشر آبادیوں میں رہتے ہیں جہاں کوئی ترقیاتی سکیم کامیاب نہیں ہو سکتی۔ ہر کنوئیں پر چند گھروں کیلئے کچھ کرنا ممکن نہیں۔ جب تک حکومت جبراً لوگوں کو گاؤں میں آباد نہ کریگی کوئی ترقیاتی کام نہ ہو سکے گا۔

ریورٹی کے مطابق "لیہ سے شمال میں جاتے ہوئے کروڑ لعل عیسن، جھرگل، بہل اور نتکانی کے قصبے آتے ہیں۔ نتکانی کا یہ قصبہ دراصل نتکانی قبیلے کا اصل مسکن ہے"[1] مگر یہ صحیح نہیں کیونکہ نتکانی قدیم سے تحصیل تونسہ کے باسی ہیں۔ یہاں سے نقل مکانی کر کے یہ لوگ اضلاع مظفر گڑھ لیہ اور جھنگ میں آباد ہوئے۔ وہی مصنف مزید لکھتا ہے کہ "اس قبیلے کا صدر مقام منگروٹھہ ہے اور پیہڑ سے مکول تک سردار مسو خان نتکانی کا علاقہ ہے۔ وہوا کا شہر بھی اُسکی جاگیر میں شامل ہے"[2]۔ نتکانی سردار تقریباً ایک لاکھ روپے سالانہ کی آمدنی رکھتا ہے جس میں سے وہ ہر سال ساٹھ ہزار روپے کابل کی حکومت کو ادا کرتا ہے۔ ایڈورڈز کے مطابق ایک نتکانی عورت کو سلطان دہلی کی طرف سے شاہی حرم کے ایک بچے کو دودھ پلانے کے صلہ میں

(1) Notes on Afghanistan & Baluchistan P.330 2nd ed. H.G. Raverty
(2) " " " P.340 " " " "

بطور جاگیر یہ علاقہ ملا تھا مگر اُس نے اس تاریخی حوالہ کا ذریعہ نہیں بنایا۔

اس قبیلہ کے ابتدائی سردار جس کے حالات معلوم ہیں وہ محمد خان تھا جس کی وفات پر مسو خان اوّل سردار مقرر ہوا۔ مسو خان اوّل نے منگروٹھہ اور مہوئی کے قلعے تعمیر کئے اور تونسہ کا تمام علاقہ وہوا تا احمدانی کو اپنے قبضہ میں کیا۔ اس نے لونی اور استرانہ سرداروں کی لڑکیوں سے نکاح کر کے اپنی طاقت میں اضافہ کیا۔ مسو خان کا اکثر وقت کلاچی اور منکیرہ کے ساتھ جنگ میں گذرا۔ مسو خان کی وفات پر علی اکبر خان سردار ہوا وہ فطرتاً سخت گیرا ور تندمزاج تھا۔ اس کے مظالم سے اُس کے عزیز واقارب بھی محفوظ نہ تھے۔ اس نے اپنے چھوٹے بھائی لکھی محمد خان کو بھی اپنے مظالم کا تختہ مشق بنایا جس پر اُس نے تنگ آکر راہ فرار اختیار کی۔ لکھی محمد خان کا فرار علی اکبر خان کیلئے ناقابل برداشت ثابت ہوا۔ اُسے قابو کرنے کی غرض سے کئی جھوٹے وعدوں پر منگروٹھہ بلوایا۔ جب وہ اُس کے وعدوں پر اعتماد کر کے واپس آیا تو اسے قتل کر دیا۔ قدرت نے بھی ناحق خون کا بدلہ دوسرے روز لے لیا جب علی اکبر کو اُس کے دوسرے بھائی لعل خان نے قتل کر دیا۔ علی اکبر خان کے بیٹے اسد خان اور لعل خان کے درمیان سرداری قبیلہ کیلئے جنگ شروع ہو گئی۔ لعل خان کی امداد پر استرانہ تُل گئے تو اسد خان کی حمایت پر کھوسہ، قیصرانی اور لونی افغان ہو گئے۔ ابتدائی جنگوں میں لعل خان کا پلہ بھاری رہا۔ جب اُس نے کھوسوں کو درہ سنگھڑ میں شکست دی۔ اس جنگ کے دوران تونسہ کے نامور بزرگ حضرت خواجہ سلیمانؒ کی سعی سے صلح ہو گئی۔ مگر لعل خان نے وعدہ خلافی کر کے برخوردار خان کھوسہ کو اسوقت قتل کر دیا۔ جب وہ گفت وشنید کے لیے آیا ہوا تھا۔ خواجہ صاحبؒ کو لعل خان کی وعدہ خلافی پر سخت افسوس ہوا۔ اور فرمایا۔ "تو لعل نہیں لالڑی اے۔ نالواں تیڈا ولڑی اے" یعنی تو لعل نہیں بلکہ جھوٹا موتی ہے جس کا نام عنقریب مٹ جائیگا۔ برخوردار خان کے قتل پر کھوسہ قبیلہ بھڑک اٹھا اور جوابی حملہ کر کے لعل خان کو شکست دی اور سردار قبیلہ اسد خان کو بنا دیا گیا۔ لعل خان امیر دوست محمد خان امیر کابل کے پاس گیا اور وہاں سے فوجی امداد لیکر علاقہ پر پھر قابض ہو گیا۔ اسد خان کی دلیرا ور جرأت مند طبیعت نے لغاری اور کھوسہ قبائل کو اپنے ساتھ پوری طرح سے وابستہ کر لیا۔ جن کی امداد سے وہ آخر کار کامیاب ہوا۔ ۱۸۱۹ء میں جب رنجیت سنگھ نے ڈیرہ غازیخان پر قبضہ جمایا تو اُس نے یہ علاقہ امیر بہاولپور کو اجارہ میں دے دیا۔ لعل خان نے نواب بہاولپور سے یارانہ گانٹھا۔ اور اپنے قدیمی دشمن کھوسہ کی سرکوبی کیلئے طالب امداد ہوا۔ چونکہ کھوسہ جری اور جنگجو قبیلہ ہے لہذا نواب بہاولپور نے لعل خان کی امداد کیلئے دو ہزار بہترین سپاہی روانہ کئے۔ کھوسہ قبیلہ نے لعل خان اور نواب بہاولپور کے متحدہ لشکر کا مقابلہ "ولانہ" کے قریب کیا۔ جس میں کھوسوں نے

(1) A. Year on the Punjab Frontier Vol. II P.5 Maj. H.B. Edwardes

اپنی روایتی دلیری اور سرفروشی کی بدولت فتح پائی اور لعل خان مارا گیا۔ اسد خان اگرچہ قبیلہ کا سردار بن گیا
مگر نواب بہاولپور اس کا جانی دشمن بن گیا۔ خالصہ دورِ حکومت میں رعایا کی فلاح و بہبود کی طرف بہت
کم توجہ دی جاتی تھی بلکہ حکومت کا مقصد زیادہ سے زیادہ مالیہ وصول کرنا ہوتا تھا خواہ علاقہ تباہ ہو جائے۔
ان علاقوں کے ناظم اپنی من مانی کاروائی کرنے کے مجاز تھے اور حصول مالیہ کے لئے علاقہ وہ اجارہ داروں
کے سپرد کر دیتے جو کسانوں سے زیادہ سے زیادہ وصول کرکے کم سے کم رقم خزانہ سرکاری میں جمع کراتے۔
ان افسران کی تنخواہ غیر معین اور قلیل ہوا کرتی اور یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ وہ حکومت کی خوشنودی
حاصل کرنے کی غرض سے بھاری رشوت دینگے۔ جس طریقہ سے یہ لوگ ملازمت حاصل کرتے اسی دروازہ
سے دیگر لوگ آکر اُن کو اس عہدے سے برطرف کرا دیتے۔ ان عمال کے خاص فرائض یہ تھے:۔

(۱) مالیہ کی وصولی (۲) زراعت کی توسیع (۳) پژمردہ کسان کو کاشتکاری پر آمادہ کرنا۔ جہاں کہیں ممکن
ہو متروکہ زمینوں پر کسانوں کو آباد کرنا۔

ناظم علاقہ کی تمام تر کوشش علاقہ کی پیداوار بڑھانے پر مرکوز ہوتیں اور اسکی زندگی کا مقصد کاشتکار
کو اسقدر قلاش کرنا تھا کہ وہ خودکشی کے علاوہ ہر ذلت کو برداشت کرتا رہے۔ ان اجارہ داروں کی
طرف سے علاقے کے لوگوں کو سوار کارندے مقرر کیا جاتا جن کی اگرچہ بظاہر تنخواہ مقرر تھی مگر بباطن
یہ لوگ عوام کو لوٹ کر گذارہ کرتے اور یہی لوگ ڈاکہ زنی کا ارتکاب کرتے تھے"[1] یہ تھی خالصہ حکومت کی
جھلک جو سکھ نواب بہاولپور کی معرفت علاقے پر مسلط کرنا چاہتے تھے۔ جب نواب بہاولپور کو
رنجیت سنگھ نے اس علاقے کا اجارہ دار مقرر کیا تو اس علاقے میں بھی اسی لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم
کر دیا گیا۔ اسد خان کو بخوبی علم تھا کہ اس کے قبیلے پر کس قدر مظالم ڈھائے جائینگے۔ "سکھ وقتاً فوقتاً
مالیہ کی وصولی کیلئے آتے تو عوام کیلئے مصیبت بن جاتے۔ اُن کی آمد عوام کیلئے اشارہ تھا کہ اُن کی جائیداد
زیورات بلکہ دروازے اور کھڑکیوں کے چوکھٹے تک مکانوں سے اتار لئے جائینگے۔ ان موقعوں پر جوان بچے
گھربار چھوڑ کر گروہ در گروہ بھاگ کھڑے ہوتے اور تمام علاقہ مہاجر بن جاتا۔ اُن کے سامنے جو کچھ آتا لوٹ
لیتے اور باقی ماندہ حتیٰ کہ کھڑی فصلات تک کو تباہ کر دیتے"[2] سکھ حکومت نے ابتداً کوشش کی کہ اس
علاقہ پر بھی قبضہ کر لے مگر بُری طرح سے ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اب سکھوں نے نواب بہاولپور کو
اسد خان کے خلاف کاروائی کرنے کا حکم دیا۔ اس نے اپنی فوج یعقوب محمد خان وزیر اعظم بہاولپور کی ق[ـیادت]

(۱) The land of five rivers P. 128 H.C. Trowbkie
(۲) " " " " " P. 185 " " "

میں روانہ کی۔ اسدخان نے مجبوراً خراج ادا کر دیا۔ کچھ عرصہ بعد اسد خان نے اپنی بیٹی کا عقد نواب بہاولپور سے کر دیا جس کی تاریخ نکاح مولوی محمد اعظم نے " دربرج اسد گشتہ قران السعدین " یعنی ۱۸۲۲ء مطابق ۱۲۳۸ھ نکالی۔ کچھ عرصہ تک نواب بہاولپور اور رنجیت سنگھ کے تعلقات اچھے رہے مگر ۱۸۳۳ء میں اجارہ کی رقم کی ادائیگی میں دیر ہونے اور انگریزی خطرہ کے پیش نظر رنجیت سنگھ نے نہ صرف ضلع ڈیرہ غازیخان کی اجارہ داری موقوف کر دی بلکہ ریاست بہاولپور کے ستلج اور سندھ دریاؤں کے دائیں کناروں پر واقع علاقوں پر بھی قبضہ کر لیا اور ونتورہ کو گورنر ملتان مقرر کر دیا۔ ونتورہ سکھوں کی فوج لیکر آیا اور اسد خان کو اطاعت قبول کرنے کا حکم دیا۔ نواب اسد خان نے سکھ حکومت کی اطاعت قبول نہ کی مگر تاب مقابلہ نہ لاکر علاقہ بزدار میں پناہ لی۔ جنرل ونتورہ اگرچہ اسد خان کو قابو نہ کر سکا مگر اس نے علاقے کو لوٹ کر چھ لاکھ روپے سکھ خزانہ میں جمع کرائے۔ رنجیت سنگھ ونتورہ کی اس کاروائی سے بہت خوش ہوا اور اسے ضلع ڈیرہ غازیخان کا اجارہ اس شرط پر دیا کہ وہ سالانہ گیارہ لاکھ روپے اور تین سو بلوچی نسل کے گھوڑے دیا کریگا۔

علاقہ بزدار میں کچھ عرصہ سکونت رکھنے کے بعد اس نے اپنے بیٹے ذوالفقار خان کو پچیس ہزار روپے دیکر صلح وصفائی کے لئے ملتان روانہ کیا مگر سکھ حکومت نے اسے گرفتار کر لیا۔ نواب اسد خان اور خالصہ حکومت کے درمیان صلح نہ ہو سکی۔ سکھ اسد خان کو ڈیرہ اسمٰعیل خان میں شیر محمد خان سدوزئی کی معرفت گرفتار کرنے میں کامیاب ہو گئے جب اسد خان اسے دوستانہ طور پر ملنے گیا تھا۔

اسد خان اور ذوالفقار خان کو قلعہ ملتان میں قید کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد اسد خان کو رہا کر دیا گیا اور اسے چار ہزار روپے سالانہ بطور پینشن دربار لاہور سے ملنے لگے البتہ اس کے خاندان کے دیگر افراد کو بدستور قلعہ ملتان میں بطور یرغمال رکھا گیا۔ جب دیوان مولراج اور انگریزوں کے درمیان جنگ چھڑی تو اسد خان نے لفٹننٹ ایڈورڈز کو خفیہ خط لکھا کہ وہ اس کی امداد کیلئے تیار ہے مگر وہ علی الاعلان مدد دینے سے قاصر ہے کیونکہ اس کا خاندان قلعہ ملتان میں موجود ہے جس کو گزند پہنچنے کا احتمال ہے۔ اس کے علاوہ وہ دہوا وغیرہ بطور جاگیر چاہتا تھا جو اس نے تسلیم نہ کئے۔ جنگ کے خاتمہ پر اس نے بہاولپور میں رہائش اختیار کر لی۔ نواب بہاولپور نے اسے احمد پور شرقیہ میں جاگیر دی جہاں اس نے وفات پائی۔ اسد خان کا بڑا بیٹا میر علی مراد خان والئے خیرپور کے ہاں ملازم ہو گیا اور اچھی شہرت پائی۔ سنڈیمن کی پالیسی کے مطابق جب ضلع ڈیرہ غازیخان میں تمندار مقرر کئے گئے تو اس قبیلہ کی سرداری کا مسئلہ

التوا میں پڑا رہا اور یہ قبیلہ بغیر تمندار رہا۔ اسد خان کی تدفین منگروٹھہ میں ہوئی۔

قیصّرانی

قیصر خان رند کی اولاد ہونے کی وجہ سے یہ قبیلہ قیصرانی کہلاتا ہے۔ قیصر خان کے چھ بیٹے لشکر خان، قطب خان، بڈے خان، بجالو خان، حرم خان اور واسو خان تھے۔ اُن کے نام سے قیصرانی قبیلے کی شاخیں منسوب ہیں۔ قیصر خان کی کئی پشت بعد لشکر خان سردار بنا۔ لشکر خان کے زمانہ میں جھوک بودو اور باٹھی پر قبیلہ مگسی آباد تھا۔ لشکر خان اور مگسی سردار لالی خان کے درمیان ان بن ہوگئی۔ چونکہ مگسی سردار نہایت طاقتور تھا لہذا لشکر خان نے لغاری قبیلہ سے امداد طلب کی جس کے فرقہ ہائے احمدانی، بغلانی، جنگوانی اور رھدیانی اُس کی امداد پر آئے۔ مگسی قبیلہ نے شکست کھائی اور لالی خان میدان جنگ میں کام آیا۔ پھر لشکر خان اور جعفر قبیلہ کے درمیان جنگ چھڑ گئی۔ اس جنگ میں قیصرانیوں کا بھاری جانی نقصان ہوا۔ میدان جنگ میں کافی تعداد میں قیصرانی مجروحین پڑے رہ گئے۔ جن کی دیکھ بھال کرنے کیلئے ایک نوجوان دلشاد خان وہاں رہ گیا۔ اس نے پوری تندہی سے زخمیوں کی مرہم پٹی کی۔ سردار قبیلہ نے جب دلشاد خان کی ہمت اور ایثار کا حال سُنا تو سرداری کی دستار اپنے سَر سے اتار کر دلشاد کے سَر پر رکھ دی۔ اس وقت دلشاد خان کی عمر صرف اٹھارہ برس تھی۔ جعفر قبیلہ کے سردار نے دلشاد خان کی کم سنی اور تجربہ کاری کا حال سُن کر بڑ ہانکی کہ اب قیصرانی کبھی بھی جعفر قبیلہ سے بدلہ نہ لے سکیں گے۔ دلشاد خان چونکہ میدان جنگ میں اپنے قبیلے کے ساتھ تھا لہذا اُسے اپنے قبیلے کی شکست کا بے حد رنج تھا۔ اُس نے عہد کیا کہ وہ اپنے قبیلے کی بے عزتی اور شکست کا بدلہ ضرور لیگا۔ دلشاد خان نے انتقاماً اپنے دشمن قبیلے پر کئی بار حملے کیے اور آخر کار اُن کے سَردار نے عاجز ہو کر صلح کر لی۔ اُس نے اس رشتہ کو مضبوط کرنے کیلئے اپنی بیٹی کا نکاح دلشاد خان سے کر دیا۔

دیوان ساون مل کے وقت قیصرانی قبیلے کے سَردار مٹھا خان کو مواضعات لنتڑی کا سالم مالیہ اور بیٹ لدھا کے چھ چاہات کی پیداوار کے علاوہ ۴۶۲/- روپے سالانہ خالصہ حکومت سے ملتے تھے۔ پہاڑی دروں سے گذرنے والے ہر لدے ہوئے اونٹ پر ڈیڑھ روپیہ محصول وصول کرنے کا بھی حق شامل تھا۔

خالصہ حکومت کے دور میں گڑھانگ ڈیرہ فتح خان میں شامل ہونے کے باوجود اپنی فوجی اہمیت کے پیش نظر براہِ راست دربار لاہور کے ماتحت تھا جہاں کا قلعہ دار ہمیشہ کسی اعلیٰ سکھ خاندان کا فرد ہوا کرتا تھا۔ اب اگرچہ ڈیرہ فتح خان اس ضلع کا ایک معمولی سا قصبہ ہے مگر سکھوں کے عہد میں

فتح خان

اس ضلع کی حدود جانب شمال جاگیر نواب ڈیرہ اسمٰعیل خاں، مغرب میں علاقہ استرانہ کی پہاڑیاں بشمول گرڈوانی اور دولت والا،مشرق دریائے سندھ اور جنوب کی طرف تحصیل تونسہ جس کا قصبہ مورجھنگی بھی ڈیرہ فتح خان میں شامل تھا۔ بعہد سرداری مٹھا خان قلعہ دار گڑانگ نے سردار قبیلہ کو باہمی معاملات کے تصفیہ کیلئے قلعہ کے اندر بلوایا۔ چونکہ مٹھا خان سکھ حکومت کے طور واطوار سے اچھی طرح سے واقف تھا لہٰذا فریب کاری کے خطرہ کے پیش نظر قلعہ میں داخلہ کے وقت وہ اپنے ہمراہ میرخان کلاچی کو لے گیا جو نامی گرامی، دلیر اور تلوار کا بے مثل دھنی تھا۔ قلعہ دار گڑانگ رنجیت سنگھ کی خصلت کا صحیح نمونہ تھا اور اس کا ارادہ تھا کہ وہ سردار مٹھا خان کو بے خبری میں دست وپا کر کے گرفتار کرلیگا اور پھر لاہور روانہ کردیگا۔ اُسے اُمید تھی کہ اسطرح قیصرانی قبیلے کو اپنے قابو میں کرلیگا۔ میرخاں کلاچی جس وقت قلعہ میں داخل ہوا تو اپنی تلوار ننگی کرکے اپنے سردار کے پہلو میں کھڑا ہوگیا تاکہ قلعہ دار کسی قسم کی ناجائز حرکت نہ کرسکے۔ جب گفت وشنید ختم ہوئی تو مٹھا خان اور اُس کے ہمراہی قلعہ سے باہر نکل آئے چونکہ قلعہ دار کی نیت میں فتور تھا اور وہ اُسے کوئی بھی گزند نہیں پہنچا سکا تھا لہٰذا قلعہ کے دروازہ سے نکلنے کے بعد اُن پر بندوق سے فائر کیے گئے مگر خوش قسمتی سے وہ بال بال بچ گئے۔ اس واقعہ سے قیصرانی اور سکھ حکومت کے تعلقات بگڑ گئے۔ قلعہ دار گڑانگ نے قیصرانی قبیلہ پر چڑھائی کی مگر شکست کھاکر پسپا ہوا۔ قیصرانی قبیلہ نے جوابی کارروائی کرکے گڑانگ کو لوٹ لیا۔ خالصہ حکومت کی کمک آنے سے پہلے انہوں نے قلعہ خالی کردیا۔ قلعہ کی لوٹ میں زنبورے اور چھوٹی توپیں بھی قیصرانی اٹھاکر لے آئے۔ گڑانگ کے ذکر میں بھوانی سنگھ کا ذکر بے جا نہ ہوگا۔ قلعہ گڑانگ پر بھوانی سنگھ بتیس سال تک قلعہ دار رہا۔ اُس نے لوٹ مار کا بازار خوب گرم کئے رکھا۔ پوندوں کی شکایت پر اُسے گرفتار کرلیا گیا۔ ایڈورڈز نے بھوانی سنگھ کا مقدمہ دیوان دولت رائے حاکم ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے پاس فیصلہ کیلئے بھیجا۔ دولت رائے نے کاغذات مقدمہ واپس کیئے اور لکھا کہ وہ مدعی (پوندوں) کو حق بجانب محسوس کرتا ہے تاہم وہ بھوانی سنگھ سے جرمانہ کی رقم وصول کرنے کا مجاز نہیں کیونکہ بھوانی سنگھ مرکزی خالصہ حکومت کا ملازم ہے جس پر اُس کے اختیارات نہیں۔

جب جنگ ملتان شروع ہوئی تو مٹھا خان قیصرانی نے ایڈورڈز کی کافی جمعیت کے ساتھ امداد کی اُس نے چیتن مل حاکم منگروٹھہ کو دھمکی آمیز پیغام بھیج کر منگروٹھہ خالی کرالیا۔ اسد خان اور انگریزوں کے درمیان معاملات طے کرانے کی کوشش کی مگر اسد خان اپنی شرائط پر اڑا رہا۔ ڈیرہ غازی خان پر

(1) Political Diaries of Lt. H. B Edwardes P. 125 ed. 1911

انگریزی تسلط قائم ہو جانے پر مٹھا خان کو درہ سنگھڑ سے درہ کوڑا تک کے پہاڑی دروں کی حفاظت سپرد ہوئی۔ مٹھا خان نے دو جمعدار، پچیس سوار اور ۲۰ پیادوں پر مشتمل رسالہ کی سرداری کی پیشکش کو قبول کرلیا۔ اس کے عوض اُسے سالانہ مبلغ پانصد روپے ملنے لگے۔

اس دوران انگریز زیادہ سے زیادہ قبائلی معاملات میں دخل انداز ہوتے لگے جس کو آزاد قبائل نے بری طرح سے محسوس کیا۔ چونکہ انگریز علاقہ پر قبضہ کرنے کیلئے بہانہ ڈھونڈھ رہا تھا لہٰذا یہ موقع انہوں نے بہت جلد تلاش کرلیا۔ ۱۸۵۲ء میں سردار یوسف خان قیصرانی کے گاؤں سے انگریزی علاقہ کا ایک سرکاری ملازم عدم پتہ ہوگیا۔ انگریزوں نے اس گمشدگی کا ذمہ دار یوسف خان کو ٹھہرایا اور اُسے عدالت میں حاضر ہوتے کا حکم دیا۔ چونکہ یوسف خان آزاد قبیلے کا فرد تھا لہٰذا اُس نے فرنگی عدالت کو تسلیم نہیں کیا۔ یوسف خان کا بھائی کسی طرح انگریزوں کے ہتھے چڑھ گیا جس کو قید کر دیا گیا۔ رات کے وقت اُس نے دیوار زنداں کو پھاند کر آزاد ہونے کی کوشش کی مگر پاؤں پھسل جانے کی وجہ سے شدید زخمی ہوکر جان بحق ہوگیا۔ یوسف خان اور اُس کا قبیلہ اس موت پر مشتعل ہوگیا اور انتقام لینے کیلئے تین سو پیدل اور چودہ سوار درہ کوڑا سے چھ مارچ ۱۸۵۲ء کو ڈیرہ فتح خان کی طرف بڑھے۔ دوسرے روز انہوں نے گرڈوالی اور وہوا کے راستے ڈیرہ فتح خان پر دھاوا بول دیا جس کی حفاظت کیلئے پولیس پہلے سے تیار تھی۔ مقابلے میں انگریزی پولیس کے نو آدمی مارے گئے جبکہ تین قیصرانی بھی قوم کے ناموس پر قربان ہوئے۔ حملہ آور جب وہوا اور ٹھٹھہ کے راستے واپس ہوئے تو انگریزی فوج اور پولیس نے مقابلہ کیا جس کی امداد کیلئے تیس پیدل اور تیس سوار مقامی طور پر بھی شامل ہوگئے۔ سخت لڑائی کے بعد قیصرانی اپنے ساز و سامان اور مال غنیمت سمیت پہاڑ میں داخل ہوگئے۔

انگریزوں نے اپنے مقصد کو آسانی سے پورا نہ ہوتے دیکھ کر پوری فوجی کاروائی کرنے کا ارادہ کرلیا۔ جب اپریل ۱۸۵۳ء میں انگریزی فوج شیرانی مہمات سے فارغ ہوگئی تو اُس کا رخ قیصرانی سرزمین کی طرف پھیر دیا گیا۔ ۱۱ اپریل ۱۸۵۳ء کو یہ فوج جس کی کمان بریگیڈیر ہاگسن کررہا تھا شام کے وقت پیہڑ پہنچی۔ صبح سویرے یہ فوج جب درہ باٹھی پر آئی تو مجاہدین نے انکا راستہ روک لیا۔ شدید مقابلہ کے بعد انگریز نے باٹھی پر قبضہ کرلیا۔ اس گاؤں میں تقریباً اسی گھر تھے جن کو نذر آتش کر دیا گیا۔ اس آگ سے صرف دو گھر محفوظ رہے۔ اس آگ میں تہذیب فرنگ کے درندوں نے لوگوں کی تمام املاک منقولہ کو اکٹھا کرکے بھسم کر دیا۔ اس طرح سے فرنگی تہذ

(1) The Record of expeditions against the Tribes of N.W.F.P. 445

کے منحوس قدم قبائل کی آزاد سرزمین میں پہلی مرتبہ پڑے۔ گاؤں کے مال و مویشی پر بھی قبضہ کر لیا گیا۔ قیصرانی قبیلہ پر جب دیوان ساون مل نے حملہ کیا تھا تو اس قبیلہ نے اُس سے دو زنبورے (چھوٹی توپیں) چھین لئے تھے جن کو اب حملہ آور اٹھا کر لے گئے۔ بلوچوں کو اس نقصان کا شدید احساس تھا کیونکہ یہ اُنکی قومی حمیت اور دلیری کی یادگار تھے۔ جب حملہ آور اس کارنامے سے فارغ ہوئے تو راستے میں گاؤں بھی آیا اُسے نذر آتش کر دیا۔

قلعہ گُڑ دام

اس سے پہلے والے صفحہ پر گڑ والا کا ذکر آچکا ہے۔ ایڈورڈز جب ڈیرہ غازی خان میں کام کر رہا تھا تو اُسے جنگ ملتان سے قبل گڑ والا جانا پڑا۔ وہ اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ "گڑ والا ایک چھوٹے سے قابل تعریف ٹکڑے پر بنا ہوا گارے کا قلعہ ہے جس کو اولین مرتبہ عبداللہ خان استرانہ نے تعمیر کرایا تھا پھر یہ نواب ڈیرہ اسمٰعیل خان کے قبضہ میں آیا جس نے پرانے قلعہ کو گرایا اور اُسے پھر تعمیر کرایا اس میں مستقل طور پر سات سپاہی ہیں مگر امدادی طور پر بارہ سپاہی گرڈانگ سے مل سکتے ہیں جو یہاں سے بارہ کوس کے فاصلے پر ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ چودھواں سے کچھ سپاہی یہاں منتقل کر دوں۔ اس جگہ کا جمعدار ایک بوڑھا یوسف زئی بنام فقیر محمدؐ ہے۔ وہ بدشکل ہے مگر اُمید ہے مشکل حالات کا مقابلہ کر سکیگا۔ وہ اس قلعہ کا ذکر بڑے پیار بھرے الفاظ میں کرتا رہا اور اُس کیلئے مزید سپاہی مانگے ایڈورڈز نے اپنی ڈائری میں دولت والا کے متعلق لکھا ہے کہ "یہ بڑی بستی ہے۔ پچھلے دنوں استرانہ نے اس کا محاصرہ کر لیا تھا اور اندر داخل ہو کر قیصرانیوں پر گولہ باری کی اس میں سات افراد مرد و زن مارے گئے اُس نے صفحہ ۵۱ پر گرڈانگ کے متعلق لکھا ہے کہ "رنجیت سنگھ دائرہ دین پناہ کے کردار سے حسد کرتا ہے بلکہ اُس سے بے اعتمادی بھی رہتا ہے لہٰذا گرڈانگ کا قلعہ اُس کے دائرہ اختیار سے باہر رکھا ہے۔"

جہانگیر واقعہ خیر شاہ

ضلع ڈیرہ غازی خان کا شمالی علاقہ ۱۸۶۸ء تک ضلع ڈیرہ اسمٰعیل خان میں شامل تھا جب سردار کوڑا خان قیصرانی نے لفٹننٹ گرے کو اغوا کیا تو انتظامی سہولتوں کو مدنظر رکھ کر اس علاقہ کے بتیس مواضعات ضلع ڈیرہ غازی خان میں شامل کر دیئے گئے۔ مٹھا خان قیصرانی اگرچہ تمندار تھا مگر عوام کوڑا خان کے زیادہ مداح تھے۔ کوڑا خان کا بیٹا جہانگیر خان جب شکار پر گیا تو اس کے ہمراہ خیر شاہ نامی شخص بھی تھا جس کو شکار کے دوران اتفاقیہ طور پر گولی لگی جو جان لیوا ثابت ہوئی۔ اس حادثہ کے وقت خیر شاہ کا چچا حیدر شاہ بھی ہمراہ تھا۔ اگرچہ حیدر شاہ جانتا تھا کہ خیر شاہ کی موت اتفاقیہ طور پر ہوئی ہے مگر متوفی کے باپ مہر شاہ نے جہانگیر خان سے مبلغ پانچ سو روپے بطور خون بہا طلب کئے جسکو

(۲) Political diaries of Lt. H.B. Edwardes P. 314

ادا کرنے سے جہانگیر خان نے انکار کر دیا۔ ڈپٹی کمشنر ڈیرہ اسمٰعیل خان لفٹنٹ گرے تحقیقات کیلئے ٹبی قیصرانی آیا اور اُس نے سردار یعقوب خان کے کنواں پر خیمہ لگایا۔ جب جہانگیر خان گرے کو ملنے آیا تو اُس نے جہانگیر خان کے متعلق ناشائستہ الفاظ استعمال کئے اور اردلی کو حکم دیا کہ اُسے گرفتار کر لے۔ جہانگیر خان یہ ہتک برداشت نہ کر سکا اور آگے بڑھ کر گرے کے ہاتھ سے پستول مروڑ لیا۔ گرے کے ملازمین کو جب اس واقعہ کا علم ہوا تو وہ اُس کی امداد پر دوڑے مگر باز خان قیصرانی بھاری جمعیت کے ساتھ جہانگیر خان کی امداد پر آگیا اور ملازمین گرے نے راہ فرار اختیار کی۔ کوڑا خان جب موقع واردات پر پہنچا تو معاملہ کافی بگڑ چکا تھا لہٰذا اُس نے یہی بہتر سمجھا کہ اُسے قیدی بنا کر اپنے پاس رکھے۔ جب انگریزوں نے کوڑا خان کو گرفتار کرنے کی کوشش کی تو وہ گرے کو اپنے ہمراہ لیکر پہاڑ میں چلا گیا۔ ضلع ڈیرہ غازی خان کے تمنداروں نے اپنے ولی نعمت انگریزوں کو خوش کرنے کی غرض سے کوڑا خان کی گرفتاری میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ کس قدر بدنصیبی کی بات ہے کہ قوم کے جسد میں وطن، قوم، دین اور ہمسایہ کی محبت کا کوئی شائبہ تک نہ رہا۔ اپنے آدمی کی ہمت افزائی اور امداد کی بجائے سات سمندر پار سے آئے ہوئے غاصب کا ساتھ دینے کیلئے تمام تمندار اُس کے پیچھے پڑ گئے۔ جمال خان لغاری نے اپنے علاقہ سے خیر شاہ اور حیدر شاہ کے چار مرید مہنگ، بہار، جانہ اور ایک حاجانی کو اس غرض سے روانہ کیا کہ وہ کوڑا خان کا سر کاٹ کر فوراً حاضر کریں مگر اُنکی تمام کوشش رائیگاں گئی۔ کوڑا خان نے گرے کو اپنے آگے آگے چلنے کا حکم دیا اور اُس کو صاف بتا دیا کہ اگر اُسے کبھی بھی گرفتار ہونے کا خطرہ لاحق ہوا تو وہ فوراً اُسے موت کے گھاٹ اُتار دیگا اور پھر اپنی جان پر کھیل جائے گا۔ اس عرصہ میں مہر شاہ نے بزدار قبیلہ سے ساز باز کر کے علاقہ بزدار کے تمام دروں کی ناکہ بندی کرا دی۔ کریم داد خان، فضل علی خان لنڈ اور نور محمد خان قیصرانی کوڑا خان کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔ باٹھی کے درہ سے تیرہ میل جانب مغرب سلطان محمود خان کھتران کی مصالحت پر کوڑا خان نے گرے کو رہا کر دیا۔ اور گرے نے وعدہ کیا کہ اس معاملہ کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دیا جائے گا۔

جب گرے رہا ہو کر ڈیرہ اسمٰعیل خان پہنچا تو وہ خلاف وعدہ فوج لیکر کوڑا خان پر چڑھ دوڑا۔ کوڑا خان اس فوج کی آمد سے قبل پہاڑی علاقے میں داخل ہو گیا۔ سلطان محمود خان کھتران کے وسیلہ سے پہاڑی قبائل کو مجبور کیا گیا کہ وہ کوڑا خان کو اپنے ہاں پناہ نہ دیں۔ گرے نے کالو خان اور نور نگ خان گنڈاپور کو استرانہ لشکر دیکر کوڑا خان کا راستہ روکنے کا حکم دیا۔ انہوں نے حدود زمارہ تک اُس کا تعاقب کیا مگر وہ اُسے گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ جب فوجی کاروائی کامیاب نہ ہو

تو گر ے نے غلام حسین علی زئی اور سلطان محمود خان کھتران کی وساطت سکی
سے کوڑا خان کو اطاعت قبول کرنے کا مشورہ دیا مگر اب کوڑا خان محتاط ہو چکا تھا کیونکہ اُس نے انگریز کی
وعدہ خلافیاں دیکھ لیں تھیں لہٰذا اُس نے اُن کا اعتبار کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ کوڑا خان کو گرفتار کرنے
کی غرض سے استرانہ، بابر، میاں خیل، بزدار، ھدیانی، لنڈ اور دیگر قبائل کے لشکر کی امداد حاصل کرنے کیلئے سیم
وزر کا لالچ دیا۔ ان قبائل کے علاوہ میدانی علاقہ میں آباد قیصرانیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنے علاقے کے باغی لوگوں
کو حاضر کریں ورنہ اُنکی املاک و فصلات اور بعجتہ جات ضبط کر لئے جائینگے۔ اس حکم کے تحت لوگوں کی پکڑ
دھکڑ شروع ہو گئی۔ اور بائیس خاندان تختۂ مشق بنے جس میں چالیس عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔
ان بے گناہوں کو قید کرنے کے بعد میدانی علاقہ کے قیصرانیوں کو حکم دیا گیا کہ وہ کھوسہ اور گورچانی سرداروں
کی سرکردگی میں پہاڑی قیصرانیوں کی ناکہ بندی کریں۔ اس دوران میں کوڑا خان لڑتا بھڑتا کوہ سلیمان کے پار
اپنے بیٹے اور اسی ہمراہیوں سمیت موسیٰ خیل افغانوں کے ہاں پناہ گزیں ہوا۔ انگریزوں نے کوڑا خان اور
اُس کے چار ہمراہیوں کی گرفتاری کیلئے فی کس دس ہزار روپے انعام کا اعلان کیا۔ اس رقم کو پورا کرنے کی
غرض سے کوڑا خان اور اُسکے ہمراہیوں کی املاک مبلغ بیس ہزار روپے میں نیلام کر دی گئیں۔ جس طرح
جنید خان افغان (المعروف جیون خان بادوزئی) نے اپنے محسن مہمان اور پناہ گزیں داراشکوہ کو گرفتار
کیا تھا اُسی طرح سے پائندہ خان موسیٰ خیل بھی آئین مہمان نوازی کو بھول گیا اور رقم کے لالچ میں کوڑا
خان کو گرفتار کر لیا۔ تاریخ اس معاملہ میں خاموش ہے کہ افغانوں نے پائندہ خان کو اس کردار کی کیا سزا
دی تاہم جنید خان کے ساتھ دہلی کے عوام نے جو سلوک کیا وہ عبرت ناک تھا۔ خافی خان لکھتا ہے کہ
"ملک جیون خان بادوزئی جسے اب بختیار خان کا خطاب مل چکا تھا جیسے شہر میں داخل ہوا تو عوام نے اُسے گالیوں
سے نوازا اور اُن پر گندگی، غلاظت، پتھر اور اینٹ کی اسقدر بوچھاڑ کی کہ اُسکے ہمراہیوں میں سے کچھ شدید
زخمی ہوئے اور گرکر دم توڑ گئے اور دیگر زخمی بھی ہوئے۔ بختیار خان جس کے سر کے اُوپر کئی ڈھالوں سے
تحفظ کیا گیا تھا زخمی ہوئے بغیر محل تک پہنچ گیا۔ کوتوال شہر نے موقع پر پہنچ کر امن بحال کیا ورنہ ملک جیون
کبھی زندہ نہ رہتا۔ عورتوں نے چھتوں سے گندگی اور پیشاب کے بھرے ہوئے مٹی کے برتن اُس پر پھینکے۔"[1]
۲۷ اکتوبر ۱۸۶۸ء کو یہ مرد غیور پابجولان منگروٹھہ لایا گیا۔ مقدمہ کے دوران اُسے سات سال قید کی سزا سنائی
گئی۔ جو کچھ عرصہ بعد معاف کر دی گئی۔ باز خان، جہانگیر خان، گاشن خان اور اُنکے بیوی بچوں کو گرفتار کر کے
تین تین سال قید دی گئی۔ اس مہم میں انگریز کی امداد کرنے والے قبائل کو انعام سے نوازا گیا جو حسب ذیل ہیں۔

(۱) Khafi Khan's History of Alamgir Trans. Moinul Haq P.21

بزدار جنہوں نے ایک ہزار مسلح افراد کے لشکر سے مدد دی مبلغ -/۲۵۰۰ روپے دئے گئے۔

ہدیانی (لغاری)	۷۰۰	〃 〃 〃 〃 〃 〃 〃	-/۲۰۰۰	〃 〃 〃 〃
لنڈ	۴۰۰	〃 〃 〃 〃 〃 〃	-/۱۰۰۰	〃 〃 〃 〃
استرانہ	۵۰۰	〃 〃 〃 〃 〃 〃	-/۱۰۰۰	〃 〃 〃 〃
کھوسہ	۱۲۰	〃 〃 〃 〃 〃 〃	-/۷۰۰	〃 〃 〃 〃
بابر	۱۲۰	〃 〃 〃 〃 〃	-/۷۵۰	〃 〃 〃 〃
میاں خیل	۱۲۰	〃 〃 〃 〃 〃 〃	-/۷۵۰	〃 〃 〃 〃
اسوٹ	۱۰۰	〃 〃 〃 〃 〃 〃	-/۳۰۰	〃 〃 〃 〃
گورچانی	۵۰	〃 〃 〃 〃 〃 〃	-/۳۰۰	〃 〃 〃 〃
نتکانی	۵۰	〃 〃 〃 〃 〃 〃	-/۵۰۰	〃 〃 〃 〃
گنڈاپور	۶۰	〃 〃 〃 〃 〃 〃	-/۲۰۰	〃 〃 〃 〃

مجموعی طور پر ۳۲۲۰ افراد کو مبلغ دس ہزار روپے انعام ملا یعنی اس غداری اور وطن فروشی کے صلہ میں
گس تین روپے ہر ایک کے کاسۂ گدائی میں ڈالے گئے۔ فاعتبروا یا اولوالابصار۔ اس مہم پر مبلغ پند
ہزار خرچ ہوئے جو قیصرانی قبیلہ سے بطور جرمانہ وصول کیا گیا۔ مہر شاہ کو حسن خدمات کے صلہ میں نو
چھ سو پچپن ایکڑ اراضی انعام میں دی گئی۔

اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ زندہ اور باعزت قومیں اپنے ایک فرد کی زند
اور عزت کو اپنے وقار کا مسئلہ بنا لیتی ہیں جبکہ زوال پذیر اور بے حس معاشرہ میں قومی عزت و نامو
کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہوتی۔ اُن کو جہاں سے اور جیسے چند ٹکوں کی جھلک دکھائی جائے تو وہ را
ٹپکاتے ہوئے لپکتے ہیں اور پھر کوئی بھی انہیں ہدف ملامت نہیں بناتا کیونکہ وہ خود بھی کسی ا
موقع کے انتظار میں ہوتے ہیں۔ یہ اس طرح غداری کی بدولت جاہ و حشمت اور دولت حاصل کر کے ا
اولاد اور معاشرہ کیلئے بدی کا راستہ کھول جاتے ہیں۔

کوڑا خان کی گرفتاری اور قید سے فضل علیخان کو جو مٹھا خان کی وفات کے بعد ۱۸۶۲ء میں سردار بنا اپنی پوز
مضبوط کرنے کا موقع مل گیا۔ انگریز اگر کوڑا خان سے چھیڑ چھاڑ نہ کرتے تو فضل علیخان بطور سردار کبھی کامیاب نہ ہو
فضل علیخان کے بعد امام بخش خان تمندار ہوا جس کی وفات پر اُس کا بیٹا منظور احمد خان نابالغ تھا لہذا امی
محمدؐ خان کو اُس کا سربراہ مقرر کیا گیا۔

Multani Stories S.W. Skemp

شہ منظور احمد خان، سردار ... خان کا بیٹا اور امام بخش ... امام بخش ...

بزدار

بزدار قبیلہ رند کی ایک شاخ ہے جو میر چاکر خان اعظم کے ہمراہ سبی تک آیا۔ جب میر چاکر خان نے پنجاب پر حملہ کیا تو بزدار قبیلہ نے اُس کا ساتھ نہ دیا بلکہ اپنے مال مویشی لیکر ڈیرہ غازی خان کے شمال مغربی پہاڑوں میں آباد ہو گیا۔ جس سردار کے وقت بزدار موجودہ جگہ پر آئے اُس سردار کے چار بیٹے شاہو خان، دُلہ خان، رستم خان اور پہلوان خان تھے۔ پہلوان خان کے بھی چار بیٹے جلال خان، چاکر خان، سیاہو خان اور غلامُوں خان تھے۔ جب اُنکی نسل بڑھی تو ان سات ناموں کی نسبت سے قبیلہ کی شاخیں مشہور ہوئیں۔ یہ قبیلہ مغلیہ دور حکومت میں سالانہ آٹھ سو من غلہ اور اسّی روپے ماہوار وظیفہ لیتا رہا۔ اس کے علاوہ انہیں بتیس جاہلت کی معافی بھی ملی ہوئی تھی۔ بزداروں کو اپنے ہمسایہ قبائل کھوسہ، کھتران، نتکانی اور افغانوں سے کئی لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ انگریزوں کے تسلط سے پہلے کاکڑ اور بزدار کی کئی لڑائیاں ہوئیں۔ بزداروں نے میخستر (پرانا نام چھوہی) پر حملہ کیا۔ اس حملہ میں مٹھے والی کے بزداروں کے سُپرد قلعہ گیر سیڑھیاں تیار کرنے کا فرض سونپا گیا جن کے ذریعے بزداروں نے چھوہی کو فتح کر کے اُسے تباہ کر دیا۔ اسی طرح سے جب عمر خان بزدار کو کھترانوں نے قتل کر دیا تو بزداروں نے جوابی حملہ کر کے بغاورع کو تباہ کر دیا۔

۱۸۱۹ء میں جب سکھوں نے ایک گولی چلائے بغیر ڈیرہ غازیخان افغانی گورنر سے چھین لیا تو اِس ضلع کا اکثر میدانی علاقہ اُن کے ہاتھ آگیا۔ اب سکھوں نے پہاڑی علاقے کو بھی مطیع کرنا مناسب سمجھا۔ اسلئے انہوں نے فضل علی خان لنڈ کی امداد سے بزدار قبیلہ پر چڑھائی کی۔ درہ سنگھڑ کے دہانہ سے بارہ میل مغرب ایک مقام "خان بند" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ مقام رود سنگھڑ اور رود درگ کے سنگھم سے مغرب میں ساڑھے تین میل کے فاصلے پر واقع ہے جہاں کسی زمانے میں بزدار قبیلہ کے سردار عاشق خان نے ایک دفاعی مورچہ قائم کیا تھا۔ اہل یونان نے اگر تھرموپلی کے تنگ درہ پر مٹھی بھر دلیروں سے ایک لشکرِ جرار کا مقابلہ کیا تو دلیر اور جانفروش بزدار جوانوں نے بھی "خان بند" کے مورچہ پر ہمت، استقلال، جوانمردی اور حب الوطنی کی عظیم مثال پیش کرتے ہوئے غنیم کے عظیم الشان، منظم اور تربیت یافتہ لشکر کو قلتِ تعداد کے باوجود شرمناک شکست دی۔ بزدار قبیلے نے اپنے بیوی بچوں کو ایک بلند و بالا اور دشوار گذار چوٹی "جھنڈھی" پر پہنچا دیا تھا تاکہ دشمن سے محفوظ رہیں۔ اس طرح سے مطمئن ہو کر دشمن کے مقابلے پر ڈٹ گئے۔ سکھ اپنی اِنتہائی کوشش کے باوجود انہیں کسی جگہ سے بھی پیچھے نہ ہٹا سکے۔ اُن کی آخری یورش، جس میں اکالی حسب دستور آگے آگے تھے، اُنکی تباہی کا باعث بنی اور سکھ اسقدر بھاری تعداد میں مارے گئے کہ بعد از جنگ لاشوں کی بدبو سے مدت

کی حیات میں سرداری شمشیر خان کو منتقل ہو گئی تھی مگر وہ اپنے باپ احام بخش خان کے جیتے جی فوت

تنگ درہ سنگھڑ آمدورفت کے لئے بند رہا۔ جب رودکوہی میں پانی آیا تو لاشوں کو بہا کر لے گیا اور قافلوں کی آمدورفت دوبارہ جاری ہوئی۔

دیوان ساون مل نے اپنی شکست کا بدلہ لینے کیلئے پھر بزدار قبیلہ پر حملہ کیا جس کا مفصل حال دیوان ساونمل کے حالات میں جلد اول میں دیا جاچکا ہے۔ اس شکست کے بعد سکھوں نے بزداروں کو راضی کرنے کیلئے اراضی مالیتی مبلغ دو ہزار روپے اور مبلغ چار ہزار تین سو بتیس روپے/۴۳۳۲ سالانہ کا وظیفہ بھی ادا کرنے کا وعدہ کیا جس کو سکھ حکومت ہمیشہ با قاعدگی سے ادا کرتی رہی۔

دیوان مولراج کی شکست کے بعد جب انگریزوں نے سکھوں کے علاقہ پر قبضہ جمایا تو ڈیرہ غازیخان کا تمام پہاڑی علاقہ آزاد قبائل کے قبضہ میں تھا۔ بزدار قبیلہ نے اپنی آزادی کو برقرار رکھتے ہوئے انگریزوں کے ساتھ بھی اُن معاہدوں پر عمل پیرا ہونے کا یقین دلایا جن پر وہ سکھوں کے ساتھ طے کر چکے تھے۔ کچھ عرصہ تک انگریز اپنی طاقت کو مجتمع کرتے رہے اور "بند دروازہ" کی پالیسی پر کاربند رہے۔ جب انہوں نے حالات کو پوری طرح سمجھنے کے بعد قدم آگے بڑھائے تو وہ "فارورڈ پالیسی" پر عمل پیرا ہو گئے۔ اس کی ابتداء اس طرح سے کی کہ بزدار قبیلہ کی وظیفہ کی رقوم کی ادائیگی میں بے قاعدگی شروع ہو گئی۔ پنجاب کے گورنر کیلئے وائسرائے ہند ویلزلی کا طریق کار بہترین رہنما تھا جس نے معمولی معمولی واقعات کو دیسی ریاستوں کے الحاق کا بہانہ بنایا تھا۔ فارورڈ پالیسی پر کاربند ہو کر انگریز بہت جلد قبائلی علاقے میں دخل انداز ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ ان ناجائز کاروائیوں سے بزدار قبیلہ میں بے چینی بڑھ گئی۔ اور وہ انگریزوں سے محتاط رہنے لگے۔ چونکہ بزدار قبیلہ کی شمالی اور مغربی سرحدوں پر دشمن قبائل آباد تھے جن کے ساتھ وہ تجارت نہ کر سکتے تھے اور اُن کے اپنے علاقے میں کافی غلہ پیدا نہیں ہوتا اسلئے صرف انگریزی علاقہ ہی اُن کی خورد و نوش اور تجارت کی راہ ہو سکتا تھا۔ انگریزوں نے بزدار قبیلہ کو نیچا دکھانے اور اُن کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کرنے کیلئے اُن کی اقتصادی ناکہ بندی کر دی۔ اقتصادی ناکہ بندی کی تلوار صرف بزدار قبیلہ پر ہی نہیں چلائی گئی بلکہ بہت سے بلوچ قبائل اس کا شکار ہوئے۔ مری اور بگٹی قبائل پر اسقدر شدت اور سختی کی گئی کہ انکے کسی فرد کو حدود انگریزی میں گرفتار کرنے پر مبلغ دس روپے انعام مقرر کیا گیا جس میں شریف اور رذیل کی کوئی تفریق نہ تھی۔ بزدار قبیلے کو بھی ان حالات میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ بھی غنیم کے علاقوں پر چھاپہ مار کر جوابی کاروائی کریں۔ ۱۸۵۰ء میں انہوں نے عمرکوٹ پر حملہ کیا جو بزدار قبیلہ کے صدر مقام سے تقریباً ڈیڑھ سو میل جانب جنوب واقع ہے۔ اگرچہ انگریزوں نے اس حملہ کو لوٹ مار اور ڈکیتی کا نام دیا

(1) Forward Policy and its results P.21 R.I. Bruce

ہے مگر حقیقتاً یہ ڈکیتی کا معاملہ نہ تھا بلکہ ایک منظم فوجی کارروائی تھی۔ فاتح کا اصول ہے کہ وہ شکست خوردہ دشمن کو چور، ڈاکو اور غدار کے نام سے یاد کرتا ہے۔ چونکہ انگریز بھی اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے اسلئے اگر انہوں نے بزدار کو ڈاکو گردانا تو اس میں اچھنبے کی کوئی بات نہیں۔ اگر امریکہ کی جنگ آزادی میں جارج واشنگٹن کامیاب نہ ہوتا تو وہ یقیناً غدار کے نام سے یاد کیا جاتا۔ چونکہ بزدار انگریز کی زبردست فوجی طاقت سے براہ راست ٹکر لینے کے قابل نہ تھے لہذا گوریلا جنگ میں انہوں نے دشمن کے کمزور اور غیر محفوظ علاقوں پر حملے کئے جن میں عمرکوٹ، یارو اور وڈور کے حملے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

جب واقعات کا رخ خاطر خواہ طور پر انگریزوں کی منشا کے مطابق نہ نکلا اور بزداروں نے اقتصادی ناکہ بندی کے باوجود اطاعت قبول نہ کی تو انگریز کی فوجی قوت پوری فرعونیت کے ساتھ بروئے کار لائی گئی۔ گورنر جنرل ہندوستان نے اواخر ۱۸۵۶ء میں بزدار قبیلہ پر چڑھائی کرنے کا حکم دے دیا۔ ۶ مارچ ۱۸۵۷ء کو انگریزی فوج بمعہ بارہ توپ رات کے وقت بریگیڈیر چیمبرلین کی سرکردگی میں تونسہ سے روانہ ہوئے اور سورج نکلنے سے پیشتر درہ سنگھڑ میں داخل ہو گئی جہاں چار میل اندر درہ کچھی پر پڑاؤ کیا یہاں بزداروں نے ایک معمولی حملہ کیا جس میں چند انگریز سپاہی مارے گئے۔ اگلے روز یہ فوج "خان بند" کے مورچہ کے مقابل پہنچ گئی۔ جہاں بزدار وطن کی حفاظت اور شمع آزادی کو روشن رکھنے کیلئے مردانہ وار ڈٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے جان توڑ کر انگریزی حملے کا مقابلہ کیا مگر توپوں کے مقابلے میں تلوار اور توڑے دار بندوق بے کار محض تھیں۔ انگریز "خان بند" پر حملہ کرنے کی بجائے بزداروں کو طرح دیکر ان کی پشت پر حملہ کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس حملہ میں کافی مجاہد شمع آزادی پر فدا ہوئے اور اپنے خالق حقیقی کے حضور سرخرو ہو کر پہنچے۔

فاتح نے بارتھی پر قبضہ کر لیا۔ یہ سچ ہے کہ چنگیز خان اور ہلاکو خان نے بنی نوع انسان پر بڑے مظالم توڑے مگر انگریز کے مظالم بھی ان سے کم نہیں۔ چنگیز خان اور ہلاکو خان اس دور کی پیداوار تھے جسے ہم وحشیانہ دور کے نام سے یاد کرتے ہیں مگر انگریز کی سفاکی اور بربریت موجودہ مہذب دور میں جبکہ دنیا انسانیت کی قدر و قیمت اور وقعت کو تسلیم کر چکی ہے نہ صرف قابل نفرین ہے بلکہ قابل مذمت بھی۔ فاتح نے بارتھی کو آگ لگا دی اور انگریزی لشکر تمام علاقے میں پھیل کر مفتوح کی املاک سے آگ کی ہولی کھیلتا رہا۔ (۱) مہم کے قائد کے الفاظ میں "اس دوران میں فوج گشت لگا کر ہر چیز کو نذر آتش کرتی رہی جو تباہ ہو سکتی تھی اور میلوں تک جلتے ہوئے مکان اور سامان کی وجہ سے دھواں بلند ہو رہا تھا۔ کسی چیز کو آگ کی دست برد سے بچائے رکھنا مہم کے مقاصد سے انحراف

(1) Record of expeditions against the Tribes of NWFP P. 445

برابر تھا" درندگی اور سفاکی یہاں تک محدود نہ تھی بلکہ انہوں نے بزدار کے دشمن قبائل کو لوٹ مار کی عام اجازت دے دی۔ سردار قبیلہ نے اگرچہ آخیر دم تک دشمن کا مقابلہ کرنے کا ارادہ کیا مگر اپنے قبیلے کی اس وحشت ناک تباہی اور مصیبت کو دیکھ کر اپنے ارادہ سے باز رہا۔ اس نے بامر مجبوری قبیلے کو مزید تباہی سے بچانے کیلئے اپنے دو قاصد انگریز کمانڈر کے پاس روانہ کیئے جن کے ذریعے استدعا کی گئی کہ وہ علاقہ میں مزید تباہی نہ مچائیں اور وہ کل اطاعت کیلئے حاضر ہو جائیگا۔ سردار ارشد خان اور لونرنگ خان چودہ مارچ کو صلح کے لئے آئے۔ شرائط صلح نہایت کڑی رکھی گئیں۔ جن کا مقصد آزادی کی نعمت سے محرومی تھا۔ اس کے علاوہ جو علاقے آگ کی دستبرد سے محفوظ تھے انکے صلہ میں تین سو دُنبے دینے پڑے کیونکہ بصورت دیگر ساڑھپونک کی پالیسی تمام علاقہ میں پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی دھمکی دی گئی۔ اس دوران لفٹنٹ ینگ ہسبینڈ نے بھی درہ مہوئی سے گذر کر وہی کاروائی کی۔

انگریزی فوج بزدار علاقہ میں سترہ دن گذار کر دو حصوں میں منقسم ہو کر واپس ہوئی۔ تاکہ عسکری قوت کا بھرپور مظاہرہ ہوا اور عوام کے دلوں میں رعب ڈالیں۔ ایک حصہ فوج رود لیمی سے دوسرا اپنے سابقہ راستے سے واپس ہوا۔ ہرن بوڑ کے مقام پر دونوں حصے پھر مل گئے مگر جس علاقہ سے یہ فوج گذری اُسے خوب تباہ کیا۔

۱۸۴۸ء میں ایڈورڈز نے بزدار قبیلہ کے اسلحہ بند افراد کا اندازہ چھ ہزار لگایا تھا۔

(1) A year on the Punjab Frontier. H.B. Edwardes

باب (۲)

قبائل

کھوسہ

یہ قبیلہ بلوچوں کے اُن نامور قبیلوں میں سے ایک ہے جس نے اپنی دلیری، جوانمردی اور آزادی کی روایات سے بلوچی تاریخ کو آراستہ کیا ہے۔ یہ قبیلہ پاکستان میں دو جگہوں پر منظم قبیلہ کی صورت میں آباد ہے۔ یہ اضلاع جیکب آباد اور ڈیرہ غازی خان ہیں۔ کھوسوں کے متعلق مسٹر روز لکھتے ہیں کہ "سندھ میں وہ وسیع خطہ اراضی پر قابض ہیں جو اُن کو ہمایوں نے فوجی خدمات کے صلہ میں دیا تھا۔ وہ سرحد پر نہایت طاقتور قبیلوں میں سے ایک ہے۔ (یہ ۱۹۱۹ء کی بات ہے) اور بڑے آزاد فطرت لوگ ہیں۔ یہ قبیلہ بلوچوں میں سب سے دلیر تسلیم کیا جاتا ہے"[1] اس قبیلہ کا نام (اگر وہ صرف مشابہت نہیں) وسط ایشیا کی تاریخ میں بھی بار بار آتا ہے جہاں اُن کی حکومت کا زور ساتویں، آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں رہا۔ اس قبیلے کو اہل یونان، عرب اور چین نے اپنے تذکروں میں جگہ دی ہے۔ باز نیطی اُن کو کوزر کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اس زمانے میں یہ لوگ جھیل کیسپین کے قریب آباد تھے۔ اور وہاں ہی دیگر بلوچ قبائل کی سکونت تھی۔ اس امر پہ سب مورخ متفق ہیں۔ روسی مورخ گونکووسکی بھی اس امر پہ اتفاق کرتا ہے۔[2]

جب کیخسرو ابن نوشیرواں عادل کی جنگیں ہرکولیس شہنشاہ روم سے ہوئیں تو ابتدا میں اہل ایران کا پلہ بھاری تھا۔ ہرکولیس نے کھوسوں کو (جو ترکوں کی ایک شاخ تھی) اپنی امداد پر بلایا جو والگا کے میدان سے اپنے خیمے اکھاڑ کر جارجیا کے پہاڑی علاقہ میں خیمہ زن ہوئے۔ ہرکولیس نے اُن کا خوب استقبال کیا اور اُن کے خان سے طفلس کے مقام پر ملاقات کی۔ اُن کے سردار کا نام زیبل تھا۔ بقول یونانی مورخ ہرکولیس نے اپنا تاج اُتار کر اُس کے سر پر رکھ دیا اور اُسے بے شمار انعام واکرام سے نوازا۔ ایک عظیم الشان دعوت اُس کے اعزاز میں دی گئی جس کے اختتام پر شہنشاہ ہرکولیس نے خفیہ طور پر اپنی بیٹی ادوکیہ کی تصویر

(۱) A glossary of Tribes & castes of Punjab & NWFP Vol. II P. 570 H.A. Rose

(۲) The peoples of Pakistan P. 144 Yu. V. Gankovsky

دکھاکر زبیل خان سے وعدہ کیا کہ جنگ کے بعد اسکی شادی تم سے کردی جائے گی۔ یہ لڑکی ۷ جولائی ۶۱۱ء میں پیدا ہوئی تھی۔ اور اس وقت اس کی عمر پندرہ برس تھی (یعنی یہ واقعہ ۶۲۶ء کا تھا) جنگ کے خاتمہ پر یہ لڑکی حسب وعدہ اُسکے خاوند کی طرف روانہ کی گئی مگر زبیل خان کی وفات کی خبر سُن کر اُسے راستے سے لوٹنا پڑا۔ پٹولمی نے بھی کھوسہ کا ذکر کیا ہے اور اُنکے وسط ایشیا کے وطن کو کھاساریگا کے نام سے منسوب کیا ہے۔ الفنسٹن نے اپنی کتاب میں کھاساخیل کا ذکر کیا ہے جو صحرا میں رہتی ہے۔ منو کے مطابق ساکا "یاوانا" پہلوی اور کھاسہ جن کا وطن وسط ایشیا ہے دراصل راجپوت ہیں۔ واضح رہے کہ یہاں راجپوت سے مراد صرف اعلیٰ جاتی کی جنگجو اقوام ہیں۔ مذکورہ تمام اقوام غیر ملکی ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ ہندو صحیح معنوں میں کبھی مورخ نہیں ہوا۔ انہوں نے اپنی تاریخ جس قدر بھی لکھی وہ جن اور پریوں کی کہانی کی طرز پر ہے، جس سے کوئی واضح تاریخی واقعہ معلوم نہیں ہوسکتا۔ مسٹر الفنسٹن اپنی کتاب تاریخ ہند میں لکھتے ہیں" جب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کوئی کیسی ہی جاہل اور اکھڑ قوم کیوں نہ ہو اکثر اپنے آباؤ اجداد کے حالات کی کوئی نہ کوئی کتاب رکھتی ہے تو اس بات پر کمال تعجب ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے پاس باوجودیکہ اُن کی قوم نہایت عمدہ شائستگی اور تربیت کے درجے پر پہنچ گئی تھی، کوئی کتاب تاریخ سے ملتی جلتی نہیں ہے۔ ہندوؤں کے حالات کی تحریروں میں سے جو کچھ موجود ہے وہ جھوٹی کہانیوں اور مبالغہ آمیز جھوٹے تاریخی واقعات سے اس طرح خلط ملط ہے کہ ان میں سے کوئی سچی مسلسل تاریخ نکلنے کی توقع نہیں ہوسکتی اور نہ کسی اہم واقعہ کی تاریخ سکندر کی یورش سے پہلے قائم ہوسکتی ہے اور نہ کوئی مسلسل بیان ہندوؤں کے حالات ہندوستان پر مسلمانوں کے تسلط کرنے تک لکھا جاسکتا ہے"۔ کھوسہ قبیلے کے افراد قیام پاکستان سے قبل راجپوتانہ میں بھی کافی تعداد میں موجود تھے جہاں وہ تمام علاقے سے مرہٹوں کی مانند چوتھ وصول کرتے تھے۔ اور راجپوت اُن کے مقابلے سے عاجز تھے۔ ٹاڈ لکھتا ہے کہ "فی ہل ایک روپیہ نقد اور پانچ دھڑی اناج تو صحرا میں گویا اُنکی میراث ہے۔ گڈریوں سے بھی بھیڑ بکری کے واسطے شرح مقرر ہے۔ اس کی سواری گھوڑا اور ہتھیار سانگ

(۱) Decline & fall of Roman Empire vol. IV P. 527 E. Gibbon.

(۲) Tod Rajasthan vol. II P. 201 James Tod

(۳) " " " " " P " " "

(۴) مذاہب عالم کا تقابلی مطالعہ ص ۹۸ ایڈیشن 1978 چوہدری غلام رسول
بحوالہ تاریخ ہند از الفنسٹن

اور تلوار ہے۔ وہ بندوق کا استعمال شاذو نادر ہی کرتے ہیں۔ راجپوتانہ میں اُنکی طاقت اس قدر زوروں پر تھی کہ "۱۷۸۰ء میں مارواڑ کے راجہ بیجاسنگھ کو اُنکی سرکوبی کیلئے باقاعدہ فوج کشی کرنا پڑی"۔[1][2]

ابتداء میں یہ قبیلہ علاقہ کیچ میں آباد تھا مگر پھر دیگر بلوچ قبائل کی مانند یہ قبیلہ بھی بہتر علاقے کی تلاش میں کیچ سے نکل کر کوہ سلیمان میں داخل ہوگیا۔ یہاں پر قبیلہ دو حصّوں میں بٹ گیا۔ ایک حصّے نے جیکب آباد میں رہائش اختیار کرلی جن کو ہمایوں نے اعلیٰ فوجی خدمات کے صلہ میں جاگیریں دیں۔ دوسرا گروہ رکنی ضلع لورالائی میں آباد ہوا جہاں کھوسوں کی آمد سے قبل گورگیج اور بلیدی آباد تھے۔ علاقہ گورگیج میں سمی نامی عورت نہایت مالدار تھی جسے بلیدی قبیلہ نے لوٹ لیا۔ گورگیج کے سردار دودا خان نے اس کا بدلہ لینے کیلئے "سیاہ آف" پر حملہ کیا۔ جس میں وہ لڑتا ہوا مارا گیا۔ دودا کے بھائی بالاچ خان نے انتقام لینے کا عہد کرلیا۔ بالاچ کے ہمراہ اُس کے نوکر کے بیٹے نخیفو نے بھی ساتھ دینے کا حلف لیا۔ بالاچ اور نخیفو ہم عمر اور ہمجولی تھے لہٰذا سماجی فرق مراتب کے باوجود ایک دوسرے سے بڑی محبت کرتے تھے۔ بالاچ اور نخیفو نے بلیدی قبیلہ کے ایک سو بیس افراد کو اپنے ہاتھ سے قتل کیا۔ دونوں قبائل ان لامتناہی جنگوں سے بہت کمزور ہوگئے اور اس عرصہ میں بالاچ خان بھی بوڑھاپے کی وجہ سے بالکل لاغر اور کمزور ہوگیا۔ ایک روز گورگیج قبیلہ کو معلوم ہوا کہ بلیدی زبردست لشکر سے حملہ کرنے والے ہیں۔ تاب مقابلہ نہ پاکر گورگیج دشمن کی آمد سے پہلے وہاں سے نکل گئے مگر بالاچ نے اپنی برادری سے کہا کہ اُسے خنجر دیکر اُسی جگہ رہنے دیا جائے۔ جب بلیدی وہاں پہنچے تو اُنہیں گاؤں میں صرف بالاچ خان نظر آیا۔ جو اُن کا جانی دشمن تھا۔ ایک بلیدی جنگجو نے اُس کے سر کی طرف اشارہ کرکے کہا "اب فصل تیار ہے۔ ہم اِسے کاٹنے آئے ہیں"۔ بالاچ خان نے بات اَن سنی کرکے کہا کہ اُس کے کان بہرے ہیں لہٰذا جو کچھ کہنا چاہتے ہو میرے کان پر منہ لگاکر کہو تاکہ میں سُن سکوں۔ اُن میں سے ایک قریب آکر فقرہ دہرا ہی رہا تھا کہ بالاچ کا خنجر بجلی کی تیزی سے اُس کے سینہ میں اُتر گیا۔ اور ساتھ ہی اُس نے کہا "میں تو خصیل (نرم چارہ) کاٹتا ہوں"۔

اسی طرح دونوں قبائل ایک دوسرے کو نیست و نابود کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھاکر کھوسوں نے دونوں قبائل کو مار بھگایا۔ آج بلیدی قبیلہ کی ایک شاخ سہرانی گورچانی قبیلہ کا حصّہ ہے اور گورگیج بھی اپنا شیرازہ کھو بیٹھے۔ یہ تھا انجام خون خرابے کا۔

---

(1) Tod Rajasthan vol. II P. 264 James Tod Lt. Col.

(2) " " " " P. 104 " " Lt. Col.

کھوسے ڈیرہ غازی خان میں غازی خان کے عہد حکومت میں آئے۔ غازی خان نے باطل خان (باطل خان بمعنی ہیرو) کو جاگیر دی جس میں اب قصبہ باطل موجود ہے۔ باطل خان کے ہمراہ یارو خان بھی تھا جس نے قصبہ باطل سے تین میل کے فاصلے پر اپنے نام سے قصبہ آباد کیا۔ چونکہ قبائلی جنگوں کا ہر دم خطرہ رہتا تھا لہٰذا مدت تک کھوسوں کا مرکز گجگڑی رہا جو دامن کوہ میں واقع ہونے کی وجہ سے زیادہ محفوظ تھا۔ رفتہ رفتہ یہ قصبہ اپنی اہمیت کھو بیٹھا اور اب بوسیدہ قلعہ کے سوا وہاں کوئی آبادی نہیں۔ غازی خان اوّل کی توسیع سلطنت میں کھوسوں نے بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور باطل خان کے پوتے یوسف خان نے بڑی ناموری حاصل کی۔ یوسف خان کچھ عرصہ تک حکومت ڈیرہ غازیخان کی طرف سے علاقہ مظفر گڑھ کا حاکم رہا۔ یوسف خان کی وفات پر اُس کا بیٹا غلام حیدر خان سردار قبیلہ ہوا مگر اُسے دشمنوں نے دغا سے قتل کر دیا۔ غلام حیدر خان کا بیٹا برخوردار خان نابالغ تھا۔ دشمنوں کے خطرہ کے پیش نظر اُس کی پرورش اُن کھوسوں کے ہاں ہوئی جو ٹبی لنڈ کے علاقہ میں آباد ہیں۔ برخوردار خان جب جوان ہوا تو اپنے باپ کے قاتلوں کو شکست دیکر گرفتار کر لیا۔ خان محمدؐ خان رئیس یارو، جوانک خان رئیس دلانہ اور ہوت خان رئیس بستی ہوت نے اپنی اپنی بیٹیوں کا نکاح برخوردار خان سے کر کے صلح کر لی۔

چونکہ کھوسہ قبیلہ کلہوڑہ خاندان (میاں صاحب سرائی) کا مرید تھا لہٰذا میاں عبدالنبی خان نے بلوچوں کے مقابلے میں برخوردار خان کو بھی اپنی مدد پر طلب کیا۔ اس جنگ میں برخوردار خان زخمی ہوا اور میاں عبدالنبی خان نے شکست کھائی۔ نتکانی قبیلہ کی خانہ جنگی میں برخوردار خان نے اسد خان کی حمایت کی اور درہ سنگھڑ کے قریب لعل خان کے ہاتھوں دھوکے سے قتل ہوا۔ برخوردار خان کے بعد اُس کا بیٹا غلام خان سردار بنا جس نے لعل خان کے خلاف جنگ جاری رکھی اور آخر کار کامیاب ہوا۔ اسد خان نے کھوسوں کی اس امداد کے صلہ میں مٹی اور مہوئی کے علاقے دیئے۔

لعل خان افغانستان کی امداد لیکر واپس آیا تو اس نے مٹی اور مہوئی کے کھوسوں پر حملہ کر کے ٹبی نور محمدؐ خان اور یار محمدؐ خان کو قتل کر دیا تاہم کھوسوں نے لعل خان کو شکست دیکر راہِ فرار دکھائی۔ ڈیرہ غازیخان پر جب نواب بہاولپور کی اجارہ داری قائم ہوئی تو لعل خان دو ہزار کا امدادی لشکر لیکر دلانہ پر حملہ آور ہوا۔ اگرچہ یہ حملہ اچانک اور بھاری جمعیت سے ہوا مگر کھوسوں نے انفرادی اور اجتماعی دلیری کے لاجواب مظاہرے کرتے ہوئے دشمن کو شکست دی جس میں لعل خان مارا گیا۔ ریاست بہاولپور گزیٹیر ۱۹۰۴ کے فاضل مصنف نے اپنی معلومات کا انحصار بہاولپور کی دو قلمی تاریخی کتب

مصنفہ مراد شاہ اور شہامت علی کر کے کھوسوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ یہاں یہ امر مدِ نظر رہے کہ یہ دونو حضرات بہاولپور کے درباری مورخ اور سرکاری ملازم تھے اور انہوں نے تمام تر بہاولپور کی سرکاری رپورٹوں پر انحصار کیا۔ بہاولپور کی فوج نے جو شکست کھائی وہ سرکاری گزٹ میں بڑی کامیابی اور فتح مبین ظاہر کی گئی حالانکہ حقیقت اس سے بالکل مختلف تھی۔ گزیٹیر میں لکھا ہے کہ "۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ ڈیرہ غازیخان آیا۔ (یہ سن بھی غلط ہے) اور امیر سندھ کے علاقے کو لوٹا جو وہاں سے نزدیک تھا۔ (مراد مزاری علاقہ ہے جنہوں نے سکھوں کے خطرہ کے پیش نظر امیر سندھ سے خصوصی معاہدہ کیا تھا مگر یہ واقعہ بھی ۱۸۱۹ء سے بہت بعد کا ہے۔) پھر رنجیت سنگھ نے ڈیرہ غازیخان نواب بہاول پور کو اڑھائی لاکھ روپے سالانہ پر اجارہ میں دے دیا۔ نواب نے غلام قادر خان ڈاہٹر کو کاردار مقرر کیا۔ اور نواب خود ڈیرہ غازیخان ۱۲۳۵ھ میں آیا۔ رحیم خان لغاری، غلام حیدر خان کھوسہ اور اسد خان نتکانی نے حاضری دی۔ اس عرصہ میں نواب نے سنگھڑ، قلعہ گجبڑی، ٹبی اور قلعہ دلانہ کو فتح کیا (حالانکہ یہاں انہوں نے زبردست شکست کھائی تھی۔ سنگھڑ مدت تک سکھوں اور نواب بہاول پور کے لئے دردِ سر بنا رہا) اس مہم کے دوران غلام حیدر خان مارا گیا۔ غلام حیدر خان کے چھوٹے بھائی کوڑا خان نے اطاعت قبول کر لی۔ نواب نے قلعہ گجبڑی ۱۸۲۱ء میں کوڑا خان کو واپس کر دیا۔" اگرچہ نواب بہاولپور اجارہ دار تھا مگر وہ اجارہ کی رقم کئی سال تک ادا نہ کر سکا تو رنجیت سنگھ کے حکم پر ونتورہ نے ستلج اور سندھ کے دائیں کنارے پر واقع بہاولپور کے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ وہ علاقے حسب ذیل تھے:-

ضلع	مواضعات	تعداد دکانوں	آمدنی سالانہ
ساہیوال	۴	۴۹	۲۹۸۶/= روپے
ملتان	۴۱	۳۳۱	۹۴۹۲۱/= روپے
مظفر گڑھ	۱۹	۱۹	۲۸۲۸۹۳/= روپے
ڈیرہ غازیخان	۳۶	۳۶	۲۸۸۰۴۲/= روپے
مجموعہ	۱۰۰	۴۳۵	۶۶۶۸۴۲/= روپے

(۱) Bahawalpur State gazetteer 1904 P.66
(۲) Bahawalpur State gazetteer 1904 P.66
(۳) " " " " P.67
(۴) " " " " P.68

ان علاقوں پر قبضہ کرنے کے بعد رنجیت سنگھ نے اپنا خسارہ پورا کرلیا۔
نواب بہاولپور نے اپنی شکست کی خفت کو مٹانے اور کھوسہ قبیلہ کو داغِ رسوائی لگانے کی غرض سے لڑکی کا رشتہ مانگا جس کے متعلق اُسے یقین تھا کہ کھوسے انکار کردیں گے اور اسطرح سے اُسے اپنی شکست اور رسوائی کا بدلہ لینے کی خاطر چڑھائی کرنے کا موقع مل جائیگا۔ غلام حیدر خان نے لغاری، گورچانی اور نتکانی قبائل سے مشورہ کرنے کے بعد اس تقاضے کو رد کر دیا۔ نواب بہاولپور نے لشکر جرار کے ساتھ حملہ کیا اور یہ لڑائی دو سال تک چلتی رہی۔ اس دوران میں قلعہ گجڑی کا محاصرہ جاری رہا۔ بہاولپوری فوج کی تمام جنگی چالیں، آلات حرب اور سکھوں کی امداد کھوسہ قبیلہ کی جرأت اور دلیری کے سامنے بے کار ثابت ہوئیں۔ اگر حالات اس طرح سے رہتے تو بہاولپور قلعہ گجڑی پر کبھی قبضہ نہ کرسکتا مگر بدقسمتی سے ایک روز غلام حیدر خان چند ہمراہیوں سمیت قلعہ کے باہر دشمن کے نرغہ میں آگیا۔ دشمن نے اُسے زندہ گرفتار کرنے کی بڑی کوشش کی مگر وہ جدھر رخ کرتا دشمن کی صفیں درہم برہم کردیتا۔ دشمن کی کثیر تعداد میں مٹھی بھر کھوسے ایک ایک کرکے وطن کی آن پر قربان ہوگئے مگر دشمن شیر گجڑی کو اُس وقت تک قابو نہ کرسکا جب تک اُس کے دم میں دم رہا۔
غلام حیدر خان کے بعد اُس کا بھائی کوڑا خان سردار بنا جس نے کچھ عرصہ تک جنگ جاری رکھی مگر پھر صلح کرلی۔ کوڑا خان نے دستورہ کی اطاعت قبول کرلی۔ جب دیوان مولراج نے ملتان میں انگریزوں کے خلاف اعلان جنگ کیا تو کوڑا خان انگریزوں کے ساتھ مل گیا جس کا مفصل بیان دیوان مولراج کے حالات میں ہوچکا ہے۔
کھوسہ قبیلہ کی دلیری کی بہت سی کہانیاں عوام میں مشہور ہیں۔ ۱۸۵۶ء میں جب بزدار قبیلہ نے یارد پر حملہ کیا تو وہاں کے روساء فتح خان، لونرنگ خان اور مبارک خان تھے۔ انہوں نے دشمن کی آمد پر حوصلہ نہ ہارا بلکہ آخیر دم تک مقابلہ کرنے کی غرض سے تینوں چچازاد بھائیوں نے میدان جنگ سے منہ نہ موڑنے کا عہد و پیماں باندھ کر اپنے دامن ایک دوسرے سے باندھ لئے تاکہ میدان جنگ میں ثابت قدم رہ کر اکٹھے مریں جیسے دنیا میں اکٹھے زندہ رہے۔ اِنکی دلیری اور جوانمردی کو ایک بلوچی شاعر نے اِن الفاظ کا جامہ پہنایا ہے

فتحن لونرنگ حان مبارک منگھا

ہڑسہ ناخوذات کھائکوں پھلو بستغا

معنی اعلیٰ مرتبت فتح خان، لونرنگ خان اور مبارک خان تینوں چچازاد بھائیوں نے ایک دوسرے سے دو باندھ کر (میدان جنگ میں) آئے۔

جب کھوسہ قبیلہ کے خلاف لغاری اور گورچانی قبائل نے محاذ قائم کیا تو اُن کے اتحادی لشکر نے کھو
علاقہ پر تاخت کی۔ کھوسے بھی مقابلے پر آئے مگر وہ لغاری اور گورچانی کے عظیم لشکر کو دیکھ کر کنی کترا
لگے اور پھر یہی صلاح ٹھہری کہ فی الحال دشمن کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ کھوسوں میں اُن کا نامور دلیر اور جنگجو
سارنگ خان بھی شامل تھا جس نے اس مشورہ کو ناپسند کیا کیونکہ وہ دشمن سے ٹکر لینے پر تُلا ہوا تھا
اُس نے اپنے اور کھوسہ لشکر کے درمیان ایک لکیر کھینچ کر اعلان کیا کہ جن بہادروں کو اپنی جان و مال عزیز
نہ ہوں اور وہ آخیر دم تک مقابلہ کرنے پر تیار ہوں، وہ اس لکیر کے پار میری طرف آجائیں۔ باقی اصحاب
اپنی مرضی کے مطابق اپنی اپنی حفاظت اور بچاؤ کا انتظام کریں۔ اُنسٹھ دلیروں نے سارنگ خان کے ساتھ
مرتے مارنے کا ارادہ کر لیا جس میں اُس کے دو بیٹے اور دو بھتیجے بھی شامل تھے۔ یہ ساٹھ دلیر ہزاروں
کا مقابلہ کرنے کی خاطر دشمن کا بے چینی سے انتظار کرنے لگے۔ جب دشمن کا لشکر نمودار ہوا تو یہ
ساٹھ دلیر بڑی خوفناک تندی اور دلیری سے دشمن پر جھپٹے اور اُسے دور تک دھکیلتے ہوئے
لے گئے۔ جب یہ دلیر اپنی قلت کے باعث ایک ایک کر کے کٹ کر ختم ہو گئے تو لغاری سردار نے
دریافت کیا کہ سارنگ خان کو قتل کرنے والا کون جوانمرد تھا؟ اس سوال پر کئی بہادروں نے سارنگ
خان کو میدان جنگ میں قتل کرنے کا دعویٰ کیا مگر سردار میدانِ جنگ میں مشاہدہ کر چکا تھا کہ سارنگ
خان کا قاتل بھی اُس کے ساتھ ہی ابدی نیند سو رہا ہو گا۔ دونوں دلیروں کی تلواریں مدِمقابل کے جسم
میں پیوست تھیں۔

اس جنگ کے بعد جو حقیقتاً ایک زرعی زمین کے ٹکڑے کی خاطر وڈور کے نزدیک ایک سرحدی جنگ
تھی، بزدار قبیلے کے سردار دوست محمدؒ خان نے دونوں قبائل (کھوسہ اور لغاری) کے درمیان مصالحت
کرانے کی کوشش کی اس گفت وشنید کے دوران کھوسہ قبیلہ نے اس شرط پر صلح پر آمادگی کا اظہار
کیا کہ سارنگ خان مرحوم کی تلوار واپس کی جائے مگر لغاری اس تلوار کی واپسی پر رضامند نہ ہوئے۔ اس
جھگڑے کو ختم کرنے کیلئے دوست محمدؒ خان نے اپنی تلواروں میں سے ایک ایک تلوار کھوسہ اور لغاری قبائل
کو دیکر سارنگ خان کی تلوار اپنے پاس رکھ لی یہ تلوار مصنف نے قیام پاکستان کے بعد اُس خاندان کے
معزز رکن سردار حاجی محمدؒ خان سابق رسالدار بارڈر ملٹری پولیس ڈیرہ غازیخان کے پاس دیکھی تھی۔

جب رنجیت سنگھ نے ڈیرہ غازیخان کا انتظام براہِ راست ناظم ملتان کے سپرد کر دیا تو کوڑا خان
نے رنجیت سنگھ کے ساتھ اتحاد کو برقرار رکھا اور دربار لاہور سے اُسے ایک ہزار روپے سالانہ
پنشن ملتی رہی۔ کچھ عرصہ تک کوڑا خان اور سکھوں کی اچھی بنی رہی مگر پھر اُن کے درمیان اختلافات

پیدا ہو گئے جن کی وجہ مالیہ کی ادائیگی تھی۔ ڈیرہ غازی خان کے کاردار لونگا مل نے کوڑا خان کے بیٹے غلام حیدر خان کو ڈیرہ غازیخان میں گرفتار کرلیا اور بطور سزا کچھ دیر دھوپ میں کھڑا کر دیا۔ غلام حیدر خان اور کوڑا خان کے لئے یہ ہتک ناقابل برداشت تھی اور وہ بدلہ لینے کے لئے موقع کی تاک میں رہے۔ یہ وقت بہت جلد آگیا جب ۱۸۴۸ء میں ایڈورڈز ڈیرہ غازیخان پر قبضہ کرنے کے لئے بڑھا تو کوڑا خان اپنی عسکری قوت کے ساتھ انگریزوں سے مل گیا۔ غلام حیدر خان نے ایڈورڈز سے وعدہ کیا کہ وہ اسے ڈیرہ غازیخان فتح کرکے دیگا۔

منگروٹھہ کا حاکم چیتن مل بھی اپنی فوج کے ہمراہ ڈیرہ غازیخان آگیا۔ لونگا مل کی امداد پر لغاری تھے۔ کھوسوں نے بار بار حملے کئے مگر لغاریوں کی دلیرانہ مدافعت کی وجہ سے انہیں ہر بار پیچھے ہٹنا پڑا اور انکی تمام جنگی چالیں ناکام ہوگئیں۔ صبح کے وقت جب کھوسوں کے لئے حالات مخدوش ہو چکے تھے تو کوڑا خان نے اپنے بیٹے غلام حیدر خان کو بلا کر کہا "بیٹے! اپنی قوم کی لاج کی قسم نہ لینی تھی مگر اب اس کو ہر صورت میں نبھانا ہے کیونکہ یہی شیوہ مردانگی ہے"، یہ کہہ کر کوڑا خان تلوار سونت کر میدان کارزار میں کود پڑا۔ ڈیرہ غازیخان کی فتح پر لونگا مل کو زخمی حالت میں گرفتار کرلیا گیا اور اسے سردار قبیلہ کے سامنے پیش کیا گیا۔ غلام حیدر خان نے ننگی تلوار کی نوک لونگا مل کے سینہ پر رکھ کر کہا کہ اُس نے دل میں عہد کر رکھا تھا کہ تمہارے سینہ کو اپنی تلوار سے چھلنی کرونگا مگر افسوس میرا مقابلہ تم سے میدانِ جنگ میں نہیں ہوا ورنہ میں اپنے دل کی بھڑاس نکال سکتا۔ اب چونکہ تم قیدی ہو اور بے دست و پا پر وار کرنا بلوچی روایت کے خلاف ہے لہٰذا تمہاری جان بخشی کی جاتی ہے۔ کوڑا خان جنگ ملتان میں اپنے قبیلے کے تین سو جوانوں کے ہمراہ شامل رہا۔ انگریزوں نے غلام حیدر خان کو رسالدار پولیس مقرر کیا مگر وہ انگریزوں کی غلامی برداشت نہ کرسکا اور ملازمت سے برطرف کرکے سات سال کے لئے قید کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد وہ ہندوستان کی سیاحت کرتا رہا۔ وہ اپنے والد کی زندگی میں فوت ہوا۔ کوڑا خان ۱۸۷۱ء تک زندہ رہا اور اپنے ہاتھ سے غلام حیدر خان کے بیٹے بہادر خان کی دستار بندی کردی۔ بہادر خان نے ۱۹۰۶ء میں وفات پائی اور اُسکے بعد اُس کا چچازاد بھائی مبارک خان سردار بنا جو لاولد فوت ہوا۔ بہادر خان کے داماد غلام حیدر خان کو سردار مقرر کیا گیا جسے رات کے وقت خاندانی جھگڑوں کی بنا پر قتل کر دیا گیا۔[1] قتل کی اس واردات میں اُس کا کم عمر لڑکا ذوالفقار علی خان بچ گیا۔ اس کے بعد دوست محمد خان سردار بنا ہے

(1) A year on the Punjab Frontier Vol-II P.249 H.B.Edwardes

اس کے بعد مخدوم حسین خان کی بجائے محسن کا بیٹا سردار دوست محمد خان کو منتخب کیا گیا، قتل ہونے کے بعد

شادن لُنڈ

اگرچہ اس وقت یہ قبیلہ دو مختلف علاقوں میں آباد ہے مگر ابتداء میں یہ ایک ہی جگہ سکونت پذیر
اِن دو شاخوں کو شادن لُنڈا ور ٹبی لُنڈ کے ناموں سے منفرد کیا جاتاہے۔ لنڈ رند بلوچ ہیں اور ان
نام کی وجہ تسمیہ کے متعلق کئی باتیں مشہور ہیں مگر سب سے زیادہ مشہور اس طرح ہے کہ رندوا
کی لڑائیوں کے دوران جب ذوالنون بیگ ارغون بھی رند کی امداد پر آگیا تو ایک دن ذوالنون بیگ ارغون
مذاق میں ایک بلوچ سردار کے گھوڑے کے ہونٹ کاٹ دیئے۔ جب میر چاکر خان اور ذوالنون بیگ
سیر کرتے ہوئے اصطبل کے قریب سے گذرے تو ذوالنون نے ہنس کر کہا کہ آج تو بلوچ سردار کا گ
ہنس رہا ہے۔ لُنڈ کے مورث اعلیٰ نے اپنے سردار پر ذوالنون کی بھبتی کو بے اثر کرنے کی غرض
ایک ترک کے گھوڑے کی دم تلوار سے کاٹ کر کہا کہ شاید بلوچ سردار کے گھوڑے نے کسی کو ننگا
ہوگا۔ اسی روز سے وہ لُنڈ یعنی دم برید کرنے والا مشہور ہوگیا۔

لُنڈ قبیلہ نے بلوچستان سے نقل مکانی کر کے سوری کے علاقہ پر قبضہ جمایا جس کو سوری نام
رُود کو ہی سیراب کرتی ہے۔ شادخان لُنڈ نے موجودہ قصبہ شادن لُنڈ آباد کیا۔ شادن لنڈ کا نام
سردار محمد خان گذرا ہے جس نے ایک قلعہ سوری میں اور دو قلعے کنڈی والے تعمیر کرائے۔ اس نے
افغانوں کو پے در پے شکستیں دیکر اپنے علاقہ کو لوٹ مار سے محفوظ کیا مگر ابدالی کے حملوں کی وجہ
اسے پہاڑوں میں پناہ لینا پڑی۔ فضل علی خان محمد خان کی وفات پر سردار بنا جس نے رنجیت سنگھ کے
عہد حکومت میں بزدار قبیلے کو زک دینے کے لئے دیوان ساون مل کا ساتھ دیا مگر بزدار قبیلہ نے سکھ
اور لنڈوں کو "خان بند" کے مورچہ پر نقصان عظیم پہنچا کر شکست دی۔

ایڈورڈز کی آمد پر فضل علی خان دو صد سواروں کے ساتھ محاصرہ ملتان میں شامل رہا۔ فضل علی
خان کے بعد غلام حیدر خان متوفی ۱۸۷۷ء پھر محمد خان متوفی ۱۸۸۶ء سردار بنے۔ محمد خان اپنے
بھائی کے ہاتھوں قتل ہوا تو اس کا چھوٹا بھائی احمد خان تمندار بنا جو ۱۸۹۸ء میں لاولد فوت ہوا۔ پھر
احمد خان کا چچا زاد بھائی نورنگ خان سردار بنا جس نے ۱۹۰۷ء میں وفات پائی۔ بعد میں کوئی
قابل ذکر واقعات پیش نہیں آئے۔

سردار ... خان کا ... سردار ... علاقہ ... [illegible]

ٹبی لُنڈ

سوری لنڈ کا ایک سردار حیدر خان تھا جس کے چھوٹے بھائی کا نام میوہ خان تھا ۔ حیدر خان کے زمانہ میں علاقہ میں قحط پڑا اور لوگوں کو اناج کے حصول میں بڑی مشکلات پیش آنے لگیں ۔ حیدر خان اگرچہ تمندار تھا اور لوگوں کی مشکلات دور کرنا اس کا منصبی فرض تھا مگر اُس نے رعایا کی حالت سدھارنے اور اُن کو قحط کے اثرات سے بچانے کے لئے کوئی عملی قدم نہ اُٹھایا اور اناج کے گودام کو حسب سابق بند رکھا ۔ اتفاقاً حیدر خان چند روز کے لئے گھر سے باہر چلا گیا تو میوہ خان نے حاتم طائی کی مانند اناج کے گودام کے دروازے کھول دئے اور ضرورت مندوں میں اناج تقسیم کر دیا ۔ حیدر خان جب گھر واپس آیا تو اُسے میوہ خان کی کاروائی پر سخت طیش آیا اور اُسے بُرا بھلا کہا ۔ میوہ خان اپنے بھائی کے سخت کلمات برداشت نہ کر سکا اور اپنا اسلحہ لیکر وطن کو خیرباد کہا ۔ قبیلہ کے بعض افراد جو میوہ خان کی دلیری، سخاوت اور حسن سلوک کے مداح تھے، وہ بھی اُس کے ساتھ نکل کھڑے ہوئے ۔ یہ گروہ سفر کرتا ہوا ہڑند کے مغرب میں درہ گٹھی میں مقیم ہوا ۔ اُن ایام میں ہڑند پر ناہڑ خاندان حکمران تھا ۔ اس نو وارد گروہ کے اسلحہ بند افراد نے جن کی تعداد چودہ تھی، اپنی خدمات بطور فوجی پیش کیں ۔ چونکہ ہڑند کا ناہڑ حکمران بھی افغان لیٹروں کے آئے دن کے حملوں سے نالاں تھا لہٰذا اُس نے بھی ان سواروں کی چال ڈھال دیکھکر اپنی فوج میں بخوشی بھرتی کر لیا اور انہیں حسب قاعدہ خورد ونوش دیکر صبح فرض منصبی پر حاضر ہونے کا حکم دیا ۔ یہ افراد سرکاری گودام سے سامان رسد لیکر گھر چلے گئے ۔ رات کے وقت ایک افغانی لشکر نے علاقہ ہڑند پر حملہ کیا اور کثیر تعداد میں مال مویشی اور سامان لوٹ کر براستہ گٹھی درہ واپس ہوا ۔ درے میں ان بہادروں نے ڈاکوؤں کو واپس جاتے ہوئے دیکھ لیا ۔ میوہ خان نے اپنے ہمراہیوں سے مخاطب ہو کر کہا کہ یہ ہماری روایات کے خلاف ہے کہ جس حکومت کا ہم نے نان ونمک کھایا ہو اُسی سلطنت کی حدود سے دشمن اسطرح سے لوٹ مار کر کے مال لے جائیں اور ہم صرف تماشائی بن کر دیکھتے رہیں لہٰذا ہمیں حق نمک ادا کرنا چاہیئے اور دشمن کو بغیر مقابلہ آگے نہ بڑھنے دیں ۔ میوہ خان کے ہمراہی اُس کی رائے سے متفق ہو گئے اور ہتھیار سنبھال کر درہ میں سدِ راہ بن گئے ۔ جب ڈاکوؤں نے بلوچوں کو مدمقابل پایا تو انہوں نے انہیں بتایا کہ ہماری اور تمہاری کوئی پرخاش نہیں لہٰذا ہمارا راستہ نہ روکیں ۔ اگر تمہیں مال سے حصہ درکار ہے تو ہم دینے کے لئے تیار ہیں مگر میوہ خان نے انہیں بتایا کہ تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ لوٹا ہوا مال چھوڑ کر یہاں سے چلے جائیں ورنہ یہ قلیل تعداد تمہارا مقابلہ آخر دم تک کریگی ۔ نتیجتاً جو جنگ ہوئی اس میں یہ چودہ دلیر مارے گئے مگر

لٹیروں کا بھی بھاری جانی نقصان ہوا۔ جب تک ایک لُنڈ بھی زندہ رہا اُس نے دشمن کو فرار ہونے کا موقع نہ دیا۔ جب آخری دلیر نے جامِ شہادت نوش کیا تو حاکم ہڑند کی فوج بھی موقع وارِدات پر پہنچ گئی۔ چونکہ ڈاکوؤں کو لوٹ کا مال لے جانے کی فرصت نہ ملی تھی لہٰذا وہ تمام مال و اسباب وہیں چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ حاکم ہڑندان کی بہادری اور فرض شناسی پر بہت خوش ہوا اور بکشیوہ خان کی خواہش کے مطابق مقتولین کے لواحقین کو جاگیر دی جو درہ کاہا سے بہنے والے چشمہ سے سیراب ہوتی ہے۔ اسی جاگیر میں انہوں نے قصبہ ٹبی لنڈ آباد کیا۔

اس قبیلے میں نامور سردار لشکر خان گذرا ہے جس کے زمانہ میں ٹبی لُنڈان نے بڑی ترقی کی۔ مری، بگٹی اور گورچانی قبائل کے متحدہ لشکر نے اس پر حملہ کیا جس کی تعداد چار ہزار مسلح افراد تھی۔ لشکر خان کی دلیر طبیعت نے یہ قبول نہ کیا کہ وہ قلعہ کی دیواروں میں محصور ہو کر دشمن کا مقابلہ کرے لہٰذا اُس نے معمولی لشکر کے ساتھ غنیم کا مقابلہ کھلے میدان میں کیا اور اُن کے تین سو سپاہیوں کو میدان جنگ میں قتل کر کے کامل فتح حاصل کی۔

بگٹی سردار اسلام خان نے صلح کر لی جو میدان کارزار میں شدید زخمی ہو چکا تھا۔ لشکر خان قیدیوں کے علاوہ بگٹی سردار کو بھی علاج معالجہ کے لئے ٹبی لُنڈان لایا۔ قیدیوں کو مہمان کی صورت میں رکھا اور جب اسلام خان کے زخم ٹھیک ہو گئے تو اُس نے تین صد قیدیوں کو زادِ راہ دیکر گھروں کو روانہ کیا۔ اسلام خان کو اُس نے ٹبی لُنڈان کے قیام کے دوران نہایت عزت و احترام سے رکھا اور اُسے روانگی کے وقت تحفے و تحائف دیکر رخصت کیا۔ دو دلیر جو دشمن بن کر ایک دوسرے کے مدِ مقابل ہوئے تھے اب دوست اور بھائی بن کر جُدا ہوئے۔ یہ ایک بلوچ کے کردار کی جھلک تھی۔ یہ دلیر قوم کی عظمت کی علامت ہے کہ وہ مفتوح دشمن سے احسن سلوک روا رکھتا ہے اور مفتوح اپنے فاتح کے حسن سلوک سے گرویدہ ہو کر سب عناد بھُلا دیتا ہے۔ اس اچھے سلوک کو بگٹی آج تک یاد کرتے ہیں۔ اس فتح سے لشکر خان بہت مشہور ہو گیا۔ اسکی دلیری اور بہادری کے گیت بن گئے۔ اُن میں سے ایک گیت ملاحظہ ہو جو سردار اعظم خان لُنڈ سے سُن کر قلمبند کیا گیا:۔

دھرت پالیں بادشاہیں	اے خدا تم دھرتی کے پالنے والے ہو۔
ہر چہار جنڈا نگاہیں	ہر چہار اطراف تمہاری نظر میں ہیں۔
نیم پڑھیا نیم اولیا ایں	ہمارا سردار نیم دنیا دار اور نیم اولیا ہے۔
نیم بھیما بادشاہیں	اور سادگی میں بھی بادشاہ ہے۔

ما بنیادوں پُشرِ رندیں	ہم نسب میں پُشرِ رند ہیں ۔
ما دریاؤں پل بندھیں	(ہم طاقتوروں کے مقابلے میں اسطرح) جیسے دریا پر پُل ۔
چاکرءِ پیرا او رندیں	(بہادری اور دلیری میں) ہم میر چاکر کے نقشِ قدم پر چلتے ہیں
لشکر خان بٹی بندھیں	لشکر خان بٹی لنڈان کا محافظ ہے ۔
ہتھیار ست بھتی	اسلحہ سات قسم کا رکھتے ہیں ۔
یا سخن ست بھتی	اور سخن ہمارا (سردار کا) لکھ داتا کی بات ہے ۔
دھرتی دُھبی کہ دُھبی	زمین اپنی جگہ سے ہٹ جائے ۔
لشکر خان پیڈ نہ گرڑدی	مگر لشکر خان کا پاؤں (میدانِ جنگ میں) پیچھے نہ ہٹیگا ۔
داروسی محمدؐ خان شغریں زواناں	اے محمدؐ خان (جو مقابلے کا سخت مخالف تھا) اپنی میٹھی زبان [illegible]
پیڈ نیلاں سنگتیا	میں میدان جنگ کے ساتھیوں کو ہرگز نہ چھوڑونگا ۔
داسراں وساوسیبا	بلکہ اپنے سر کی قربانی سے دریغ نہیں کرونگا ۔
ایں پھٹرا ڈھالا لہے ڈھالوں	میں یہ داؤ ضرور لگاکر ۔
آولوری قولے ماں پالوں	دلیروں کے قول کو پورا کرونگا ۔
ہے سرا ھڈی اے گالوں	تن اور دھن کی قربانی دونگا ۔
جھونکے ڈاکے مزارا	جب شیر کی مانند گرجونگا ۔
کھز نہ پھری پھے دوارا	میری للکار پہ دُشمن روئے زمین سے بھاگ جائینگے ۔
مچھ کھنے کلے تماناں	خواہ تمام قبائل کو جمع کرو ۔
کھوہ کہ یا عیں ہندوستاناں	پہاڑ، باغ (بلوچستان کا ایک قلعہ) اور ہندوستان کے لشکر [illegible]
چھوٹی کہ محمدؐ خاناں	خواہ چھوٹی کے محمدؐ خان (لغاری) کو بلاؤ ۔
نہ ٹھرساں جنگ بھیسا	مگر تمہاری جنگ سے باز نہ آؤنگا ۔
گشتا لشکر ہوتے خاناں	اعلیٰ نسب لشکر خان نے کہا ۔
پھوکن جنگیں ساماناں	کہ تم جنگ کے سازوسامان کو تیار کرو ۔
لنڈ گورشا لگاہیں	کیونکہ لُنڈ اور گورچانی کی جنگ ہے ۔
شانگو نئر کلھیار ہزارا	اُدھر سے چار ہزار ہیں ۔
تننگو نئری چھیار صد و چہارا	جن کے مقابلے پر اسطرف چار سو چار ہیں ۔

لُنڈ و رنہ کھیتو لاناں	لُنڈ دلیر تلوار کو تو لتے
کھاٹکی گھتاں جناناں	اور خنجر زنی کرتے
اڑ قلاحی درشاناں	قلعہ سے باہر نکل آئے
گو لگاماں لپکھناناں	گھوڑے لگاموں سے کھیلتے آئے
ہنڑکٹ ماہڑنانی	اور انکی ہنہناہٹ کی آواز ہے
چھنٹرکٹ اسپرانی	ڈھالیں بجنے لگیں (تلواروں کی ضرب سے)
ہونگھٹے اورانی	دلیروں کے نعرے گونج رہے ہیں
بخشو گو مست مزارا	جن میں بخشو اور مزار مست ہو کر میدان کارزار میں گھوم رہے ہیں۔

(انتہائی کوشش کے باوجود مکمل نظم دستیاب نہیں ہو سکی لہٰذا اسی پر اکتفا کیا گیا ہے۔)

لشکر خان کے بعد کرم خان اور پھر اُس کا بیٹا لشکر خان سردار قبیلہ ہوئے۔ لشکر خان دوم پر گورچانی اور لغاری قبائل نے ملکر حملہ کیا۔ اس نے اپنے دادا کے کارناموں کی تجدید کرنے کے لئے دشمن کا مقابلہ قلعہ سے باہر نکل کر کھلے میدان میں کیا مگر میدان جنگ میں داد شجاعت دیتا ہوا مارا گیا۔ لشکر خان کے نابالغ بیٹے کرم خان دوم نے صلح کر لی۔ کچھ عرصہ بعد گورچانی نے صلح کا معاہدہ توڑ کر نواب بہاولپور کی امداد سے لنڈ پر حملہ کیا۔ کرم خان دوم نے نواب بہاولپور کو ایک لاکھ روپے رشوت دیکر اس اتحاد کو ختم کرا دیا اور پھر میر بہرام خان مزاری کی مدد سے گورچانی قبیلہ کو شکست دیکر پہاڑ کی طرف بھگا دیا۔ کرم خان کی وفات پر اُس کا چچا زاد بھائی محمد خان سردار مقرر ہوا جس کے وقت رنجیت سنگھ نے داجل و ہڑند پر قبضہ کر لیا۔ سکھوں اور لُنڈوں کے درمیان کبھی نہ نبھ سکی۔ لُنڈ اور گورچانی قبائل نے اتحاد کر کے ہڑند کے قلعہ دار ہرسا سنگھ کو قتل کر دیا۔ رنجیت سنگھ نے فوجی کاروائی کی تو لُنڈ پہاڑ میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ محمد خان نے بہاولپور میں پناہ لی جہاں اُسے جاگیر ملی۔ محمد خان کے چلے جانے کے بعد کرم خان کا بیٹا مٹھا خان اور پھر مزار خان کا بیٹا بخشن خان سردار بنا۔ بخشن خان نے ۱۸۶۰ء میں وفات پائی۔ بخشن خان کے بعد مزار خان سردار مقرر ہوا جو غلام حسین خان مشوری کی جنگ میں زخمی ہوا۔ مزار خان نے ۱۹۰۸ء میں وفات پائی اور پھر مسو خان، حاجی محمد خان اور محمد افضل خان سردار ہوئے۔

لغاری

لغاری قبیلہ ضلع ڈیرہ غازی خان میں بلحاظ آبادی، وسعت رقبہ تمام قبائل سے زیادہ ہے - اس قبیلے کی شاخیں علیانی، بغلانی، ہدیانی، کلوئی، احمدانی، ہیتانی، رمدانی، کلیری، جوگیانی، ٹالپور، نظامانی، سنجرانی وغیرہ ہیں - لغاری اپنے سردار رند و خان کے ہمراہ لغاری بار کھاں سے غازی خان اوّل کے عہد حکومت میں وارد علاقہ ہوئے - اُس وقت اس علاقہ پر احمدانی بلوچ قابض تھے - احمدانی بلوچ احمد خان قرائی کی اولاد ہیں جو درہ مہوئی کے قریب آباد ہوئے - درہ مہوئی کے قریب رود کے جنوبی کنارے پر سہتک خان احمدانی کی قبر موجود ہے - سہتک خان ایک جنگ میں کام آیا تھا - مدت دراز تک احمدانی قبیلہ کے لوگ اپنے خاندان کے سربراہ کی دستار بندی اسی قبر پر کرتے رہے - علیانی اور احمدانی کا جھگڑا چراگاہوں سے شروع ہوا - اُس دور میں احمدانی نے مہوئی سے بڑھ کر چوٹی پر قبضہ جمالیا تھا - میر رندو خان کی آمد کے وقت میر مانہ خان احمدانی قبیلہ کا سردار تھا جس نے میر رندو خان سے شکست کھائی - "گل بہار" (تاریخ ڈیرہ غازیخان) کے مصنف لالہ ہتورام لکھتے ہیں کہ "احمدانی دودائی کی شاخ ہیں اور میر رندو خان کی آمد سے قبل وہ چوٹی بالا، مانکہ (درخواست جمال خان)، وڈور، گدائی، بینہ (؟)، چہل چاہان، نواں، بکھواہ، کھوڑہ، باغ علی آنی پر قابض تھے -"[1] اس کے علاوہ لکھتا ہے کہ میر رندو خان اکبر اعظم کے عہد حکومت میں آیا جب ۱۵۸۰ء میں غازی خان نے ڈیرہ غازیخان آباد کیا مگر یہ غلط ہے - ڈیرہ غازیخان لنگاہ خاندان کے وقت ۱۴۸۰ء میں آباد ہوا تھا - سکھوں کے عہد حکومت میں لغاری سردار تین ہزار روپے سالانہ دربار لاہور کو ادا کرتا تھا -

لغاری اور کھوسہ کے درمیان طویل عرصہ تک قتال جاری رہا - دونوں قبیلے صوبھہ اور گاہی کی معرفت شغان (طعنہ) بھیجتے رہے تاکہ ایک دوسرے کو کم اصل ثابت کر کے اُن کو پست ہمت کردیں - حاکم ڈیرہ غازیخان نے آخر ان کے درمیان مصالحت کرادی اور اُس کو دیرپا معاہدہ بنانے کے لئے قرار پایا کہ چالیس گھرانے کھوسے علاقہ لغاری میں اور چالیس گھرانے لغاری قبیلہ کے کھوسہ علاقہ میں آباد کئے جائیں - یہ گھرانے بطور یرغمال ہونگے تاکہ وعدہ خلافی کا خطرہ نہ رہے - کھوسہ کے چالیس گھرانے معموری میں اور چالیس لغاری گھرانے بیلہ میں آباد کئے گئے[2] -

---

(۱) گل بہار ص 266 لالہ ہتورام ایڈیشن جون 1982ء مطبع بلوچی اکیڈمی کوئٹہ - (نئی چھپائی)

(۲) گل بہار ص 324 " " " " " " " " "

جب لغاری قبیلہ کا سردار میر بلوچ خان تھا تو میر شہداد خان ٹالپور مقدم کلاں (لغاری قبیلہ کا امیرالامرا) تھا۔ ایک جھگڑے میں اُس کے ہاتھوں چار افراد بے گناہ مارے گئے۔ سردار قبیلہ نے شہداد خان کو کچھ عرصہ کے لئے قید کردیا مگر پھر اُسے رہا کردیا۔ شہداد خان سردار سے ناراض ہو کر سندھ چلا گیا جہاں اُس کی اولاد نے سندھ پر حکمرانی کی جنہیں امیران سندھ کہا جاتا ہے۔

۱۸۱۹ء میں جب سکھوں نے ڈیرہ غازیخان پر قبضہ کیا تو لغاری قبیلہ نے کالا روڈ کے [illegible] سکھوں کا مقابلہ کیا مگر شکست کھائی۔ محمدؐ خان نے بارکھان کے علاقہ میں پناہ لی۔ وہ اصل لغاری [illegible] لغاری بارکھان کا سکونتی تھا۔ وہاں اُنکی خاندانی میراث متعلقہ زرعی اراضی قائم رہی اور وہاں سے محصول وغیرہ حاصل کرتے رہے۔ کچھ عرصہ بعد سکھوں اور لغاریوں کے درمیان صلح ہوگئی اور محمدؐ خان اپنے علاقہ میں واپس آگیا۔ محمدؐ خان نے سکھوں کی دوستی سے فائدہ اُٹھاکر مدد حاصل کی اور کھوسہ وگورچانی سے جنگ کی۔ بجر خان گورچانی کو جو قلعہ ملتان میں قید تھا، سکھوں سے حاصل کرکے انتہائی سفاکی سے قلعہ ملتان کے باہر قتل کردیا۔

محمدؐ خان کی وفات پر اُس کا بیٹا جمال خان کم عمر تھا لہٰذا رحیم خان نے موقع سے فائدہ اُٹھاکر چوٹی پر قبضہ کرلیا۔ رحیم خان کے خلاف کئی لغاری معززین اُٹھ کھڑے ہوئے مگر انہوں نے شکست کھائی اور تختہ دار پر لٹکا دیئے گئے۔ سخی سرور کے میلے میں گورنر ملتان کی ایک داشتہ سے بعض لوگوں نے چھیڑ چھاڑ کی۔ رحیم خان نے موقع غنیمت جان کر جمال خان کے کئی حامیوں کو اس جرم میں گرفتار کرکے سکھوں کے حوالہ کردیا جن کو پائیگاہ میں ایک بڑ کے درخت سے لٹکا کر پھانسی دے دی گئی۔ جمال خان بمعہ چند معتبرین چوٹی سے نکل کر مزاری اور گورچانی علاقہ میں پناہ گزیں ہوا مگر کچھ عرصہ بعد اپنے کو وہاں غیر محفوظ پاکر ٹبی لُنڈان میں پناہ لی۔ رحیم خان کے بھڑکانے پر سکھوں نے ٹبی لُنڈان سے پناہ گزیں حاصل کرنے کی غرض سے لالچ اور دھمکی سے کام لینا چاہا مگر لنڈ سردار نے اپنے باوٹھ (پناہ گزین) کو کسی صورت میں واپس نہ کیا۔ رحیم خان کی سخت گیر پالیسی سے قبیلہ نالاں ہوگیا اور جب اُسکی مخالفت بہت بڑھ گئی تو اُس نے بہاولپور فرار ہونے میں اپنی عافیت دیکھی اور وہاں رحیم آباد کی بنیاد رکھی۔

جمال خان اگرچہ سردار تھا مگر جلال خان کا اثر ورسوخ بہت زیادہ تھا۔ ملتان کی جنگ کے دوران جلال خان دیوان مولراج کی امداد کے لئے ملتان پہنچ گیا۔ جب اُسے دیوان مولراج کی کامیابی کا یقین نہ رہا تو وہاں سے فرار ہوکر ایڈورڈز کے پاس اسی افراد کے ساتھ حاضر ہوگیا۔ اگرچہ ایڈورڈز اُس کی آمد سے چنداں خوش نہ تھا مگر اُس کی تمنا یہ ضرور تھی کہ زیادہ سے زیادہ آدمی مولراج سے نکل کر اُسکے ساتھ مل جائیں۔ جلال خان کو

چونکہ کشتی نہ مل سکی تھی لہٰذا اُس نے دریائے سندھ کو سندھاری (مشکیزہ) پر تیر کر پار کیا تھا۔

جمال خان نے زراعت کی ترقی میں کافی دلچسپی لی۔ اُس نے نالہ مانکہ کی کھدائی، صفائی اور توسیع کا ٹھیکہ لیا۔ تاہم روایت ہے کہ اُس نے لغاری علاقہ میں کھدائی وغیرہ کے سلسلہ میں لوگوں سے بیگار لی۔ جو لوگ یہ بیگار نہ دے سکے تو انہوں نے اپنی اراضیات معاوضہ میں دیں جو سَراسَر ناانصافی تھی اور لوگوں کی لاعلمی سے پورا فائدہ اُٹھایا گیا۔ جمال خان کو لوگوں سے معاوضہ لینے کا حق نہ تھا کیونکہ وہ ٹھیکیدار تھا اور حکومت سے پورا معاوضہ وصول کیا گیا تھا۔ ویسے یہ نقطہ بھی مدِ نظر رہے کہ یہ ٹھیکے وغیرہ تمنداروں کو صرف اس لئے دے گئے تھے تاکہ فارورڈ پالیسی کے مطابق ان سرداروں کی مالی حالت بہتر ہو جائے اور پھر وہ اپنے قبائلی عوام سے من مانی کاروائی کرتے ہوئے انگریز کے ہاتھ مضبوط کریں۔ عوام کے ساتھ جو ظلم اور زیادتی ہوتی رہی انگریز اس سے چشم پوشی کرتا رہا۔

ابتداء میں جمال خان غلام حسین خان مشوری کی آزادی کی تحریک کی امداد کرتا رہا۔ اُس نے کھترانوں اور پہاڑی لغاریوں میں غلام حسین خان کے لئے پناہ گاہیں اور رسد کے مراکز قائم کر دئے تھے لہٰذا سنڈیمن (ڈپٹی کمشنر ڈیرہ غازیخان) نے جمال خان کو پھانسنے کا پروگرام بنایا۔ چونکہ نہروں (مانکہ اور دھندی) کی توسیع سرکاری خرچ پر ہو رہی تھی اور جمال خان ٹھیکہ دار تھا لہٰذا سنڈیمن نے راجن پور سے بروس کو خفیہ طور پر روانہ کیا اور جمال خان کے کاردار کی کتابیں اور بہی کھاتے قبضہ میں لے کر غبن کا مقدمہ کھڑا کر دیا۔ بروس نے جمال خان کے کاردار ہری رام کو سلطانی گواہ بنایا۔ جب مقدمہ عدالت میں پیش ہوا تو ہری رام گواہی سے پھر گیا۔ اس سے سنڈیمن کی تمام اُمیدوں پر پانی پھر گیا۔ تاہم اس نے ہری رام کو سات سال قید بامشقت اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا دیکر دل کی بھڑاس نکال لی۔ جمال خان سے کچھ عرصہ کے لئے اختیارات بھی چھین لئے گئے۔

۱۸۷۴ء میں فورٹ منرو (اناری مول) پر کاکڑ قبیلہ نے حملہ کیا اور سات لغاری از فرقہ ہدیانی کو قتل کر کے سامان و مال مویشی لوٹ کر لے گئے۔ دوسرے روز لغاری لشکر دشمن کے تعاقب میں روانہ ہوا۔ ... کو بھی اس کی اطلاع مل گئی۔ لغاری لشکر نے قلعہ مرغا پر حملہ کیا جو کوٹ خان محمد سے تقریباً پچاس میل کے فاصلے پر ہے۔ اس جنگ میں چالیس کاکڑ مارے گئے اور پچیس زخمی ہوئے۔ لغاری لشکر سے چودہ افراد کام آئے۔ بقیہ کاکڑ فرار ہو گئے۔ لغاری لشکر نے رات وہیں

(1) A Year on the Punjab Frontier Vol. II. P. 281 H. B. Edwardes

گذاری مگر دشمن کے شبخون کے پیشِ نظر سنتری مقرر کر دیئے۔ حسب توقع دشمن کے لشکر نے مغربی طرف سے حملہ کیا جس میں دشمن کے مزید بیس آدمی مارے گئے۔ اس جنگ سے حاصل ہونے والے مال سے جمال خان کا خمس نکال کر باقی تمام مال لشکر پر تقسیم کر دیا گیا۔ ہر سپاہی کو اٹھارہ بیل، ایک ضرب بندوق ایک تلوار، ایک ڈھال، چار بھیڑیں، ایک بکری، ایک گائے اور تین گدھے ملے۔

"سخی گراں (بستی عظیم) کا سید خاندان لغاریوں کا موروثی پیر تھا۔ یہی سبب ہے کہ جب کوڑا خان قیصرانی نے گُرے کو اغوا کیا تو لغاری سردار نے تین خاص آدمیوں کو روانہ کیا اور اُن کو سخت تاکید کی کہ وہ کوڑا خان کا سر کاٹ کر لائیں مگر وہ کامیاب نہ ہوئے۔ انگریزوں نے اُنکو (سید خاندان) "حسن خدمات کے صلہ میں ۲/۱ ۳ گاؤں کی اراضی دی۔"

۱۸۷۵ء میں جمال خان قلات کے مشن پر سنڈیمن کے ہمراہ گیا۔ خان قلات نے اُسے نیم الیسادہ ہو کر شرف ملاقات بخشا۔ یہ اعزاز صرف امام بخش خان مزاری اور جمال خان لغاری کو ملا۔ اُن سے خان قلات نے علیحدگی میں بلوچی سلطنت کی بقا کی خاطر کام کرنے کی استدعا کی مگر ان دونوں سرداروں پر حرص قابض ہو چکی تھی۔ انہوں نے ملکی وملی مفاد کو پس پشت ڈال کر تمام گفتگو سنڈیمن کو بتا دی۔ سنڈیمن نے اُن دونوں کو اپنی قوم کے مفادات کو نظر انداز کرنے پر نوابی کا خطاب دیا۔

۱۸۸۱ء میں جمال خان حج سے واپسی پر ڈیرہ غازیخان میں فوت ہوا اور اس کا بیٹا محمد خان سردار بنا جس نے ۱۸۹۶ء میں وفات پائی۔ اس کا بیٹا جمال خان نابالغ تھا لہٰذا تگیہ خان سربراہ تمندار مقرر ہوا۔ جب اُس نے ۱۹۰۵ء میں وفات پائی تو دین محمد خان سربراہ تمندار بنا۔ جمال خان لغاری نے سرداری سنبھالتے ہی اپنے قبیلے کی فلاح و بہبود کی طرف توجہ دی۔ انہوں اپنے علاقہ میں سکول قائم کئے جبکہ دیگر جاگیردار ہر طریقہ سے سکول بند کرانے پر مُصر تھے۔ اُس نے سب سے پہلے بٹائی کی وصولی ختم کی۔ اُس نے لغاری طلباء کو تعلیم کی طرف متوجہ کیا اور مڈل کے بعد تعلیم جاری رکھنے والے طلباء کے لئے وظائف مقرر کئے۔ پہلی مسلم تعلیمی کانفرنس جامپور ۱۹۱۴ء کے کئی اجلاسوں کی صدارت کی اور اُس کے فیصلوں کے مطابق عمل بھی کیا۔ یتیم اور بیواؤں کے لئے امداد اور وظائف مقرر کئے۔ اُس نے لنگر کا بھی خوب انتظام کیا۔ جو مسافر چوٹی زیریں آتا تو وہ لغاری سردار کا مہمان تصور ہوتا تھا۔ اس غرض سے ایک دفتر قائم تھا جہاں سے مسافر حسب مراتب اپنی خوراک کی پرچی حاصل کر کے سٹور (بھانڈہ) سے سامان حاصل کر سکتے تھے۔ گھوڑے وغیرہ کے لئے بھی رقم دی جاتی تھی۔ افسران اور معزز افراد کیلئے پکے پکائے کھانے کا معقول انتظام تھا۔ خیرات اور فلاحی کاموں میں جمال خان کی بیگم

بھی اُن سے کم نہ تھیں ۔ بیگم صاحبہ نہایت مخیر اور درد مند دل رکھنے والی خاتون تھیں ۔ انہوں نے سینکڑوں بیوہ عورتوں اور یتیم بچیوں کی سرپرستی کی ۔ جمال خان بذات خود نہایت سلجھے ہوئے اخلاق اور عادات کے مالک تھے ۔ اگرچہ انہوں نے اپنا اکثر وقت لاہور میں گذارا مگر وہ اپنے قبیلہ کے تمام معزز افراد کو ناموں سے جانتے اور پہچانتے تھے ۔ قبیلہ کے لوگ اس بگڑے ہوئے ماحول میں بھی اُن کی بڑی عزت اور احترام کرتے تھے ۔ وہ کچھ عرصہ خضر حیات خان ٹوانہ کی وزارت میں وزیر تعمیرات بھی رہے ۔ اُن کے بعد محمد خان سردار بنا ۔

گورچانی

گورچانی قبیلہ لاشار کی ایک شاخ ہے ۔ بعض نام نہاد مورخین نے اس قبیلہ کو غیر بلوچ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ۔ اس غلط فہمی کی بنیاد مسٹر ڈیمز کی کتاب " دی پاپولر پوائٹری آف دی بلوچیز " پر رکھی گئی ہے ۔ دراصل قبائلی جنگوں میں کسی بلوچ کو غیر بلوچ کہہ دینا ، دنیا کی عظیم ترین گالی تھی کیونکہ بلوچ فطرتاً اپنے نسب پر بڑا فخر کرتا ہے ۔ یہ اشعار دشمن کو زچ اور بے حوصلہ کرنے کے لئے کہے جاتے تھے ۔ ڈیمز کی پیروی کرتے ہوئے بہاولپور گزیٹیر کا مصنف لکھتا ہے کہ گورچانی دراصل آخری سومرہ حکمران حمیر کی اولاد ہیں جو سندھ سے بھاگ کر دراگل کے پہاڑوں پر آباد ہوا ۔ بلوچوں نے اُسے اپنا سرگروہ تسلیم کر لیا ۔ تاہم یہ ایک بے سروپا کہانی ہے جس کو گورچانی قبیلہ کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے ۔ جب یورپین اقوام جوع الارض میں دنیا کے مختلف خطوں میں حیلوں ، بہانوں اور اسلحہ کی برتری کی بدولت قبضہ کر رہی تھیں تو ایشیا اور افریقہ کے عوام کے اتحاد کو کمزور کرنے اور قبائل کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی خاطر نام نہاد مورخ اور دانشور تحقیق کا ڈھونگ رچا کر اپنے ملک کی سیاسی برتری قائم کرنے میں ممد و معاون ہو رہے تھے ۔ کہاوت ہے کہ جب یورپین اقوام افریقہ میں داخل ہوئیں تو اُن کے ہاتھ میں انجیل تھی اور افریقی عوام کے پاس زمین مگر پھر زمین یورپ والوں کے ہاتھ میں پہنچ گئی اور افریقی عوام کے ہاتھ میں صرف انجیل ۔ بلوچ قوم کو بھی کمزور کرنے کی غرض سے نام نہاد انگریز مورخوں نے بروہی ، گورچانی ، دودائی وغیرہ کے متعلق بے سروپا نظریے پیش کئے تاکہ وہ اپنے قومی دھارے سے علیحدہ ہو جائیں ۔ اورنگ زیب عالمگیر ، نادر شاہ ، احمد شاہ ابدالی ، غلام شاہ کلہوڑہ کے وقت کے مورخ توان کو بلوچ کے نام سے یاد کریں مگر انگریز کے آتے ہی وہ غیر بلوچ بن جاتے ہیں ۔ کوئی انگریز سفر کرتا ہوا آیا اور کہیں بھی دو ایام سے زیادہ نہ ٹھہرا ۔ اس قلیل

(1) Bahawalpur State Gazetteer 1904 P. 35

عرصہ میں اُس نے جو کچھ کسی سے سنا اپنی کتاب میں درج کر دیا۔ قبائلی یا خاندانی چپقلش کی بدولت راوی نے واقعات کو توڑ مروڑ کر دل کی بھڑاس نکالی جو اب مصدقہ تاریخ مانی جاتی ہے۔ یہ اصول فن تاریخ کے خلاف ہے۔ لوگوں نے تنگ نظری کی بناء پر دوسرے قبائل کو بدنام کرنے کی خاطر کیسے کیسے حربے استعمال کئے تو اس کی ادنیٰ سی مثال رزمیہ اشعار سے ظاہر ہوتی ہے جس میں انہوں نے گولہ دگو پانگ دستی وغیرہ کے علاوہ "ٹالپور"، کرد"، گادھی اور مری کو میر چاکر خان کا غلام قبیلہ ظاہر کیا گیا ہے جن کو میر چاکر خان کی بہن بانڑی نے آزاد کر دیا تھا۔ پھر مسٹر ڈیمز لکھتے ہیں کہ لغاری قبیلہ میں میر شہداد خان کسی اہمیت کا حامل نہ تھا حالانکہ گل بہار میں[1] لالہ ہتورام لکھتے ہیں کہ میر شہداد خان لغاری قبیلہ کا مقدم کلاں (امیر الامرا) تھا۔ اگر وہ ایسی ہی کم حثیت کا مالک تھا تو کلہوڑہ خاندان نے اُسے اپنا سپہ سالار اور وزیر اعظم کیسے بنالیا؟ مری قبیلہ کا جدامجد میر بجار خان اپنے کو رزمیہ اشعار میں بیتر رندوں کا بادشاہ کہتا ہے۔ بھلا کوئی غلام بھی ایسا دعویٰ کرسکتا ہے جبکہ میر چاکر خان ابھی تک زندہ تھا۔ اسی طرح سے انساب کا ایک ماہر ڈوم (بقول ڈیمز) ٹالپور کو نسلاً بلیدی کہتا ہے حالانکہ ٹالپور موضع لواں تحصیل و ضلع ڈیرہ غازیخان کے رہنے والے لغاری ہیں جہاں کوئی بلیدی آبادی نہیں۔ میر شہداد خان، لغاری سردار سے ناراض ہو کر سندھ چلا گیا تھا۔ اورنگ زیب اپنے خطوط میں دودائی حکمرانوں کو بلوچ لکھتا ہے مگر آج کے نام نہاد مورخ انہیں غیر بلوچ ثابت کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ سنی سنائی باتوں والے آنکھوں سے دیکھنے والوں کے برابر کیسے ہو سکتے ہیں؟ اورنگ زیب کو حاجی خان دودائی سے واسطہ رہا لہٰذا وہ صحیح ہے اُن لوگوں کی نسبت جن کی بنیاد صرف ڈوموں اور بھانڈوں کے اشعار ہیں۔

ان مفروضوں اور تحقیق کا مقصد انگریز حکومت کے ہاتھ مضبوط کرنا تھا تاکہ یہ قبائل اپنوں ہی میں اجنبی بن کر رہ جائیں اور اتحاد کی صورت نہ نکل سکے۔ انگریز مورخوں نے لکھا ہے کہ گورچانی تمندار کے بیان کے مطابق وہ نسلاً سومرے ہیں۔ اس عظیم جھوٹ کا پول اس طرح سے کھل جاتا ہے کہ اُس دور میں جملہ مسلمان اقوام اپنی نسلی برتری ثابت کرنے کیلئے اپنا شجرہ نسب عرب سے ملانے میں فخر محسوس کرتے تھے۔ ایسے دور میں ایک بلوچ سردار اپنا نسب سومرہ سے کبھی ملانا پسند نہ کرتا کیونکہ سومرے اس کی نظر میں ہندو تھے (حقیقتاً اسمٰعیلی تھے) اور کبھی بھی ہندو کی اولاد کہلانا پسند نہ کرتا کیونکہ اس علاقہ میں ہندو کا مطلب نہایت بزدل انسان ہے۔

مسلمانوں نے اپنا شجرہ نسب عربوں سے ملانے کیلئے کیسے کیسے جتن کئے ہیں تو اس کی ایک مضحکہ خیز مثال کوٹلہ مغلاں کے خوانین کی ہے جو ایک معزز مغل خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کو یقیناً معلوم ہوگا کہ دنیا میں سب سے زیادہ بادشاہی مغلوں (ترکوں) نے کی ہے مگر اس کے باوجود انہوں نے ناطہ عربوں

---

(1) بلوچ قبائل ایل۔ ڈیمز ترجمہ کامل القادری ص 59 1961

سے جوڑنے میں فخر محسوس کیا اور وہ اب اپنے کو مغل پٹھان بنی اسد لکھواتے ہیں ۔ مغل پٹھان نہیں اور دا
کسی صورت میں عربوں کے قبیلہ بنی اسد کے افراد نہیں ہو سکتے ۔ پھر جمیر کو سمہ نے سندھ کے تخت
۷۵۲ھ (۱۳۵۲ء) میں محروم کیا جبکہ بلوچوں کی آمد اس خطہ میں پندرھویں صدی عیسوی میں ہوئی ۔ جب
بلوچوں نے کوہ سلیمان پر قبضہ کیا تو دراگل پر ناٹبروں کا قبضہ تھا ۔ سومرے وہاں نہیں تھے ۔ عقل سلیم یہ تسلیم نہیں
کرتی کہ اس دور کے بلوچ جو لڑنے کیلئے جیتے تھے اور جینے کیلئے لڑتے تھے ، ایک غیر بلوچ کی نہ صرف اطا
کریں گے بلکہ اسے اپنا سردار بنالیا ۔

درحقیقت گورچانی سینہ زوری اور ڈاکہ زنی میں اس خطہ میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے جس کی تصدیق
مسٹر ایڈورڈز بھی کرتے ہیں ۔ ان جنگوں کے دوران شغان (طعنہ) بنائے گئے ہونگے جن کو انگریزوں نے بھی
سن لیا ۔ بس تاریخی تحقیق پوری ہوگئی اور اسے کتابی صورت میں شائع کر دیا ۔ اب جو بھی آتا ہے وہ اس کہاوت
کو من وعن تسلیم کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتا ہے ۔ وہ شغان اب ان لوگوں کے لئے الہامی درجہ
حاصل کر چکے ہیں حالانکہ مورخین کا فیصلہ ہے کہ بھانڈوں اور شعرا کے اشعار کو تاریخ کی بنیاد نہیں بنایا
جا سکتا ۔ اصل صورت یہ ہے کہ سومروں کا گورچانی بلوچوں سے کوئی تعلق نہیں البتہ یہ ممکن ہے کہ ان کے
خاندان میں کوئی شخص سومرہ نامی گذرا ہو جس کی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہوئی ہو ۔ اس دور میں بلکہ اب
بھی بعض افراد کے نام بلوچ خان ، ناہڑ خان ، پٹھان خان ، سومرہ خان ، رند خان ، گجر خان وغیرہ ہوا
کرتے ہیں ۔ اسی سبب سے عوامی غلطی پیدا ہوئی اور اسے سومرہ قوم سے منسوب کر دیا ۔

میر دوداخان لاشار کے بیٹے گورش خان کی اولاد ہونے کی وجہ سے یہ قبیلہ گورشانی یا گورچانی کہلایا ۔
اس قبیلہ میں درکانی ، شیخانی ، لاشاری ، پتافی ، جسکانی ، سبزانی ، شہکانی ، خلیلانی ، ہوتوانی ، الکانی ، چا
سہرانی اور بازگیر شامل ہیں ۔ گورش خان میر چاکر خان کے ہمراہ پنجاب کی لڑائیوں میں شامل رہا ۔ یہ قبیلہ
ابتدا میں علاقہ ماڑی اور دراگل پر آباد تھا جہاں سے انہوں نے افغانوں کو نکال دیا تھا ۔ بعد میں انہوں
نے شم پھلاوغ اور کوہ ماڑی سے گذر کر ہڑند کے زرخیز میدانوں پر قبضہ جمایا جہاں درہ کاہا سے سارا
سال بہنے والا نالہ آبپاشی کا ذریعہ تھا ۔ لعل خان گورچانی نے ہڑند کے قریب اپنے نام پر قصبہ آباد کیا ۔ احمد شاہ
ابدالی نے لعل خان کو فوجی خدمات کے اعتراف میں قندھار جانے والے کارواں کی سڑک کا محافظ مقرر کیا ۔
یہ سڑک درہ چھاچھڑ سے گذرتی ہے اور اسے فی اونٹ آٹھ آنے بطور بدرقہ وصول کرنے کا حق ملا ۔ پانی پت
کی جنگ میں لعل خان میر نصیر خان اعظم کے ہمراہ رہا اور وہاں کارہائے نمایاں سرانجام دئے ۔ لعل خان کی وفات
پر جلب خان سردار بنا جس نے لغاری خاندان میں شادی کر کے رشتہ داری کر لی ۔ جلب خان کے چھوٹے

بھائی غلام محمد خان کے دورِ سرداری میں مری قبیلہ نے حملہ کیا جس میں غلام محمد خان بمعہ چالیس ہمراہی [۲۱] آیا۔ اس کے علاوہ غلام محمد خان کے دو بیٹے لعل خان اور کھکھل خان بھی مارے گئے۔ غلام محمد خان کے بعد اس کا پوتا چھتہ خان سردار بنا جس کے وقت رنجیت سنگھ نے ۱۸۲۷ء میں داجل و ہڑند پر قبضہ کر لیا۔ گورچانی اور سکھوں کے درمیان کبھی مفاہمت نہ ہو سکی بلکہ ہمیشہ ایک دوسرے کے خلاف صف آرا رہے۔ اس مار دھاڑ کو روکنے کے لئے رنجیت سنگھ نے ہڑند کہنہ کے کھنڈرات سے اینٹیں نکلوا کر قلعہ تعمیر کرایا جس پر مبلغ ایک لاکھ روپے صرف ہوئے۔ اس قلعہ کے سولہ پہلو ہیں اور کل احاطہ بارہ سو مربع گز ہے۔ دیواروں کی بلندی ابتدا میں چھبیس فٹ اور برج اکتیس فٹ تھے مگر جب انگریزوں نے اس قلعہ پر قبضہ کیا تو اس کے تمام برج گرا دئے گئے اور ان اینٹوں سے ارد گرد کے علاقوں میں کنوئیں احداث کرائے۔ اس قلعہ کی تعمیر کے دوران ہرسا سنگھ نامی قلعہ دار تھا جس نے ایک گورچانی کو معمولی مقدمہ میں ماخوذ کر کے قتل کر دیا۔ اس جھگڑے میں ایک گورچانی عورت بھی ماری گئی۔ بلوچوں کو جب اس بے دردی اور ظلم کا علم ہوا تو انہوں نے تاجو خان نہکانی کی سرکردگی میں ہڑند پر حملہ کیا۔ ٹبی لنڈان کے بلوچوں نے بھی ان سے تعاون کیا۔ بلوچوں نے قلعہ دار ہرسا سنگھ کو قتل کر کے قلعہ کو لوٹ لیا۔ سکھوں نے تاجو خان کو گرفتار کرنے کی بڑی کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ اس عرصہ میں گورچانی قبیلہ میں پھوٹ پڑ گئی کیونکہ جلب خان کے بیٹے بجر خان نے قبیلے کی سرداری پر اپنا حق ظاہر کر کے مطالبہ کیا کہ اس کا بھتیجا اس منصب سے دستبردار ہو جائے۔ اگرچہ بجر خان قانون کے مطابق اپنے دعویٰ میں حق بجانب تھا مگر چھتہ خان نے تمنداری کے منصب کو چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ بجر خان نے لشکر جمع کر کے چھتہ خان پر حملہ کیا۔ لنڈی سیداں کے مقام پر چھتہ خان میدان جنگ میں مارا گیا اور بجر خان فتحیاب ہوا۔ چونکہ لغاری اور سکھوں کے مراسم دوستانہ تھے لہٰذا وہ دونوں بجر خان کے جانی دشمن بن گئے کیونکہ چھتہ خان کی موت پر لغاری سردار کی بیٹی بیوہ ہو گئی تھی۔ لغاریوں اور سکھوں کے متحدہ لشکر کی تاب مقابلہ نہ پا کر بجر خان نے پہاڑ میں پناہ لی۔ اس نے پہاڑی لاشاریوں اور درکانیوں کی مدد سے دشمنوں کے علاقوں پر چھاپہ مارنے کا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا۔ بجر خان کے چھاپہ مار ملتان تک سرگرم عمل رہے اور دیوان ساون مل اسے کسی طریقہ سے گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ جب سکھ مردانہ وار بجر خان اور تاجو خان کو گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے تو سازشوں کا جال بچھایا گیا۔ انہوں نے بجر خان کو مصالحت کیلئے قلعہ ہڑند میں بلوایا اور وہاں سے قید کر کے فوج کے پہرے میں ملتان روانہ کر دیا۔ لغاری سردار نے اپنے داماد کا انتقام لینے کی غرض سے گورنر ملتان کو بھاری رشوت دیکر قیدی کو حاصل کر لیا اور قلعہ ملتان کے باہر اسے قتل کر

دیا ۔ یہ فعل نہ صرف بزدلانہ تھا بلکہ بلوچی آئین (ہمیار) کے بھی خلاف تھا۔ تاجو خان کو قتل کرنے کیلئے قلعہ دار ہڑند محکم چند نے وزیر خان پتافی کو اس طمع پر رضامند کر لیا کہ تاجو خان کو قتل کرنے پر اُسے درہ کاہا سے گذرنے والی ندی پر اراضیات بمعہ حقوق آبپاشی دے جائینگے ۔ تاجو خان کو آخر وزیر خان نے دھوکہ سے قتل کر کے سر محکم چند کو پیش کیا اور اسطرح سے اُس غدار نے اراضی حاصل کی ۔ ایسے ہی غدار قوم کے جسد میں ناسور بن جاتے ہیں اور ہر محب وطن کو تباہ کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں ۔

بجر خان لاولد فوت ہوا اور اُس کا بھائی غلام حیدر خان سردار بنا مگر وہ اپنے قبیلہ کو خوش نہ رکھ سکا۔ جب ایڈورڈز نے ہڑند فتح کرنے کی غرض سے لفٹنٹ ریلیف ینگ کو روانہ کیا تو غلام حیدر خان اور اُس کا قبیلہ انگریزوں کا حامی بن گیا۔ انگریزوں کی حکومت قائم ہو جانے پر غلام حیدر خان نے انگریز کی ہاں میں ہاں ملائی کیونکہ اُن کے دم قدم سے اُسکا اقتدار قائم تھا۔ جب غلام حسین خان مشوری نے انگریزوں کے خلاف جہاد شروع کیا تو غلام حیدر خان نے بڑھ چڑھ کر اس کی مخالفت کی ۔ غلام حیدر خان ۱۸۸۴ء میں فوت ہوا۔ اس کے بعد لشکر خان سردار ہوا جس کو قضا نے بہت جلد دلبوچ لیا ۔ اُس کا بیٹا غلام حیدر خان نابالغ تھا لہٰذا اُس کا چچا محمد حسن خان سربراہ مقرر ہوا ۔ سن بلوغ کو پہنچ کر غلام حیدر خان سردار بنا ۔

دریشک

یہ قبیلہ قرائی خاندان کی ایک شاخ تصور کیا جاتا ہے جو ضلع ڈیرہ غازیخان کے علاقہ میں رود پٹوک اور سوری کے درمیان آباد ہے ۔ دریشک کے لفظی معنی مضبوط آدمی کے ہیں ۔ کہتے ہیں کہ دریشک قبیلہ کا مورث اعلیٰ میر چاکر خان کے ہمراہ مختلف لڑائیوں میں دادِ شجاعت دیتا رہا ۔ رند و لاشار کی لڑائیوں کے دوران ذوالنون بیگ ارغون کی فوجوں نے کئی لاشار عورتیں قیدی بنالیں ۔ جب میر چاکر خان کو اس کا علم ہوا تو وہ فوراً اپنے پاس لے آیا تاکہ اُن کو گھروں تک بحفاظت پہنچایا جا سکے ۔ ویسے بلوچی قانون جنگ میں عورتوں ، بچوں اور بوڑھوں سے کوئی تعرض نہیں کیا جاتا تھا ۔ رات کے وقت ان عورتوں کو ایک خیمہ میں رکھا گیا جس کی حفاظت پر دریشک قبیلہ کے مورث اعلیٰ کو مقرر کیا گیا ۔ رات کے وقت زبردست آندھی اور بارش نے خیمہ کی چوبیں اکھاڑ دیں اور رسوں کو توڑ دیا تو اُس دلیر محافظ نے خیمہ کو اپنے کندھوں پر اُٹھا کر رات گذار دی ۔ میر چاکر خان کو جب اسکی بہادری ، طاقت ، ایثار اور احساس فرض شناسی کا علم ہوا تو اُسے "تھنگویں دریشک" یعنی سونے کا طاقتور آدمی کا خطاب دیا۔

اُسی روز سے وہ درلیشک کے نام مشہور ہوا ۔ اس قبیلے میں کرمانی، منگوانی، گلفاذ (پھول جیسے پاؤں والے) سرگانی، عربانی اور جسکانی شامل ہیں ۔

جب درلیشک قبیلہ میدانی علاقہ میں آباد ہوا تو علاقہ راجن پور اور ہڑند پر ناہڑ خاندان کی حکومت تھی جس کے حاکم اسلام خان نے رودھن خان درلیشک کو آسنی کے گرد و نواح میں زمین دی ۔ ان ایام میں جسکانی دامن کوہ میں آباد تھے ۔ درلیشک اور جسکانی کی جنگ چھڑ گئی جس میں جسکانی نے شکست کھائی اور اُن کا شیرازہ بکھر گیا ۔ اس شکست کے بعد جسکانی قبیلہ گورچانی اور درلیشک قبائل میں مدغم ہو گیا ۔ ۱۷۶۹ء میں جب آخری میرانی حاکم ڈیرہ غازیخان کو غلام شاہ کلہوڑہ گرفتار کر کے لے گیا تو محمود خان گجر حاکم بن گیا ۔ محمود خان نے درلیشک قبیلہ پر بھی اپنی طاقت کے بل بوتے پر حکومت قائم کرنے کی کوشش کی مگر درلیشک قبیلہ نے اپنے نامور سردار عظمت خان کی قیادت میں مقابلہ کیا ۔ محمود خان نے کچھ عرصہ تک آسنی کا محاصرہ بھی کر لیا مگر عظمت خان نے اُس کے ایک سو چالیس سپاہیوں کو قتل کیا اور اُس سے بہُت سی بندوقیں اور ہتھیار بھی چھین لئے ۔ آخر کار محمود خان نے عظمت خان سے صلح کر لی اور مواضعات راجن پور، محمد پور، جلال پور، غوث پور، شاہ پور اور دنیا پور کے محاصل میں بیسواں حصہ حق کسور دیا ۔

عظمت خان کی وفات پر اُس کا بیٹا حیات خان سردار بنا ۔ داجل اور ہڑند کے علاقہ پر میر رحیم خان نے اپنے بھائی میر مصطفےٰ خان کو قتل کر کے حیات خان کی امداد سے عارضی طور پر قبضہ جمایا ۔ داجل اور ہڑند کی حفاظت پر حیدر خان کاردار مقرر تھا جس نے جوانمردی سے مقابلہ کیا اور اپنا فرض منصبی ادا کرتے ہوئے اپنے ایک سو ہمراہیوں سمیت جاں بحق ہوا ۔ حیدر خان پر آفرین ہے کہ نامساعد حالات کے باوجود اپنے فرض سے مُنہ نہ موڑا اور ایک ظالم کی اطاعت قبول نہ کی ۔ انگریز شاعر ورڈز ورتھ نے ایسے ہی لوگوں کی مثال سامنے رکھتے ہوئے کہا "قومیں سونے اور چاندی سے بڑی اور عظیم نہیں کہلاتی بلکہ اپنے اُن افراد سے جو عزت اور عظمت کی خاطر بڑی سے بڑی مصیبت خندہ پیشانی سے جھیل جاتے ہیں"

جب قلات کی مرکزی حکومت کمزور پڑنے لگی تو مری اور بگٹی قبائل نے درلیشک پر حملے شروع کر دئے ۔ ۱۸۴۸ء میں درلیشک کے سردار بجر خان نے اپنے چچازاد بھائی بخش خان کی قیادت میں ایک فوجی دستہ محاصرہ ملتان کے لئے روانہ کیا ۔ ۱۸۵۷ء میں جب مری قبیلہ نے حملہ کیا تو اُس لڑائی میں بجر خان اور اُس کا بیٹا دریھن خان بمعہ اڑتیس دیگر افراد مارے گئے ۔ بجر خان کی وفات پر میرن خان نابالغ تھا ۔ میرن خان نے ۱۸۹۰ء میں وفات پائی اور اُس کا بیٹا دریھن خان سردار بنا جو بالکل ناخواندہ تھا ۔

اُس کے بعد سَردار بہادر خان نے تمنداری سنبھالی جو اعلیٰ سول عہدوں پر مامور رہا۔

مزاری

یہ قبیلہ ضلع ڈیرہ غازیخان کے انتہائی جنوبی علاقہ میں آباد ہے۔ بلوچی زبان میں شیر کو مزار کہتے ہیں اور مزار خان (شیر خان) بلوچوں میں ایک معروف نام ہے۔ مزار خان کی اولاد ہونے کی وجہ سے یہ قبیلہ مزاری کہلایا۔ اس قبیلہ کا جیسا نام ہے قدرت نے اُسی قدر جرأت اور جذبہ حریت بھی اس قبیلے میں ودلیعت کیا ہے۔ شاید یہ نام کا شرف ہے کہ متعدد سیاسی انقلابات بھی اس قبیلے سے اُس کی انفرادیت نہیں چھین سکے بلکہ ہر طوفان میں اپنی آزادی کے جھنڈے کو سَر بلند رکھا۔

مزاری قبیلہ بلوچستان سے نکل کر جیکب آباد (خان گڑھ) کے مغرب میں کوہ جمبر پہ قابض ہوا۔ جب بیزن خان اس قبیلہ کا سَردار تھا تو اُس وقت اسحاق خان مزاری ایک قابل، جری اور معاملہ فہم نوجوان تھا جس نے اپنے قبیلہ کی فلاح و بہبود کے لئے بے لوث خدمات سَرانجام دیں۔ جب قبیلہ کے سَردار تک اسحٰق خان کی بہادری اور بے لوث خدمات کا چرچا ہوا تو اُس نے اُسے بلوایا۔ اگرچہ بیزن خان ہر دل عزیز تھا تاہم اس نے محسوس کیا کہ اسحٰق خان کی سَرداری میں قبیلہ کی ترقی کے امکانات زیادہ روشن ہیں۔ اُس دَور کے سَرداروں میں قومی بہتری اور برتری اُنکے ذاتی مفاد اور وقار کی نسبت زیادہ افضل ہوا کرتی تھی لہٰذا بیزن خان نے اپنے ہاتھ سے سَرداری کی دستار اسحٰق خان کے سَر پہ رکھ دی اور اُسکی سَرداری کا اِعلان کر دیا۔ وہ قوم اور قبیلہ کس قدر خوش نصیب ہے جس کے قائد اور سَردار بیزن خان کی طرح ذاتی مفاد کو پس پشت ڈال کر قوم کی بھلائی کو مقدم رکھتے ہیں اور اس طرح آنے والی نسل کے لئے ایثار اور قربانی کی قابل تقلید مثالیں چھوڑ جاتے ہیں۔ بیزن خان کی قربانی رائیگاں نہ گئی بلکہ قومی زندگی کے پیکر میں مسلسل ایثار کی روح رواں ہوگئی۔ یہ اس قربانی کا اثر تھا کہ اسحٰق خان کی نسل سے کئی خادمِ قوم پیدا ہوئے جنہوں نے قبیلہ کی ناموری کی دھاک دُور دُور تک بٹھا دی۔ اسحٰق خان کے بعد اُس کا بیٹا بالاچ خان اور پھر باطل خان (لبطل خان) سَردار ہوئے۔ باطل خان کو جب سَرداری کی دستار پیش کی گئی تو اُس نے قوم سے چند شرائط تسلیم کرانے کے بعد اُسکو قبول کیا۔ ان شرائط کی رو سے باطل خان اپنی ننھی حکومت کی داغ بیل ڈال سکا یعنی قبائلی حکومت کے اخراجات کے لئے اُس نے قبیلہ سے ٹیکس وصول کرنے شروع کئے۔ اس سے پہلے سَردار قبیلہ اخراجات کے لئے قوم سے کچھ نہیں حاصل کرتا تھا اور کوئی حکومت بغیر آمدنی قائم نہیں رہ سکتی۔

باطل خان کے خلاف چانڈیہ قبیلہ نے چڑھائی کی۔ اس جنگ کی وجہ یہ تھی کہ کسی قبیلے کے دو سردار نندو خان اور موٹن خان چانڈیہ قبیلے سے شکست کھا کر مزاریوں کے ہاں پناہ گزین ہوئے۔ ابتدائی لڑائیوں میں باطل خان کامیاب رہا مگر ایک لڑائی میں حمل خان چانڈیہ کے تیر سے میدان کارزار میں کام آیا۔ باطل خان کے بعد چند غیر معروف سردار ہوئے۔ پھر قبیلہ کی قسمت حمل خان دوم کے ساتھ وابستہ ہوگئی۔ حمل خان کے وقت قبیلہ کی آبادی بہت بڑھ گئی اور گزر اوقات کے لئے مشکلات کا سامنا ہونے لگا۔ اُس نے کن کے ناہڑ حکمران قائم خان سے اجازت لیکر مزاریوں کو میدانی علاقے میں آباد کیا۔ ناہڑوں کی حکومت ڈیرہ غازیخان میں ہڑند، کن، اور بھاگسر کی تین ریاستوں میں منقسم تھی۔ حمل خان کے وقت جب کن اور بھاگسر کے درمیان جنگ کے شعلے بھڑک اُٹھے تو قائم خان نے حمل خان سے امداد طلب کی۔ حمل خان کی بر وقت امداد قائم خان کے لئے سودمند ثابت ہوئی۔ مزاریوں نے بھاگسر پر قبضہ کرلیا جس کے صلہ میں قائم خان نے حمل خان کو روجھان اور دریائے سندھ کا درمیانی علاقہ دے دیا۔ مزاریوں نے پھر کوہ سلیمان اور روجھان کے درمیانی علاقے پر بھی قبضہ کرلیا۔ حمل خان نے علاقے کا بہت اچھا انتظام کیا اور زمین کی پیداوار بڑھانے کے لئے دریائے سندھ سے ایک نہر نکالی جو حمل واہ کے نام سے مشہور ہوئی۔ اپنے سردار کی بہادری اور قابلیت کی بنا پر مزاریوں نے اپنے حریف قبائل چانڈیہ اور بگٹی کو شکست دے کر علاقے کا دفاع مضبوط کیا۔ حمل خان صرف مردِ میدان ہی نہ تھا بلکہ اعلیٰ درجے کا منصف مزاج اور منتظم بھی تھا۔ اس کے عہد میں مزاری قمار بازی کی عادت میں گرفتار تھے۔ ایک دفعہ پانچ مزاری سپاہی جنگ بگٹی کے دوران اتفاقاً فوج سے بچھڑ گئے اور ایک جگہ بیٹھ کر جوا کھیلنے لگے۔ وہ اس مشغلہ میں اسقدر محو ہوئے کہ بگٹی دستے کو بالکل بھول گئے جو اُن کا سراغ لگا رہا تھا۔ آخر کار وہ دستہ اچانک اُن پر حملہ آور ہوا اور تمام کو قتل کر ڈالا۔ جب یہ خبر سردار قبیلہ کو ملی تو اُس نے قسم کھائی کہ اب اگر کسی مزاری کو جوا کھیلتا ہوا دیکھونگا تو اُسے قتل کر دونگا۔ اس اعلان کے بعد اُس نے ہر ممکن طریقہ سے قبیلہ کو اس لعنت سے بچانے کی کوشش کی۔ اُس کا قانون اور قسم صرف عوام کیلئے ہی نہ تھے بلکہ جب اُس نے اپنے بیٹے کو اس شیطانی شغل میں مصروف پایا تو اُسے بھی معاف نہ کیا۔ باپ کے بدلے ہوئے تیور دیکھکر بیٹے نے دیوار پھاند کر فرار ہونے کی کوشش کی مگر اس اثنا میں حمل خان کی کمان سے نکلا ہوا تیر نوجوان کی ران کو چیر کر دیوار میں پیوست ہوچکا تھا۔ قبیلہ والے بھی سمجھ گئے کہ اُن کے سردار کی گفتار اور کردار میں تفاوت نہیں بلکہ وہ جو کچھ کہتا ہے اُس پر عمل کرتا ہے۔

حمل خان کے بعد مٹھا خان سردار بنا جس نے ۱۷۶۴ء میں وفات پائی اور اُسکے بیٹے میر گل

شیر خان نے مزاری قبیلہ کی قیادت سنبھالی ۔ میر گل شیر خان کو میر نصیر خان اعظم خان بلوچ سے مقابلہ کرنا پڑا ۔ چونکہ میر نصیر خان تمام بلوچ قبائل کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنا چاہتا تھا لہٰذا اُس نے مزاری قبیلہ پر بھی حملہ کیا ۔ میر گل شیر خان بہادری سے لڑتا ہوا مارا گیا ۔ بروہی بلوچوں (خان قلات) نے مزاری علاقے کو قابو میں رکھنے اور اُس کی حفاظت کے لئے کشمور میں قلعہ تعمیر کرایا ۔ مزاری میدانی علاقہ چھوڑ کر پہاڑیں میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے ۔ کافی جمعیت اکٹھی کر لینے کے بعد میر گل شیر خان کے بیٹے میر شاہ علی نے کشمور پر قبضہ کر کے علاقے کو آزاد کرا لیا ۔ میر شاہ علی خان علاقہ "چانڈکو" پر بھی مسلسل لڑائیوں کے بعد قابض ہو گیا ۔ علاقہ چانڈکو لاڑکانہ کے مشرق میں دریائے سندھ کے کنارے واقع ہے ۔ میر شاہ علی خان کی وفات پر میر دوست علی خان اور پھر حمل خان سوم سردار بنے ۔ حمل خان سوم کے وقت بروہیوں نے علاقہ پر پھر قبضہ کرنے کی کوشش کی اور روجھان پر قبضہ کر کے عمر کوٹ کے مقام پر قلعہ تعمیر کیا تاہم میر حمل خان نے بروہی سرداران میہان خان اور سنجر خان کو قتل کر کے علاقے کو پھر آزاد کرا لیا ۔ حمل خان سوم نے ۱۸۰۱ء میں وفات پائی اور اُس کا بیٹا میر بہرام خان سردار بنا ۔

میر بہرام خان اوّل کے عہد میں سکھوں نے ۱۸۱۹ء میں ڈیرہ غازیخان پر قبضہ کیا ۔ اگرچہ مزاری قبیلہ خود مختیار تھا مگر رنجیت سنگھ نہ صرف اپنے کو درانی حکومت کے خاتمہ پر ان علاقوں کا وارث سمجھتا تھا بلکہ اُس کا ارادہ سندھ میں بھی سکھوں کی حکومت کا قیام تھا ۔ اُس نے ہر ممکن حیلے سے مزاری علاقہ پر قبضہ جمانا چاہا ۔ رنجیت سنگھ نے ۲۶ دسمبر ۱۸۳۲ء میں انگریزی حکومت (ہند) کے ساتھ دریائے سندھ کی جہازرانی کے متعلق جو معاہدہ کیا تھا(۱) اس میں مزاری قبیلہ کو آزاد تسلیم کر کے جہازرانی سے متعلقہ آمدنی میں اُن کو حصہ دار بنایا گیا تھا مگر رنجیت سنگھ کی حرص نے مجبور کیا کہ وہ اپنے کمزور ہمسایوں پر چڑھ دوڑے ۔ لوابان ملتان، ساہیوال، خوشاب، منکیرہ اور ڈیرہ اسماعیل خان اُس کی ہوس ملک گیری کی بھینٹ چڑھ چکے تھے اور اَب اُسکی نظر میں تازہ شکار مزاری تھے ۔ اس کے علاوہ رنجیت سنگھ کی نظر سندھ پر بھی تھی جسے حاصل کرنے کی اُسے بڑی تمنا تھی ۔ سندھ اور سکھ حکومتوں کے درمیان مزاری علاقہ واقع تھا جس کو سندھ کی فتح سے پہلے تسخیر کرنا لازمی تھا ۔ رنجیت سنگھ نے مزاری اور سکھ سرحد پر خود تنازعات پیدا کئے اور اس کا الزام مزاری قبیلہ کے سر تھوپا جس کی بنا پر سرحدی وارداتیں بڑھ گئیں ۔ سامراجی قوتوں کے ہمیشہ یہی ہتھکنڈے رہے ہیں ۔ واقعات

(1) History of the sikhs P.203 J-D- cunningham

کا رُخ حسبِ منشا دیکھ کر رنجیت سنگھ کو مزاری علاقہ سے گذر کر سندھ پر حملہ کرنے کا دیرینہ خواب شرمندہ تعبیر ہوتا نظر آنے لگا۔ دربار لاہور کو اپنی حسرت پوری کرنے میں نواب بہاولپور اور مزاری علاقے حائل تھے۔ چونکہ نواب بہاولپور نے رنجیت سنگھ کے خطرہ کے پیش نظر ۲۲ فروری ۱۸۳۳ء کو انگریزی سیادت قبول کر لی تھی لہٰذا اس کے علاقہ سے گذر کر سندھ پر حملہ کرنے کی اُسے جرأت نہ تھی۔ اب مزاری ہی وہ واحد قبیلہ تھا جو اُس کے عزائم میں حائل تھا جسے اس نے تر نوالہ سمجھ کر ہڑپ کرنا چاہا۔ اُس نے اپنے پرانے ہتھکنڈوں کو بلوچ قبائل پر بھی آزمایا۔ سکھوں نے نہ صرف بزدار، گِگٹی قبیلوں سے بُری طرح زک اٹھائی بلکہ مزاریوں سے چھیڑ چھاڑ بھی باعث مصیبت بن گئی۔ سکھوں کی فوج کا سب سے بڑا حربہ سوار فوج تھی جس کی ابتدا جسا سنگھ کلال نے کی تھی۔ اُس کی ماتحتی میں سکھ جتھے نقل و حرکت کرنے میں بڑے چست واقع ہوئے تھے اور حسب ضرورت آسانی کے ساتھ مجتمع اور منتشر ہو جاتے تھے۔ جسا سنگھ کلال نے اس برتری کی بدولت شہزاد تیمور سے لاہور چھین لیا۔ اس کے علاوہ شاہی فوجیں بھاری ساز و سامان کی وجہ سے جلدی نقل و حرکت نہ کر سکتی تھیں جبکہ سکھوں کے پاس نہایت مختصر سامان ہوتا تھا تاہم جن حربوں پر سکھوں کو تکیہ تھا اُن کا توڑ مزاریوں کے پاس موجود تھا۔ اُن کے پاس بلوچی نسل کے تیز رفتار اور سخت جان گھوڑے تھے اور بلوچ قبائلی نہایت معمولی خوراک پر طویل مسافت طے کرنے کی قوت رکھتے تھے۔ اِن حالات میں انہوں نے سکھوں کے تمام منصوبے خاک میں ملا دئے۔

میر بہرام خان نے سکھوں کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو گفت و شنید کے ذریعہ روکنے کی کوشش مگر اُس کی تمام مصالحانہ کوشش رائیگاں گئی۔ اپنی آزادی کو برقرار رکھنے اور سندھ وغیرہ پر اُن کے عزائم کو ملیا میٹ کرنے کے لئے مزاریوں نے بھی جوابی کاروائی شروع کی اور سکھوں کو آگ اور تلوار سے پامال کیا۔ مزاری سوار اچانک حملہ کرنے اور سکھوں کی فوجی چوکی کو لوٹ کر بقیہ سامان کو آگ لگا کر آناً فاناً غائب ہو جاتے۔ اس طرح سے گوریلا کاروائی کر کے بلوچوں نے سکھوں کو بُری طرح پامال کیا۔ رنجیت سنگھ کی مقامی فوج جب مزاریوں کو روکنے میں ناکام رہی تو اُس نے ملتان کے گورنر دیوان ساون مل کو فوج کے ہمراہ جانے کا حکم دیا۔ دیوان ساون مل نے مزاریوں کے قلعہ "بدلی" (چھوٹا بادل) پر حملہ کیا جس کو میر بہرام خان نے سکھوں کی آمد سے قبل خالی کر دیا۔ سکھ اس غیر متوقع نتیج پر بڑے خوش ہوئے تاہم اُن کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی۔ میر بہرام خان کے دلیروں نے سکھوں کے فوجی مرکز مٹھن کوٹ پر دھاوا بول دیا۔ جب سکھوں نے جوابی کاروائی کی

تومزاری شہر کو لوٹ کر خالی کرچکے تھے اور فوجی چھاؤنی تباہ ہوچکی تھی۔ سکھوں کی مزید فوجیں میدان جنگ میں آگئیں تومزاری قبیلہ نے میدانی علاقہ چھوڑکر پہاڑی علاقہ میں مورچہ لگایا اور وہاں سے سکھوں پر تاخت کرتے رہے۔ سید محمد لطیف لکھتے ہیں "۱۸۳۶ء میں دیوان ساون مل نے ملا سنگھ ولد جودھ سنگھ کو روانہ کیا تاکہ مزاریوں کو سزا دی جا سکے جنہوں نے سکھوں کی چوکیوں پر حملے کیے تھے۔ سکھ اور مزاری لٹیروں کے درمیان ایک جھڑپ میں ایک سو مزاری مارے گئے تھے۔ ناہڑ سنگھ کو روجھان کی طرف روانہ کیا گیا اس کے ہمراہ فوج اور ایک عدد توپ تھی تاکہ سکھوں کی سرحد پر امن بحال کیا جائے۔ مہاراجہ نے غلام شاہ کو امداد دی اور اسے روجھان میں جگہ دی جس کو ٹالپوروں نے سندھ سے بے دخل کردیا تھا۔ اسے کابل کی طرف سے بھی جاگیر ملی ہوئی تھی" اس حوالہ میں غلام شاہ کی امداد کا ذکر ہے جو غلط ہے بلکہ یہ جاگیر میاں عبدالنبی خان کو دی گئی تھی۔[1] پھر لکھتے ہیں "اگست ۱۸۳۶ء میں دیوان ساون مل نے مہاراجہ کو مطلع کیا کہ سکھوں کی چوکیوں پر مزاریوں کے بار بار حملوں کے سبب روجھان پر قبضہ کرلیا گیا ہے۔ اکتوبر میں مزاریوں اور سکھوں کے درمیان ایک اور جھڑپ ہوئی جس میں مزاریوں نے شکست کھائی اور ان کے قلعہ "کن" پر فاتح سکھوں نے قبضہ کرلیا۔ شہزادہ کھڑک سنگھ اور نونہال سنگھ بہت بڑی فوج کے ہمراہ دریائے سندھ کے کنارے پر موجود تھے۔ مہاراجہ کی فوجی قوت کا یہ مظاہرہ حکومت ہند کیلئے ناخوشگوار تھا لہٰذا کپٹن ویڈ ذاتی طور پر لاہور آیا اور حکومت کی ناپسندیدگی سے مطلع کیا۔ رنجیت سنگھ نے قلعہ کن کو تباہ کرکے خالی کردیا البتہ دیگر علاقوں پر کچھ عرصہ تک قبضہ برقرار رکھا" میر بہرام خان نے سکھوں سے نپٹنے کیلئے امیران سندھ سے خصوصی معاہدہ کرکے امداد طلب کی۔ چونکہ سندھ کے حکمران بھی دربار لاہور کے عزائم سے بے خبر نہ تھے لہٰذا وہ فوراً میر بہرام خان کی امداد پر تل گئے۔ قریب تھا کہ سندھ اور پنجاب کے حکمران میدان جنگ میں اپنی طاقت کا فیصلہ کرتے کہ انگریزوں نے بیچ بچاؤ کرا دیا۔ رنجیت سنگھ نے مزاری علاقہ خالی کردیا۔ کچھ عرصہ بعد میر بہرام خان نے سکھوں کے ساتھ صلح کرلی۔ وہ ملتان گیا جہاں اسے خلعت دی گئی۔ یہ صلح رحیم خان لغاری کے ذریعہ ہوئی تھی۔

میر بہرام خان کے دور میں موہن لعل کو گورنر ہند کی طرف سے ایک خصوصی مشن پر پنجاب بھیجا گیا تھا۔ وہ پہلے بہاولپور آیا جہاں اسے پولیٹیکل ایجنٹ لدھیانہ کپٹن سی۔ ڈبلیو۔ ویڈ کا خط مورخہ ۹ دسمبر ۱۸۳۵ء کو ملا۔ اس خط کی ہدایات کے مطابق اسے ڈیرہ غازیخان جاکر تجارتی، سیاسی حالات اور شاہراہوں کے متعلق معلومات حاصل کرنا تھیں۔ بہاولپور سے وہ ملتان گیا جہاں سے وہ

(1) History of The Punjab P.472 Syed Mohammad Latif

دیوان ساون مل گورنر ملتان سے اجازت حاصل کر کے ڈیرہ غازیخان کو روانہ ہوا۔ یہاں موزوں ہو گا کہ ان حالات کو موہن لعل کے الفاظ میں بیان کیا جائے۔

"اس خط کی ہدایت نمبر ۵ ضلع ڈیرہ غازیخان کے متعلق تھی جس میں لکھا تھا کہ جب ملتان جانے کا مقصد پورا کر لیں تو ڈیرہ غازیخان کے لئے روانہ ہو جائیں جہاں دس دن قیام کرنے کے بعد داجل، ہڑند، آسنی اور راجن پور کے راستے مٹھن کوٹ پہنچیں .... مٹھن کوٹ میں پانچ دن قیام کر کے اپنی دوسری رپورٹ روانہ کریں .... دیوان ساون مل نے اُسے بتایا کہ وہ بہرام خان مزاری کے پاس ضرور جائے اور وہ اُس سے فیاضانہ طریقہ سے پیش آئیگا کیونکہ بلوچ اپنے وعدہ سے آخر دم تک نہیں پھرتا"۔ موہن لعل ۵ مارچ ۱۸۳۵ء کو روجھان آیا۔ اگرچہ اُسے بلوچوں کے متعلق سکھوں نے کئی طرح سے متعصب کرنے کی کوشش کی تھی مگر جب اُسے بلوچوں کو قریب سے دیکھنے اور ملنے کا اتفاق ہوا تو سکھوں کے جھوٹ کا پول کھل گیا۔ وہ اپنے سفر نامہ میں لکھتا ہے کہ "روجھان آسنی سے بڑا شہر ہے۔ ایک کمزور اور پتلی سی دیوار شہر پناہ ہے۔ بازار کوٹ مٹھن سے زیادہ کشادہ ہیں۔ بازار میں ہندوؤں کی ایک سو دکانیں ہیں جو حکمران کی حفاظت میں کاروبار کرتے ہیں۔ روجھان میں کاروبار خوب ہوتا ہے۔ پچھلے سال کا محصول جو دریائے سندھ کے راستے آنے والے مال پر لیا گیا تھا مبلغ دو ہزار سات سو روپے (-/۲۷۰۰) تھا حالانکہ محصول کی شرح نہایت کم ہے۔ یہ ٹیکس کھانڈ پر پانچ پیسے فی من اور دیگر اشیاء پر سات پیسے فی من ہے"۔ (ملحقہ علاقہ میں جہاں سکھوں کی حکومت تھی، وہاں محصول کی شرح ریشم پر دس روپے دس آنے فی من، پھلوں پر تین روپے تین آنے فی اونٹ بمعہ دس آنے فی اونٹ سرچارج اور دیگر اشیاء پر ایک روپیہ فی من محصول لیا جاتا تھا)۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مزاری قبیلہ کا نظامِ ریاست ایک فلاحی حکومت کی طرز پر تھا۔ موہن لعل آگے تحریر کرتا ہے کہ "یہاں گندم، جوار، باجرہ، سرسوں، مونگ، ماش، چنے، جو، چاول، بھنگ اور پوست کافی مقدار میں پیدا ہوتے ہیں جن کا ایک چوتھائی حصہ پیداوار سردار لیتا ہے۔ موجودہ سردار میر بہرام خان بلوچوں میں اپنی فراست اور عقلمندی کی بنا پر مشہور ہے۔ وہ دُبلا پتلا اور میانہ قد کا آدمی ہے۔ ظاہری شکل و صورت سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ جیسا وہ مکار اور دغاباز مشہور تھا (سکھوں نے اپنے دلیر حریف کو بدنام کرنے کی کوشش میں اُسکو ایسا بتایا تھا جو ہمیشہ سے استعماری طاقتوں کا طریقہ رہا ہے) ویسا نظر نہیں آتا۔ اُس کے تین بیٹے اور چار لڑکیاں ہیں۔ وہ عوام کی طرح

---

(1) Travels in Punjab — Mohan Lal

رہتا ہے حالانکہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ اُس کے پاس بڑا خزانہ ہے ۔ سر ہنری پوٹنگر کے اندازہ کے مطابق مزاری اڑھائی ہزار جنگجو میدانِ کارزار میں لا سکتے ہیں مگر مجھے سردار قبیلہ نے بتایا کہ ہتھیار بند مردمان کی تعداد بارہ ہزار ہے جن میں سے چار ہزار دلیر فوری ضرورت پر وطن کی حفاظت کیلئے حاضر ہو سکتے ہیں ۔ اگرچہ مزاری لٹیرے مشہور تھے مگر میں نے دیکھا کہ وہ نہایت اچھے مہمان نواز اور ملنسار واقع ہوئے ہیں ۔ بلوچوں کا لباس عورتوں کے لئے شلوار اور گوتن ہے جو کشمیری طرز پر سینے کے اوپر کڑھا ہوا ہے ۔ وہ سر پر دوپٹہ اوڑھتی ہیں ۔ مردوں کا لباس ایک بڑی پگڑی اور کھلے سینہ کا کوٹ نما کرتا ہے جس کے سامنے گردن سے نیچے بٹن لگے ہوئے ہوتے ہیں ۔ پگڑی ڈھیلی ڈھالی اس طرح سے باندھی جاتی ہے کہ کان اور ماتھا چھپ جاتے ہیں جس کی وجہ سے اُن کا چہرہ بارعب اور خوفناک نظر آتا ہے ۔ اُنکے کپڑے صاف نہیں اور سر کے بال لمبے رکھتے ہیں ۔ زیادہ عمر ہونے پر جب بال سفید ہونا شروع ہو جاتے ہیں تو نیل سے رنگ لیتے ہیں ۔ مزاریوں میں کوئی شخص بھی دوسری شادی نہیں کرتا حالانکہ شادی پر صرف چھ روپے خرچ آتا ہے ۔ ہر خاندان کے پاس کافی مال مویشی ہیں ۔ یہ خاندان چھوٹے چھوٹے خیمہ نما مکانوں میں رہتے ہیں جن کی دیواریں سرکنڈے کی اور چھت کپڑے کی ہوتی ہے ۔ بلوچ تلوار کے استعمال میں غیر معمولی مہارت رکھتے ہیں اور اسے ہر وقت اپنے ہمراہ رکھتے ہیں ۔ جب وہ کنواں پر پانی لینے جاتے ہیں تو اُس وقت بھی تلوار کو جدا نہیں کرتے ۔ جب بلوچوں میں جنگ شروع ہو جاتی ہے تو ہر قریہ اور گھر سے عورتیں برتن لیکر میدان جنگ کی طرف دوڑ کر جاتی ہیں جہاں وہ اپنے اور بیگانوں کو یکساں طور پر پانی پلاتی ہیں ۔ اُن کے پاس جب کوئی مہمان آتا ہے تو اُسے مہمان خانہ میں جگہ دی جاتی ہے جو ہر جگہ موجود ہیں ۔ مہمان کے آنے کی اطلاع سردار قبیلہ کو دی جاتی ہے جو خیر و عافیت پوچھ کر بلوچی رسم کے مطابق حال احوال دریافت کرتا ہے ۔ اِن لوگوں کی خوراک سادہ موٹی روٹی ہے جس کو گھی میں گڑ یا شکر ملا کر کھاتے ہیں ،،

۱۸۳۷ء میں میر بہرام خان نے وفات پائی اور اُس کا بڑا بیٹا میر دوست علی خان سردار بنا مگر اس نے کاروبار قبیلہ کی طرف چنداں توجہ نہ دی اور علاقے کا نظم و نسق اُس کا چھوٹا بھائی میر امام بخش خان سنبھالے رہا ۔ امام بخش خان فوج میں دیسی کمیشنڈ افسر رہا تھا ۔ سکھوں اور امیران سندھ کی حکومتوں کے خاتمہ پر مزاری بھی انگریزیہ کے زیرِ اثر آ گئے ۔ ۱۸۷۶ء میں جب سنڈیمن خان قلات کے پاس انگریزی مشن لیکر گیا تو امام بخش خان بھی ہمراہ تھا ۔ خان قلات نے تخلیہ میں جمال خان لغاری

(1) Travels in Punjab Mohan Lal

اور امام بخش خان مزاری سے بلوچی سلطنت کو بچانے میں تعاون کی استدعا کی مگر ان دونوں نے قومی مفاد کو پس پشت ڈال کر انگریزوں کے مفاد کو مقدم رکھا اور تمام حالات سنڈیمن سے بیان کر دیے۔ امام بخش خان نے ۱۹۰۳ء میں وفات پائی۔ پھر میر بہرام خان سردار بنا جس کے بعد اس قبیلہ نے کوئی خاص تاریخی کارنامہ سرانجام نہیں دیا۔ میر بہرام خان کے بعد میر بلخ شیر خان سردار بنا۔

مری

مری قبیلہ ضلع ڈیرہ غازیخان کے جنوب مغرب میں ایک وسیع علاقہ پر آباد ہے۔ یہ قبیلہ رند خاندان کی شاخ پٹر سے تعلق رکھتا ہے جو میر بجار خان کی نسبت سے بجارانی کہلاتا تھا مگر اب عموماً مری مشہور ہے مری کے لفظی معنی مرنا یا مصیبت ہے۔ کہتے ہیں کہ میر بجار خان پٹر میر چاکر خان رند کا قریبی رشتہ دار تھا۔ جب میر چاکر خان بلوچوں کو لے کر پنجاب کی طرف بڑھا تو میر بجار خان نے کوہ سلیمان میں آکر آگے بڑھنے سے انکار کر دیا۔ میر چاکر خان نے اُسے آگے بڑھنے کے فوائد بتائے مگر وہ اپنے ارادے میں اٹل رہا۔ آخر میر چاکر خان نے زچ ہو کر کہا کہ تُو تو مری ہے (یعنی مصیبت) یہ واقعہ اس پروگرام کے بعد کا ہے جس کو رزمیہ اشعار میں یوں بیان کیا گیا :-

"رند اور لاشاریوں نے آپس میں معاہدہ کیا اور کہا ـــــ آؤ ہم اس خشک اور بے گیاہ صحرا کی سکونت ترک کردیں اور رواں دواں چشموں اور میٹھے پانی کی تلاش میں نکل کھڑے ہوں۔ پھر باہمی طور پر اسے تقسیم کریں۔ پھر وہ اپنے گھروں کو آئے اور سرداروں نے اپنے غلاموں کو آواز دی ـــــ "سبک اندام سرنگ (سرخ رنگ) کمیت گھوڑیوں کو اصطبل سے کھول لاؤ۔ بچھیریوں پر زینیں کس دو اور وہ بیش قیمت گھوڑے بھی لاؤ جن میں سے ایک ایک کی قیمت نو نو ہزار ہے۔ پہاڑی دروں سے اونٹوں کو ہانک لاؤ۔"

رزم آراؤں نے اپنی بیویوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ـــــ "اپنے قلعوں سے نیچے اُتر آؤ، اپنے بستر اور کپڑے، دریاں اور سُرخ قالین، تکیئے، دھاری دار کمبل، سانچے میں ڈھلے ہوئے پیالے اور عکران کے بنے ہوئے آبخورے اپنے ہمراہ لے کر آجاؤ کیونکہ چاکر اب یہاں نہیں رہیگا۔ وہ کسی دور دیس کو روانہ ہونے والا ہے۔

چنانچہ اپنے لمبے لمبے لبادے اور سُرخ رنگ کے بڑے بڑے جوتے پہنے ہوئے، سروں پر خود لگائے، جسم پر اسلحہ باندھے، تیر اور کمانیں سنبھالے، چاندی کے چاقو اور خنجر لئے ہوئے

فیاض میر کی آواز پر چالیس ہزار افراد لبیک کہتے ہوئے گھوڑوں پر سوار آگے بڑھے ۔"

اس قبیلے کی بڑی بڑی شاخیں گزنی، لوہارانی، بجارانی اور مزارانی ہیں[1] ۔ کوہ سلیمان میں پہنچ کر بجار خان جو رندوں کے ایک گروہ کا سردار تھا، میر چاکر خان سے بعض اختلافات کی بدولت اس جگہ پر علیحدہ ہو گیا جسے اب بجار وڈھ کہا جاتا ہے ۔

میر خدا بخش خان مری نے اپنی کتاب میں دبے دبے لفظوں میں اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مری دراصل ماری کے رہنے والے تھے ۔ ماری عہد قدیم (۲۵۰۰ ق م) میں عراق کی شمالی سرحد کے قریب مملکت شام میں ایک حکومت کا پایہ تخت تھا ۔ اس خیال کا کوئی تاریخی جواز نہیں سوائے ناموں کی مماثلت ۔ ملتے جلتے نام ہزاروں کی تعداد میں گنائے جا سکتے ہیں جن کا حقیقت میں کوئی باہم تعلق نہیں ہوتا ۔ صوبہ بہار (ھند) میں رہتاس نامی قلعہ بڑا مشہور تھا اور اس کا تاریخ میں بہت ذکر آیا ہے ۔ اسی نام کا ایک قلعہ شیر شاہ سوری نے دینہ ضلع جہلم کے قریب تعمیر کرایا جو اب بھی صحیح و سالم حالت میں موجود ہے ۔ قارون نامی دریا ایران اور مصر میں موجود ہیں ۔ لیہ ضلع کے دندر مقام کی صورت میں دو آبہ سندھ ساگر میں موجود ہے جبکہ اسی نام کا ایک شہر طائف کے جنوب میں سعودی عرب میں موجود ہے ۔ مکران بلوچستان کا ایک مشہور خطہ ہے مگر اسی نام کا علاقہ مغربی الجزائر میں بھی موجود ہے ۔

دراصل مری کا ماری (شام) سے کوئی تعلق نہیں ۔ یہ صرف حسن اتفاق ہے کہ اس نام سے ملتا جلتا ایک شہر عہد قدیم میں موجود تھا ۔ مری ایک عرف عام ہے جس سے گیشر رند کی ایک شاخ مشہور ہو گئی ۔ بلوچوں کے کئی قبائل اپنے عرف سے مشہور ہیں مثلاً لغاری، لنڈ، بزدار، دریشک وغیرہ ۔ اسی طرح سے شام کا مشہور خاندان الطرش (دہرے) اپنے عرف سے مشہور ہے ۔ ملتان کا خاکوانی خاندان ایک معزز افغان خاندان ہے مگر خوک (خنزیر) کے نامور شکاری کی اولاد ہونے کے ناطے خاکوانی مشہور ہوا ۔ مری قبیلہ کے جد امجد کو ڈیرہ غازیخان کے دودائی خاندان سے جنگیں لڑنا پڑیں ۔ ان رزمیہ نظموں میں میر بجار خان اپنے کو گیشر رندوں کا بادشاہ کہتا ہے ۔ اس نے کبھی اپنے کو مری نہیں کہا ۔ مری کا عرف بہت بعد میں مشہور ہوا ۔

بجار خان کی وفات پر سالار خان، درویش خان اور جلال خان یکے بعد دیگرے سردار ہوئے ۔ جلال خان نے اپنے آخری وقت میں اپنے بھتیجے سہتک خان کو اپنا جانشین مقرر کیا کیونکہ اس کا بیٹا

---

(۱) بلوچ قبائل ایل ۔ ڈیمز ترجمہ سید کامل القادری ص۵۶ اشاعت ۱۹۶۱ء

نابالغ تھا۔ سہنک کے بعد بہاول خان (بہاولان) سب سے نامور سردار گذرا ہے جس نے حسنی قبیلے کو نکال کر کاہان پر قبضہ جمایا۔

انگریزی فوجیں جب ۱۸۳۹ء میں افغانستان سے واپس آرہی تھیں تو انہوں نے مری علاقے سے بزور طاقت گذرنے کا ارادہ کیا اور علاقے میں گھس آئیں۔ مری قبیلے کے چھاپہ مار دستوں نے انگریزوں کو سخت پریشان کیا۔ حکومت ہند نے مری قبیلہ کو سزا دینے کے لئے اپریل ۱۸۴۰ء میں فوج بھیجی۔ اس فوج کے بہت بڑے حصے کو مری بہادروں نے سرطاف کے درہ کے قریب تہ تیغ کر دیا۔ کلارک کو جب رسد کی حفاظت پر مامور کیا گیا تو اس نے بلوچوں کے سامنے ڈینگ ماری کہ وہ کاہان جا رہا ہے۔ اگر دوداخان مری (سردار) مجھ پہ حملہ کرنا چاہتا ہو تو ضرور کرے۔ یہ چیلنج مری کے لئے بہت بڑی بات تھی لہٰذا میر دوداخان نے اس چیلنج کو قبول کر لیا۔ کلارک کے پاس ایک سو ساٹھ کی نفری تھی جن میں سے معمولی تعداد زندہ واپس آئی۔ انگریزی فوج بمعہ براؤن کاہان کے قلعہ میں محصور ہو گئی۔ براؤن کو بچانے کیلئے دوسری فوج روانہ کی گئی جسے جانباز مریوں نے شکست فاش دی جس میں چار اعلیٰ انگریز افسر اور ایک سو اسی سپاہی مارے گئے۔ آخر کار براؤن نے ذلیل اور رسوا ہو کر دوداخان مری سے جان کی امان مانگی۔ دوداخان مری جس طرح مرد میدان اور دلیر تھا اسی قدر بلند اخلاق بھی تھا۔ اس فتح اور کامرانی کے وقت بھی وہ بلوچی "معیار" پر پورا اُترا اور اعلیٰ اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُسے بمعہ لشکر فلیجی کی طرف نکل جانے کی اجازت دے دی۔

انگریز پولیٹیکل ایجنٹ مسٹر الیسٹ، وک جو اُن ایام میں سندھ ایریا میں تعینات تھا، مری جنگوں کے حالات میں تحریر کرتے ہیں کہ کاہان کے محصور لشکر کو چھڑانے کیلئے میجر کلبرن (کلن برن) کو روانہ کیا گیا۔ مری بہادروں کے حملوں کا حال مسٹر الیسٹ، وک کے الفاظ میں سنئیے "سپاہی (انگریز) جلد جلد کام آنے لگے اور جو افسر اُن کو لئے جاتا تھا، بری طرح سے زخمی ہوا مگر پھر بھی آگے بڑھتا گیا۔ وہ اور ایک سپاہی یعنی دو آدمی پہاڑ کی چوٹی تک پہنچے کیونکہ جس وقت وہ دستہ نصف فاصلے کے جا چکا تو مری قبیلے والے نیچے بڑھے اور جسطرح پہاڑ کا پانی زور شور سے آتا ہے، وہ بھی ہر ایک چیز کو اپنے سامنے صاف کرتے چلے گئے۔ اس دستہ کا ہر افسر بجز ایک کے مارا گیا اور اسی نے دو روز قبل دو بلوچیوں کو ایک مقابلہ میں مارا تھا۔ اب اس کے زخمی ہونے کی باری آگئی تھی۔ وہ زخمی ہو کر گر پڑا مگر اُس کی جان اس کے ہندوستانی اردلی نے بچائی جس نے دوسرا وار جو اُس پر ہونے والا

تھا رکا اور حملہ کرنے والے کو مار ڈالا اور پھر اپنے افسر کو کھڑا ہونے میں مدد دی ....

جو لوگ پہاڑی پر حملہ کرنے گئے تھے ان میں سے بیس آدمی بھی باقی نہ رہے اور فتح مند بلوچی ایک ہاتھ میں پتھر اور دوسرے ہاتھ میں تلوار لئے ہوئے توپ کے مہرے تک آگئے۔ انہوں نے پتھر ہمارے لوگوں کے منہ پر مارے۔ مرلیوں کے ایک مشہور سردار نے واقعی اپنی ڈھال ایک توپ کے منہ پر اس وقت لگا دی جبکہ وہ چلنے والی تھی اور وہ اسی کے ساتھ اڑ گیا۔ دستے والوں کا کہنا تھا کہ حملہ کرنے کا یہ طریقہ اسقدر خوفناک تھا کہ جس کا بیان نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ سپاہیوں کی بندوقیں تھام لیتے تھے اور سنگینوں پر گر پڑتے تھے۔ وہ لوگ مثل پاگلوں یا جنگلی جانوروں کے لڑتے تھے اور ہماری فوج کو خطرہ اسقدر زیادہ تھا کہ میجر کلنبرن نے لکھا تھا کہ آخر میں جو قسمت سے گراپ (چھرے جو انگور کے دانہ کے برابر ہوتے ہیں) کا گولہ مارا گیا تو اس کے باعث سے کل پلٹن برباد ہونے سے بچی ورنہ کسی اور طریقہ سے ممکن نہ تھا"

مسٹر الیسٹ وک نے انگریز ہونے کے باوجود مری بہادروں کی اعلیٰ ظرفی کی تعریف کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "لہڑی پہنچنے پر مجھے وہاں وہ فوج ملی جو اتنے عرصے تک کاہان میں محصور رہ چکی تھی اور جو کچھ ان کے ساتھ مری قبیلہ والوں نے کیا اس کے حالات سن کر مجھے نہایت لطف آیا۔ اس اعلیٰ ظرف قبیلہ نے صرف ہماری فوج کو بے روک ٹوک چلے ہی نہ آنے دیا بلکہ مہربانی کے ساتھ رحم بھی کیا۔ جب سپاہیوں میں ایک شخص تھک کر گر پڑا تو مری رہنما اسے اپنے ٹٹو پر سوار کر کے لے آیا۔ سردار دودا خان نے یہ قابل یادگار پیغام وہاں کے کمانیر کے نام بھیجا کہ صاحب سے کہہ دو کہ جتنے لوگ مرلیوں نے قتل کئے وہ لڑائی میں مارے گئے۔ رہا بھیر و زخمی و قیدیوں کا مارا جانا' اس کے ذمہ دار بگٹی فرقے والے ہیں۔ ہم نے اپنے ہاتھ ایسے لوگوں کے خون سے نہیں رنگے جنہوں نے مقابلہ نہیں کیا۔ بہادر اور جری لوگوں میں مرلیوں کو جو اعلیٰ درجہ کے لوگوں کے برابر رتبہ نہ دے وہ منصف مزاج مورخ نہیں۔ ان کی عورتیں بھی اس جنگ کی ہمت رکھتی ہیں۔ وہ زخمیوں کے لے جانے میں مدد دیتی ہیں اور سخت معرکوں میں جہاں یہ قبیلہ زیادہ گھر گیا ہو انہوں نے لڑائی میں شرکت کر کے اثر پیدا کیا ہے۔

جیسا کہ بلوچیوں میں قاعدہ ہے ہر شخص کے ایک ہی زوجہ ہوتی ہے اور ان کی پاک دامنی ضرب المثل ہے۔ اگلے زمانے میں جب شکارپور میں افغان حاکم تھے، ایک گورنر نے متواتر

(۱) عبرت کدہ سندھ ای بی' الیسٹ وک ترجمہ سید ضامن کنتوری ص ۹-۱۴۸

کوشش ایک مری بلوچ کی بیوی کو پھنسانے کی کی جس نے اُس کے ہاں نوکری کرلی تھی۔ جب دیکھا کہ زر کا طمع دکھانے سے کام نہیں چلتا تو اُس کے خاوند کو کہیں بھیج دیا اور تن تنہا اُس کے مکان پر زبردستی کی کاروائی کرنے کے لئے گیا۔ جب شام ہوئی تو گورنر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اِس کی تلاش شروع ہوئی اور آخر کار اُس کے ملازموں میں سے ایک جو اپنے آقا کے تعشق سے واقف تھا اُس مکان پر گیا اُس نے کنڈی ہلائی مگر صدائے بر نخاست۔ آخرالامر اُس نے دروازہ توڑا تو کیا دیکھتا ہے کہ گورنر کے منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا ہے اور ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں اور اِس قدر مار کھائی ہے کہ بغیر سہارے کے کھڑا نہیں ہوسکتا۔ یہ بات ٹھیک طور پر معلوم نہ ہوئی کہ یہ واقعہ کیونکر ہوا۔ لیکن کسی طور پر یہ سننے میں آیا ہے کہ وہ عورت اپنے عاشق سے تنہا زبردست نکلی اور خوب زدوکوب کرنے کے بعد اُس نے اُسے رشتہ، محبت کے بدلے مری رسی سے باندھ دیا اور اپنے خاوند کے پاس چل دی جو پھر شکارپور لوٹ کر واپس نہ آیا"۔

کچھ عرصہ تک مری اور انگریزوں کے تعلقات اچھے رہے مگر جب انگریزوں نے جھکرانی اور دیگر قبائل کے معاملات میں دخل اندازی شروع کی تو مری پھر بگڑ گئے۔ انہوں نے انگریزی علاقے پر تاخت شروع کردی۔ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی چھڑی تو مریوں نے ضلع ڈیرہ غازی خان کے جنوبی علاقہ یعنی تحصیل راجن پور میں وسیع پیمانے پر حملے کیئے۔ انہوں نے آسنی چھاؤنی پر حملہ کیا جہاں درلیشک قبیلہ نے انگریزوں کی حامی بھرتے ہوئے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی جس میں دریشک تمندار بھی مارا گیا۔

۱۸۵۹ء میں انگریزوں نے مری قبیلہ کو میر خداداد خان والئے قلات کے ذریعے کچلنے کی کوشش کی مگر یہ مہم ناکام رہی اور مری اپنی حفاظت کرنے میں کامیاب رہے۔ انگریزوں کو جب بھی موقع ملتا، وہ مری علاقے پر حملہ کرتے مگر وہ اُنکو قابو کرنے میں ہمیشہ ناکام رہے اور مری نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دشمن (انگریز) مری اور بگٹی قبائل کو "دہشت سرحد" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ۱۸۸۰ء میں مری نے ایک انگریز دستے پر حملہ کیا اور اُس کے تقریباً پچاس سپاہیوں کو قتل کرکے ایک لاکھ پچیس ہزار روپے لوٹ لئے۔ انگریزوں نے اس کا بدلہ لینے کی غرض سے کابل و قندھار کے راستے مری کے خلاف فوج روانہ کی۔ سردار قبیلہ نے بغیر جنگ اطاعت قبول کرلی۔ مری قبیلہ پر دو لاکھ روپے تاوان عائد کیا گیا۔ میر مہراللہ خان

(۱) عبرت کدہ سندھ ای۔ پی۔ الیسٹ وک ترجمہ سید ضامن کنتوری ص 3-162

نے ڈیڑھ لاکھ روپے اسی وقت ادا کر دیئے اور پچاس ہزار کے عوض "قوت مندائی" کا علاقہ انگریزوں کے حوالے کیا۔ مہراللہ خان نے ۱۹۰۲ء میں وفات پائی اور اس کا بیٹا میر خیر بخش خان سردار بنا جس کے وقت مری اور کھیتران قبائل نے متحد ہو کر ۱۹۱۸ء میں انگریزی علاقہ پر حملے کئے۔ انہوں نے کوہلو اور گنبذ کی چوکیوں کو تباہ کر دیا اور انگریزوں کے رسد و رسائل کے سلسلے منقطع کر دیئے۔ کوہلو کی سرکاری عمارتوں کو نذرِ آتش کر دیا گیا اور جسقدر خزانہ موجود تھا اس پر قبضہ کر لیا۔ علاقہ بارکھاں ضلع لورالائی کو بچانے کی خاطر فوج ڈیرہ غازیخان کے راستے روانہ کی گئی۔ یکم مارچ کو کھر کے نزد فورٹ منرو پر قبائلی لشکر نے حملہ کیا۔ انہوں نے ڈاکخانہ، ڈاک بنگلہ اور چوکی بارڈر ملٹری پولیس پر قبضہ کر کے نذرِ آتش کر دیئے۔ چوکی میں سے قبائل کو پاوندہ افغانوں کا جمع شدہ اسلحہ ہاتھ لگا۔ بہت جلد بواٹہ اور رکنی پر بھی انہوں نے قبضہ کر لیا۔ کھر کی فتح کے بعد قبائل کا لشکر فورٹ منرو (اناری مول) کی پہاڑی پر جمع ہو گیا۔ انگریز فوج کے توپ خانہ کا مقابلہ نہ پاکر قبائلی لشکر شکست کھا کر منتشر ہو گیا۔ اس جنگ میں لغاری قبیلہ کے بجارانی اور ہدیانی شاخوں نے قبائلی لشکر کو کافی امداد دی مگر دیگر قبائل پر جمود طاری رہا۔ ہر قبائلی سردار (تمندار) انگریز کی بڑھ چڑھ کر امداد کرنا چاہتا تھا تاکہ خداوندانِ نعمت میں اس کا وقار بڑھ جائے اور خطابات حاصل کر سکیں۔ ماداب کی لڑائی اس جنگ کا نقطۂ اختتام ثابت ہوئی۔ قبائلی لشکر کامیابی سے ناامید ہو کر منتشر ہو گیا۔ جون ۱۹۱۸ء میں ایک خصوصی جرگہ منعقد ہوا جس میں مری تمندار سے تمام مراعات اور خطابات چھین لئے گئے۔ اس کے علاوہ ان کو تین لاکھ سٹرسٹھ ہزار روپے (-/۳۶۷۰۰۰) تاوان بالاقساط ادا کرنا پڑا۔ لڑائی کے دوران جس قدر اسلحہ اور بارود مری قبیلہ سے چھینا گیا تھا وہ بھی ضبط کر لیا گیا۔ مری کے علاقہ کوہلو اور قوت مندائی پر ٹیکس بھی بڑھا دیا گیا اور انہیں انگریز کی تحویل میں لے لیا گیا۔ جن لوگوں نے انگریزوں کے خلاف قوم کا ساتھ دیا تھا، انہیں سزائیں دی گئیں۔ قوت مندائی کا علاقہ ۱۹۲۲ء میں مری قبیلہ کو پھر مل گیا۔ ۱۹۲۵ء میں خیر بخش خان کی وفات پر مہراللہ خان تمندار ہوا جس نے ۱۹۳۳ء میں انتقال کیا اور میر خیر بخش خان ثانی بنا۔

کوشش ایک مری بلوچ کی بیوی کو پھنسانے کی کی جس نے اُس کے ہاں نوکری کر لی تھی۔ جب دیکھا کہ زر کا طمع دکھانے سے کام نہیں چلتا تو اُس کے خاوند کو کہیں بھیج دیا اور تن تنہا اُس کے مکان پر زبردستی کی کاروائی کرنے کے لئے گیا۔ جب شام ہوئی تو گورنر کا کہیں پتہ نہ تھا۔ اِس کی تلاش شروع ہوئی اور آخر کار اُس کے ملازموں میں سے ایک جو اپنے آقا کے تعشق سے واقف تھا اُس مکان پر گیا اُس نے کنڈی ہلائی مگر صدائے برنخاست۔ آخرالامر اُس نے دروازہ توڑا تو کیا دیکھتا ہے کہ گورنر کے منہ میں کپڑا ٹھونسا ہوا ہے اور ہاتھ پیر بندھے ہوئے ہیں اور اِس قدر مار کھائی ہے کہ بغیر سہارے کے کھڑا نہیں ہو سکتا۔ یہ بات ٹھیک طور پر معلوم نہ ہوئی کہ یہ واقعہ کیونکر ہوا۔ لیکن کسی طور پر یہ سُننے میں آیا ہے کہ وہ عورت اپنے عاشق سے تنہا زبردست نکلی اور خوب زدوکوب کرنے کے بعد اُس نے اُسے رشتہ، محبت کے بدلے دمڑی رسی سے باندھ دیا اور اپنے خاوند کے پاس چل دی جو پھر شکارپور لوٹ کر واپس نہ آیا"[1]

کچھ عرصہ تک مری اور انگریزوں کے تعلقات اچھے رہے مگر جب انگریزوں نے جھگرانی اور دیگر قبائل کے معاملات میں دخل اندازی شروع کی تو مری پھر بگڑ گئے۔ انہوں نے انگریزی علاقے پر تاخت شروع کر دی۔ ۱۸۵۷ء میں جنگ آزادی چھڑی تو مریوں نے ضلع ڈیرہ غازی خان کے جنوبی علاقہ یعنی تحصیل راجن پور میں وسیع پیمانے پر حملے کیئے۔ انہوں نے آسنی چھاؤنی پر حملہ کیا جہاں درلیشک قبیلہ نے انگریزوں کی حامی بھرتے ہوئے مقابلہ کیا مگر شکست کھائی جس میں دریشک تمندار بھی مارا گیا۔

۱۸۵۹ء میں انگریزوں نے مری قبیلہ کو میر خداداد خان والئے قلات کے ذریعے کچلنے کی کوشش کی مگر یہ مہم ناکام رہی اور مری اپنی حفاظت کرنے میں کامیاب رہے۔ انگریزوں کو جب بھی موقع ملتا' وہ مری علاقے پر حملہ کرتے مگر وہ اُنکو قابو کرنے میں ہمیشہ ناکام رہے اور مری نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا۔ یہی وجہ ہے کہ دشمن (انگریز) مری اور بگٹی قبائل کو "دہشت برحد" کے نام سے یاد کرتا ہے۔ ۱۸۸۰ء میں مری نے ایک انگریز دستے پر حملہ کیا اور اُس کے تقریباً پچاس سپاہیوں کو قتل کر کے ایک لاکھ پچیس ہزار روپے لوٹ لئے۔ انگریزوں نے اس کا بدلہ لینے کی غرض سے کابل و قندھار کے راستے مری کے خلاف فوج روانہ کی۔ سردار قبیلہ نے بغیر جنگ اطاعت قبول کر لی۔ مری قبیلہ پر دو لاکھ روپے تاوان عائد کیا گیا۔ میر مہراللہ خان

---

(۱) عبرت کدہ سندھ — ای۔ بی۔ ایسٹ وک — ترجمہ سید ضامن کنتوری — ص 3 - 162

نے ڈیڑھ لاکھ روپے اسی وقت ادا کر دئے اور پچاس ہزار کے عوض "قوت مندائی" کا علاقہ انگریزوں کے حوالے کیا۔ مہراللہ خان نے ۱۹۰۲ء میں وفات پائی اور اس کا بیٹا میر خیر بخش خان سردار بنا جس کے وقت مری اور کھیتران قبائل نے متحد ہو کر ۱۹۱۸ء میں انگریزی علاقہ پر حملے کئے۔ انہوں نے کوہلو اور گنبذ کی چوکیوں کو تباہ کر دیا اور انگریزوں کے رسد و رسائل کے سلسلے منقطع کر دئے۔ کوہلو کی سرکاری عمارتوں کو نذر آتش کر دیا گیا اور جسقدر خزانہ موجود تھا اس پر قبضہ کر لیا۔ علاقہ یارکھاں ضلع لورالائی کو بچانے کی خاطر فوج ڈیرہ غازیخان کے راستے روانہ کی گئی۔ یکم مارچ کو کھر نزد فورٹ منرو پر قبائلی لشکر نے حملہ کیا۔ انہوں نے ڈاکخانہ، ڈاک بنگلہ اور چوکی بارڈر ملٹری پولیس پر قبضہ کر کے نذر آتش کر دئے۔ چوکی میں سے قبائل کو بادندہ افغانوں کا جمع شدہ اسلحہ ہاتھ لگا۔ بہت جلد بواٹہ اور رکنی پر بھی انہوں نے قبضہ کر لیا۔ کھر کی فتح کے بعد قبائل کا لشکر فورٹ منرو (اناری مول) کی پہاڑی پر جمع ہو گیا۔ انگریز فوج کے توپ خانہ کا مقابلہ نہ پا کر قبائلی لشکر شکست کھا کر منتشر ہو گیا۔ اس جنگ میں لغاری قبیلہ کے بجارانی اور ہدیانی شاخوں نے قبائلی لشکر کو کافی امداد دی مگر دیگر قبائل پر جمود طاری رہا۔ ہر قبائلی سردار (تمندار) انگریز کی بڑھ چڑھ کر امداد کرنا چاہتا تھا تاکہ خداوندان نعمت میں اس کا وقار بڑھ جائے اور خطابات حاصل کر سکیں۔ ماداب کی لڑائی اس جنگ کا نقطۂ اختتام ثابت ہوئی۔ قبائلی لشکر کامیابی سے ناامید ہو کر منتشر ہو گیا۔ جون ۱۹۱۸ء میں ایک خصوصی جرگہ منعقد ہوا جس میں مری تمندار سے تمام مراعات اور خطابات چھین لئے گئے۔ اس کے علاوہ ان کو تین لاکھ ستر سٹھ ہزار روپے (۳۶۷۰۰۰/-) تاوان بالاقساط ادا کرنا پڑا۔ لڑائی کے دوران جس قدر اسلحہ اور بارود مری قبیلہ سے چھینا گیا تھا وہ بھی ضبط کر لیا گیا۔ مری کے علاقہ کوہلو اور قوت مندائی پر ٹیکس بھی بڑھا دیا گیا اور انہیں انگریز کی تحویل میں لے لیا گیا۔ جن لوگوں نے انگریزوں کے خلاف قوم کا ساتھ دیا تھا، انہیں سزائیں دی گئیں۔ قوت مندائی کا علاقہ ۱۹۲۲ء میں مری قبیلہ کو پھر مل گیا۔ ۱۹۲۵ء میں خیر بخش خان کی وفات پر مہراللہ خان تمندار ہوا جس نے ۱۹۳۳ء میں انتقال کیا اور میر خیر بخش خان سردار بنا۔

بگٹی

بگٹی اور مری قبائل کو انگریزنے "دہشت سرحد" کا نام دیا ہے مگر دلیر دشمنوں نے انہیں "شیر بلوچستان" کے نام سے نوازا ہے۔ بگٹی قبیلہ رند خاندان کی ایک شاخ ہے جس کا مورث اعلیٰ میر گیندر خان تھا جو میر جاکر خان کا چچازاد بھائی تھا۔ یہ قبیلہ اپنے علاقہ بگ واقع ایرانی بلوچستان کی نسبت سے بگٹی مشہور ہوا۔ اس قبیلہ کی بڑی بڑی شاخیں رہیجہ، نوتھانی، مسوری، کھلپر، شنبانی مندرانی اور نہکانی ہیں۔

ابتدائی دور میں بگٹی ایک چھوٹا سا قبیلہ تھا اور اُن کے موجودہ علاقے میں بلیدی آباد تھے جن کو انہوں نے نکال دیا۔ جب سکھوں نے ڈیرہ غازیخان پر قبضہ جمایا تو انہوں نے مسلمانوں کے ساتھ عموماً اور بلوچوں کے ساتھ خصوصاً معاندانہ رویہ اختیار کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے بگٹی علاقے پر بھی حملہ کیا مگر بگٹی بلوچوں کی دلیری اور جوانمردی کے سامنے سکھ نہ ٹھہر سکے اور عظیم نقصان اٹھا کر پسپا ہوئے۔ اس جنگ میں سکھ اس افراتفری میں فرار ہوئے کہ اپنی فوج کے شاہی علم اور طبل تک چھوڑ گئے۔ چونکہ سکھوں نے اُن کے علاقے پر بغیر وجہ حملہ کیا تھا لہٰذا سکھوں کی اس نازیبا حرکت پر بگٹی بلوچوں نے حملوں کا ایسا لامتناہی سلسلہ شروع کر دیا کہ سکھوں کے لئے ضلع ڈیرہ غازیخان میں زندگی اجیرن ہوگئی۔ سکھوں کے سرحدی قلعوں کے دروازے ہر وقت بند رہتے تھے اور قلعہ دار کی اجازت کے بغیر کوئی شخص اندر نہیں جا سکتا تھا۔ موہن لعل جب ۱۸۳۵ء میں ضلع ڈیرہ غازیخان میں آیا تو اُسے عمرکوٹ کے قلعہ کے اندر کسی نے داخل نہ ہونے دیا کیونکہ سکھ قلعدار شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ ان حالات میں اُسے رات شہر سے باہر ایک پوربی کے ہاں گزارنا پڑی۔ علاقہ ہذا میں سفر کے دوران بھی وہ سکھوں کے بھاری جانی نقصان کا ذکر کرتا ہے جو انہیں شجاع بگٹیوں کے مقابلے میں برداشت کرنا پڑے۔ وہ یکم مارچ ۱۸۳۵ء کو اپنی ڈائری میں لکھتا ہے کہ "مٹھن کوٹ کے لوگ بگٹی حملہ کے پیش نظر خوفزدہ تھے جو پندرہ ہزار کی مسلم آبادی کا شہر ہے۔ اس سے پہلے بگٹی عمرکوٹ پر حملہ کر چکے تھے اور وہاں سے سات ہزار گائیں لوٹ کر لے گئے تھے۔ وہاں سکھوں نے اُن کا مقابلہ کیا مگر

شکست کھائی اور اُنکی فوج کے پچاس آدمی مارے گئے جبکہ صرف دو بگٹی کام آئے۔ بگٹی اپنے ہمراہ اونٹوں پر کجاوے لاتے ہیں جن میں اپنے مقتولین اور سامان لاد کر لے جاتے ہیں"[1]

۱۸۳۹ء میں جب انگریز فوجیں افغانستان کی طرف بڑھیں تو بگٹی قبیلہ نے اُن کا ناک میں دم کر دیا اور اُن کی رسد کو سخت نقصان پہنچایا۔ میجر بلیمور کو بگٹی قبیلہ کی سرکوبی پر مامور کیا گیا جس نے خفیہ خفیہ ڈیرہ بگٹی پر چڑھائی کر دی۔ بگٹی قبیلہ کیلئے بلیمور بدنام خونی اور لٹیرے اسپینی فوجی افسر پیزارو سے کچھ کم نہ تھا جس نے ۱۵۳۳ء میں میکسیکو کے ریڈ انڈین سردار اور امراکو بد عہدی اور دغابازی سے گرفتار کر کے قتل کر دیا حالانکہ انہوں نے بطور مہمان اُسکا استقبال کیا تھا۔ بلیمور کے مقابلے میں بگٹی بھیڑوں کا گلہ ثابت نہ ہوئے بلکہ اُس کی بدنیتی بھانپ کر ہتھیار سنبھال لئے۔ بگٹیوں نے اگرچہ جان توڑ کر مقابلہ کیا مگر توپ خانہ کے سامنے بے بس ہو گئے۔ میر ببرک خان کو گرفتار کر کے سندھ لایا گیا اور وہاں اُسے نظر بند کر دیا گیا۔ بلیمور تین ماہ تک بگٹی علاقہ میں تاخت و تاراج کرتا رہا۔ ۱۸۴۵ء میں انگریزوں نے پھر سات ہزار کے لشکر کے ساتھ چڑھائی کی۔ اِس لشکر نے اوچ اور فلیجی کے راستے دو طرفہ محاذ قائم کیا۔ بگٹی تاب مقابلہ نہ پاکر اپنے علاقے کو خالی کر کے علاقہ کھیتران میں پناہ گزیں ہوئے۔ انگریز اگرچہ وقتی طور پر کامیاب ہو گئے مگر بلوچوں نے اس کا بدلہ بہت جلد لے لیا۔ ۱۸۴۶ء میں بگٹی لشکر نے سندھ پر حملہ کر کے میر پور اور شکار پور کو لوٹ لیا اور بے شمار مال و مویشی اپنے ہمراہ لے گئے۔ دراصل اِن ایام میں بگٹی علاقہ قحط کی زد میں تھا۔ بگٹی قبیلہ قحط کے ہاتھوں مجبور ہو گیا اور میدانی علاقہ پر حملہ آور ہوا۔ شکار پور تک کے تمام مویشی تین دنوں کے معرکوں میں جمع کر لئے اور اس طرح سے تقریباً دس ہزار مویشی جمع کر لئے۔ ایک گھڑ سوار پارٹی نے اُن کا پیچھا کیا مگر حملہ کرنے کی جرأت نہ کی۔ دوسری اور تیسری پارٹی نے بھی کچھ نہ کیا۔ اس طرح سے وہ سب سامان پہاڑوں میں لے گئے۔ اِس تمام کاروائی میں ایک جوان کام آیا۔

۱۸۴۷ء میں ولیم میری ویدر کی سرکردگی میں بگٹی قبیلہ کے خلاف پھر کاروائی کی گئی۔ (یاد رہے کہ اب بھی کراچی میں اسی ظالم کے نام سے میری ویدر ٹاور موجود ہے) اِن کاروائیوں کے دوران سات صد بگٹی انگریزی لشکر کے محاصرہ میں آ گئے۔ اگرچہ اُن پر فرار کے راستے بند ہو چکے تھے مگر انہوں نے اپنے دشمن کی اطاعت قبول کرنے سے انکار کر کے لافانی

(1) Travels in Punjab Mohan Lal

بہادری اور دلیری کا ثبوت دیا۔ جس کی تعریف میں دشمن نے لکھا ہے کہ" اُن کا یہ کارنامہ دلیری اور بہادری کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے ۔" مسٹر اعوان لکھتے ہیں ۔ کہ " یکم اکتوبر 1847ء کو بگٹیوں کا حملہ ہوا۔ جن کا میری دیدر نے پیچھا کیا۔ مسلسل جھڑپوں کے بعد جب کہ ان کی تعداد لگاتار گھٹتی جا رہی تھی۔ تو انہیں ہتھیار ڈالنے اور جان بچانے کا موقع دیا گیا۔ مگر انہوں نے نامنظور کیا۔ سات سو میں سے صرف ایک سو بیس باقی بچے جن میں سے بہت سے زخمی تھے۔ انہیں اسلحہ پھینک کر ہتھیار ڈالنے کو کہا گیا۔ اِن میں سے ایک پیادہ بھی بچ کر نہ نکل سکا۔ صرف دو گھڑ سوار بچ نکلے"۔

انگریزوں کی مسلسل فوجی مہمات سے بگٹی بہت کمزور ہو گئے ۔ تو مری نے ان پر حملہ کر کے ان کو کھتران علاقہ میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ کس قدر باعث افسوس ہے کہ ہم اجتماعی خطرہ کے وقت بھی قبائلی عصبیت کی وجہ سے متفق نہ ہو سکے ۔ ہم ایک دوسرے کا دست و بازو بننے کی بجائے تباہی کا باعث بنے۔ چونکہ بگٹی سردار کی بیوی کھتران سردار میر حاجی خان کی بہن تھی۔ اور وہ طاقتور سردار تھا لہذا وہ اپنے بہنوئی کی امداد میں لشکر تیار کر کے مری پر حملہ آور ہوا۔ اور ان کے ستر آدمی قتل کر کے انہیں شکست دی۔ اس جنگ کے بعد بگٹی سردار نے ایک اور لشکر تیار کر کے مری پر حملہ کیا اور ان کے وسیع علاقہ پر قبضہ کر لیا۔ اس جنگ میں مری کو عظیم جانی نقصان برداشت کرنا پڑا۔

میر بیبرک خان سوئم جب بگٹی قبیلہ کا سردار تھا تو اس نے انگریزوں کے ساتھ صلح کی خاطر ایک سید کو وسیلہ بنایا اور ایک انگریز افسر لیفٹیننٹ پوسٹنس سے جان و مال کی امان حاصل کر لی۔ جب اسے امان مل گئی تو وہ اڑتالیس [2] بگٹی سرداروں کا ایک وفد لے کر انگریزوں کے پاس چلا گیا ۔ اس امان نامہ کے باوجود انگریز نے وعدہ خلافی کر کے انہیں گرفتار کر لیا اور انہیں جیل میں بند کر دیا۔ ان کے مال اسباب معہ سواریوں کے نیلام کر دیا گیا۔ اس وفد کے ایک رکن میر بجار خان کی گھوڑی بڑی شاندار نسل اور اعلیٰ تھی۔ اسے بمبئی نسل بڑھانے کے لئے بھیج دیا گیا۔

ان قیدیوں میں ایک جانی نامی تھا جو کہ علاقے کا نامور شخص تھا ۔ مسٹر ایبٹ دک لکھتے ہیں کہ وہ نہایت نڈر اور دلیر شخص تھا۔ "جب اُسے دیگر قیدیوں کے ہمراہ کام پر لگایا جاتا تو اس نے کام کرنے سے

---

(1) Across the Border - Pathan and Baloch By E. E. OLIVER

(2) Baluchistan - Historical & Political Process P-64 Ed-1964 BY A. B. AWAN.

قطعاً انکار کر دیا - میں نے اس سے کہا کہ اگر تم کام نہ کرنے میں اصرار کرو گے تو کوئی امید تمہاری سزا کے کم ہونے کی نہیں - اس نے جواب دیا کہ مجھے پھانسی دے دو یا جس طرح جی چاہے مار ڈالو - مگر میں تمہاری غلامی میں کام کو ہاتھ بھی نہ لگاؤں گا - یہ عجیب ہی قسم کا جواب تھا جس سے میں سخت گھبرایا کیونکہ ایسے شخص پر سختی کرنے سے کیا ہو سکتا ہے جو کسی شے سے بھی ڈرتا ہی نہ ہو"۔

میر ببرک خان کو قید کی حالت میں حکم دیا گیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے اسلام خان کو انگریزوں کے پاس حاضر ہو جانے کا لکھے مگر اس نے بالکل انکار کر دیا - مسٹر ایبسٹ وک میر ببرک خان کے متعلق لکھتا ہے کہ "وہ عجیب قسم کا بوڑھا تھا - مجھے جب موقع ملتا تھا تو اس سے گفتگو کر کے ان کے عجیب و غریب جوابوں سے لطف اٹھاتا تھا - ضعیفی میں وہی شخص تھا جو میرے تجربے میں جوان نظر آتا تھا - واقعی کسی پری نے اسے شربتِ آبِ حیات پلا دیا تھا جس سے وہ چالیس برس سے زیادہ سن کا معلوم نہ ہوتا تھا - اس کے بال نہایت لمبے تھے - اور سیاہ تھے اور اس کی سرمگیں آنکھیں مثل الماس کے درخشاں تھیں - حالانکہ اس کی عمر اس وقت ستر برس سے زائد تھی۔[1]

1847ء میں بگٹی سردار اسلام خان نے انگریز کی اطاعت قبول کر لی اور اسے بمعہ رفقاء لاڑکانہ میں جاگیر دی گئی - اسلام خان کی اطاعت کو بگٹیوں نے بنظر حقارت دیکھا اور اسے قبائلی معاملات میں نظر انداز کر کے اپنے دشمن انگریز پر حملے جاری رکھے۔[2]

1858ء میں مری اور بگٹی قبائل کے درمیان جنگ چھینبڑی ہوئی جس میں ایک سو تیس مری کام آئے - اسی خونریزی سے تنگ آ کر دونوں قبیلوں نے صلح کر لی اور ایک دوسرے سے امن کے ساتھ رہنے لگے۔

بروس غلام مرتضیٰ خان بگٹی کے متعلق لکھتا ہے - کہ "وہ نہایت خوبصورت اور موت سے لاپرواہی کی حد تک دلیر ہے - لڑائیوں میں وہ ہمیشہ اپنے قبیلے کی کمان کرتا تھا اور کئی دفعہ زخمی ہوا - مری، بگٹی اور کھتران نے اسی صلح کا فائدہ اٹھا کر 1867ء میں بگٹی کے نامور جانباز غلام حسین خان مشوری کی سرکردگی میں انگریز کے خلاف جہاد کیا غلام حسین خان آخر کار رہٹر ندی کی لڑائی میں دادِ شجاعت دیتا ہوا کام آیا۔[3]

---

(1) عبرت کدہ سندھ ای بی ایسٹ وک - ترجمہ سید ضامن کنتوری

(2) " " " 114-69 " " " " "

(3) Forward Policy & its Result R. I. Bruce

باب 3

بلوچ قبائلی تہذیب

عرب کے دورِ جاہلیت کی مانند قدیم دور کے بلوچوں میں اگرچہ بہت سی معاشرتی خرابیاں تھیں تو ان میں کچھ اوصاف بھی تھے۔ چونکہ بلوچ خانہ بدوش تھا لہٰذا ان میں مدنی معاشرہ پروان نہ چڑھ سکا۔ تعلیم نہ ہونے کے برابر تھی جس کی وجہ سے ان میں کوئی اعلیٰ پایہ کا انجینئر، فلسفی وغیرہ پیدا نہ ہو سکا۔ ان میں کوئی بھی مورخ پیدا نہ ہوا۔ جو اپنی قوم کے حالات اور کارنامے قلمبند کرتا۔ میرانی خاندان ڈیرہ غازیخان میں، ہوت ڈیرہ اسماعیل خان میں، بروہی قلات میں، لنگاہ ملتان میں، اور منکیرہ میں جسکانی طویل مدت تک حکمرانی کرتے رہے مگر اپنے اسلاف کے کارناموں کی کوئی تاریخ نہ چھوڑی۔ یہ لوگ کھیتی باڑی، صنعت یا دیگر پیشوں اور ذرائع پیداوار کی طرف توجہ دینا عار سمجھتے تھے مگر ان کی زندگی کی معراج ڈاکہ زنی تھی۔ ان کی نظر میں تلوار کی مہارت حاصل کرنا سب سے بڑا فن اور ہنر تھا۔ اس کے علاوہ کسی اور ہنر کی ضرورت نہ تھی۔ دن رات قبائل ایک دوسرے پر چھاپے مار رہے تھے تاکہ ان لوگوں سے وہ سب کچھ چھین لیں جو اُن کے پاس ہے۔ ان کے حملوں کے دوران مردوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جاتا البتہ عورتیں، بچے اور بوڑھے اس وقت بھی محفوظ رہتے تھے۔ عورت کے جسم پر جس قدر زیورات اور قیمتی ملبوسات ہوتے تھے، ان کو ہاتھ تک لگانا باعث شرم تھا۔ اور وہ محفوظ تھے۔ ڈاکہ زنی میں حاصل ہونے والے مال سے سردار کو خمس یعنی پانچواں حصہ بطور حق دیا جاتا تھا۔ اسی سبب سے سردار بھی ان حملوں کو تحسین کی نظر سے دیکھتے تھے اور اس کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اکثر حالات میں سردار قبیلہ یا اس کا نہایت قریبی رشتہ دار چھاپہ مار پارٹی کا قائد ہوتا تھا۔ ان چھڑپوں اور قتل و غارت کے خوف سے رات کے وقت مرد گھروں کو چھوڑ کر جنگل میں شب بسری کرتے تھے تاکہ دشمن کے اچانک حملوں میں محفوظ رہیں۔ یہ کیفیت زیادہ تر قبائل کے سرحدی علاقوں میں نظر آتی تھی۔

قبائلی بلوچ سردار کو کوئی ٹیکس ادا نہ کرتے تھے۔ قبائلی بلوچوں کی بخشی بنتی شہری ریاستوں میں صرف غیر بلوچ رعایا ہی ٹیکس ادا کرتی تھی۔ جس ریاست یا مملکت میں عوام کی اکثریت کوئی ٹیکس ادا نہ کرتی ہو وہاں

تمدن پروان نہیں چڑھ سکتا ۔ تاریخ میں صرف مزاری قبیلے میں اِس کی واحد نظیر ملتی ہے کہ کسی قبائلی سردار نے عوام سے کوئی ٹیکس وصول کیا ہو ۔ اسی سبب سے عوام اُسی سطح پر رہے جو ایک خانہ بدوش معاشرہ انہیں مہیا کر سکتا ہے ۔

خانہ بدوش معاشرے میں عورت کی کوئی وقعت نہ تھی ۔ اُسے بچپن میں باپ ، جوانی میں خاوند اور بوڑھاپے میں بیٹوں کے احکام کے تحت زندگی گذارنا پڑتی تھی ۔ بعض حالات میں اس کا ازدواجی رشتہ اس کی پیدائش سے بہت پہلے (ماں کے نکاح کے وقت لاف بازد کی شرط رکھی جاتی تھی ۔) طے کر لیا جاتا تھا ۔ عورت کو مرد سے کم تر تصور کیا جاتا اور اُسے مردوں کی موجودگی میں چارپائی پر بیٹھنے کی اجازت نہ تھی ۔ عورت کو جائیداد غیر منقولہ میں کوئی حصّہ نہ ملتا تھا ۔

قبائل میں جذبہ انتقام حد سے بڑھا ہوا تھا ۔ معمولی معمولی حادثات طویل خانہ جنگی اور قتال کا سبب بن گئے ۔ مسلمان مسلمان کی گردن کاٹتا اور انہیں فرمان خداوندی کبھی یاد نہ رہا کہ مومن کا قاتل دائمی طور پر جہنمی ہو گا ۔ بلوچی رزمیہ نظموں میں گرگٹ کے مارنے پر طویل مدّت تک دو قبائل میں انتقامی جنگوں کا ذکر ملتا ہے ۔ اسی طرح بالاچ گورگیج کی تمام عمر بلیدیوں سے انتقام لینے میں گذر گئی ۔ میر چاکر خان رند اور میر گوہرام خان لاشار کی تیس سالہ جنگ بھی چند اونٹوں کے ذبح کرنے سے شروع ہوئی جس میں ہزاروں بلوچ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور آخر کار ان کو بلوچستان چھوڑ کر پنجاب اور سندھ کا رخ کرنا پڑا ۔

ان قبائل میں تنگ نظری اور عصبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی ۔ کسی قبیلے کا کوئی وصف ، سہولت یا اچھائی دوسرے قبیلے کی نظروں میں بری طرح کھٹکتا تھا اور اُسے برداشت کرنے کے روادار نہ تھے ۔ ان کی تمام وفاداریاں صرف اور صرف اپنے قبیلے تک محدود تھیں ۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ قبائل کبھی متحد نہ ہو سکے ۔ بلکہ ہمیشہ ایک دوسرے کے درپے آزار رہے ۔ یہ قبائل جس قدر دلیر اور بہادر تھے اگر اسی قدر ان میں اتحاد ہوتا ۔ تو منگولوں اور ہنوں کی مانند عظیم سلطنتیں قائم کرتے مگر اُن میں یہ معجزہ کبھی ظہور پذیر نہ ہوا ۔ ہر قبیلے نے اپنے قبیلے کو ہی خالص بلوچ سمجھا اور دوسرے قبائل کو غلام یا غیر بلوچ ثابت کرنے کی پوری کوشش کی ۔ یہی سبب ہے کہ بلوچی اشعار میں تقریباً تمام بلوچ قبائل سے یہی سلوک کیا گیا ہے ۔ ایک دوسرے کو زک پہنچانے کی خاطر غیروں کی جنگیں لڑتے رہے ۔ جب دیوان مولراج نے ملتان میں اعلان آزادی کیا تو کھوسوں نے وعدہ کیا کہ وہ ڈیرہ غازیخان شہر فتح کر کے انہیں دیں گے جس کا دفاع لغاری کر رہے تھے ۔ نتیجہ کے طور پر لغاری اور کھوسے ایک دوسرے کی گردنیں انگریزوں اور سکھوں کی خاطر مارتے رہے اور شہر ڈیرہ غازیخان فتح کر کے انگریزوں کے حوالے کیا ۔ بزداروں کو زک پہنچانے کے لئے لُنڈ سکھوں کے ساتھ ملکر ان پر حملہ آور ہوئے ۔ کوڑا خان قیصرانی

کی گرفتاری اور غلام حسین خان مشوری کی تباہی کے لئے تمام قبائل انگریز کے حامی اور مددگار بن گئے ۔

جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے اِن لوگوں میں کچھ اعلیٰ اوصاف بھی تھے ۔جن کا ذکر نہ کرنا بے انصافی ہوگا ۔مگر یہ اوصاف اُس بلوچ میں پائے جاتے تھے جو آج سے تقریباً ڈیڑھ سو سال قبل اس سرزمین پر زندہ تھا ۔موجودہ دور کے بلوچ میں ان اوصاف کو تلاش کرنا بیکار ہے ۔کیونکہ اُس کے عادات و اطوار بری طرح سے مسخ ہو چکے ہیں ۔اس کا سبب غیر بلوچوں کی مہذب لوٹ مار اور استحصال ہے ۔تمنداروں کے جبر و تشدد نے کثیر تعداد بلوچوں کی عادات وغیرہ کو تبدیل کر دیا ہے ۔مگر جن لوگوں پر موجودہ ماحول کا اثر نہیں تو وہ بجا طور پر انسانیت کے لئے باعث افتخار رہے ہیں ۔تمنداروں نے اپنی قوم کے اخلاق کو تباہ و برباد کر دیا ۔

سورۃ النساء آیت 58 (کہ امانیں اہل امانت کے سپرد کرو) کی تفسیر کرتے ہوئے مولانا ابو الاعلیٰ مودودی فرماتے ہیں ۔" تم اُن برائیوں سے بچے رہنا جن میں بنی اسرائیل مبتلا ہو گئے "۔ بنی اسرائیل کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انہوں نے اپنے انحطاط کے زمانے میں امانتیں یعنی ذمہ داری کے منصب اور مذہبی پیشوائی اور قومی سرداری کے مرتبے ایسے لوگوں کو دینے شروع کئے جو نا اہل کم ظرف ، بد اخلاق ، بد دیانت اور بدکار تھے ۔نتیجہ یہ ہوا کہ برے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی ۔مسلمانوں کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا بلکہ امانتیں اُن لوگوں کے سپرد کرنا جو ان کے اہل ہوں یعنی جن میں بار امانت اٹھانے کی صلاحیت ہو ۔

بنی اسرائیل کی دوسری کمزوری یہ تھی ۔کہ وہ انصاف کی روح سے خالی ہو گئے تھے ۔وہ شخصی اور قومی اغراض کے لئے بے تکلف ایمان نگل جاتے تھے ۔اور صریح ہٹ دھرمی برت جاتے تھے ۔انصاف کے گلے پر چھری پھیرنے میں انہیں ذرہ تامل نہ تھا "۔

چونکہ انگریزوں نے نا اہل اور خود ساختہ سرداروں کو بلوچوں پر مسلط کر دیا تھا لہذا انہوں نے بنی اسرائیل کے نا اہل سرداروں کی طرح اپنی قوم کو انحطاط کی گہری غار میں دھکیل دیا جہاں سے انہیں نکلنے میں مدت دراز لگے گی ۔یہی وجہ ہے کہ موجودہ دور کے بلوچوں اور قدیم بلوچوں میں بڑا فرق نظر آئے گا ۔جو تمندار انگریز کی منشا کے مطابق اپنی قوم کو اخلاقی ، مالی اور روحانی طور پر تباہ اور ذلیل کرتا رہا ، وہ جاگیروں اور اعزازات سے لاد دیا گیا کیونکہ یہی ان کا پروگرام تھا ۔مگر جس میں بھی قوم کے لئے درد اور احساس کے جراثیم دیکھے ۔مثلاً میر یوسف علی خان مگسی ، تو اُن کو قید و بند کی سزا کے علاوہ سرداری سے بھی برطرف کر دیا ۔اس طرح انگریز اپنے منشا میں کامیاب ہو گئے ۔

مہمان نوازی

بلوچ قبائل میں مہمان نوازی ایک قومی فریضہ ہے۔ وہ اپنے مہمان کو سر آنکھوں پر بٹھاتا ہے مسٹر ایچ ٹی سورلے لکھتے ہیں کہ "بلوچ مہمان نواز اور حقیقت شناس قوم ہے جن کی دلیری اور سخاوت کے اعلیٰ نظریات اپنی روایات کے مطابق بہت زیادہ پائے جاتے ہیں" اگر اس کے پاس اس کا دشمن بھی مہمان ہو کر جائے تو وہ اس سے دغا نہیں کرے گا۔ سر ڈینزل آئبٹسن[1] بلوچ اور پٹھان کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ دونوں اقوام میں مہمان نوازی ایک مقدس فریضہ ہے۔" اور تاریخ جانتی ہے کہ جب بھی موقعہ آیا بلوچ اس فریضہ کی ادائیگی میں ہمیشہ پورا اترا۔ جب ہمایوں شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر سندھ کی ٹھوکریں کھانے کے بعد وارد بلوچستان ہوا تو کامران مرزا نے چاغی کے بلوچ سردار خطی خان کو ہمایوں کی گرفتاری پر مامور کیا۔ خطی خان ہمایوں کو گرفتار کرنے کے لئے سارا دن دروں کی ناکہ بندی کرتا رہا۔ اس اثنا میں ہمایوں بمعہ رفقاء بھوک اور پیاس سے نڈھال خطی خان کے گھر وارد ہوا۔ خطی خان کی بیوی نے مہمان سمجھ کر خاطر تواضع کی۔ اس وقت ہمایوں کے ہمراہ بائیس افراد تھے جن میں سے دو عورتیں تھیں۔ ان دو میں ایک ملکہ حمیدہ بانو بیگم اور دوسری حسن علی اسحاق آغا کی بلوچ[2] بیوی تھی۔ بلوچ عورت کے ذریعہ گفتگو ہوتی رہی۔

جب خطی خان شام کو گھر آیا تو اسے ہمایوں کی آمد کا علم ہوا۔ ہمایوں سے ملاقات ہوئی تو خطی خان عجیب مذبذب میں تھا۔ ہمایوں نے اس کی پریشانی کی وجہ دریافت کی تو اس نے کامران مرزا کا خط ہمایوں کے ہاتھ میں دے دیا۔ جسے پڑھ کر ہمایوں نے اپنے کو گرفتاری کے لئے پیش کر دیا کیونکہ وہ در در کی ٹھوکریں کھا کر ایسی زندگی سے اکتا چکا تھا۔ تاہم خطی خان کے سامنے اگر ایک طرف دنیاوی لالچ تھا تو دوسری طرف بلوچی روایات مہمان نوازی تھیں جن کو توڑنا اس کی قوم کی توہین تھی۔

آخر کار ضمیر کی آواز نے دنیاوی لالچ پر فتح پائی اور وہ یوں گویا ہوا۔

"اگرچہ کامران مرزا نے مجھے آپ کی گرفتاری پر مامور کیا ہے اور میں آپ کو بمعہ رفقاء گرفتار کر

1- PUNJAB castes By
Sir Denzil Ibbetson

2- Humayun in Persia P. 3
Sukumar Ray

سکتا ہوں۔ لیکن یہ بہادر بلوچوں کا شیوہ نہیں مجھے آپ کو اس وقت گرفتار کرنا چاہیے تھا جب آپ نے میرے گھر میں پناہ نہ لی تھی۔ اب آپ میرے مہمان ہیں اور مہمان پہ ہاتھ اٹھانا بلوچوں کی بہادری اور کردار کے خلاف ہے۔ لہٰذا میں آپ کو گرفتار کرنے کی بجائے آخیر دم تک تمہاری حفاظت کروں گا اور اپنے آدمیوں کے ہمراہ آپ جس طرف جانا چاہیں گے اپنی سرحد سے بخیریت گذار دوں گا۔" اس نے اپنے قول کو عملی طور پہ پورا کیا۔ اس واقعہ کا مسٹر ولز۔ لے ہیگ نے کیمبرج ہسٹری آف انڈیا میں بھی ذکر کیا ہے۔[1]

مہمانوں کی خاطر تواضع کی خاطر ایک دستور بن گیا تھا کہ مری، بگٹی، اور دیگر بلوچ قبائل کبھی بھی دودھ اور گھی فروخت نہیں کرتے بلکہ مہمان کے لیے مخصوص رکھتے ہیں۔ اس گئے گذرے دور میں بھی بلوچ علاقوں میں رات گئے ایک ستارے کے غروب ہونے تک مسافر مہمان کا انتظار کیا جاتا ہے اور گھروں میں آگ روشن رکھی جاتی ہے۔ بلوچ اس ستارے کو "مہمان ستارہ" کہتے ہیں۔

بلوچوں میں مہمان نوازی انفرادی فعل نہیں بلکہ اس سلسلہ میں کئی مثالیں پیش کی جاسکتی ہیں جن میں بلوچ حکمرانوں نے مہمان کی حفاظت میں دوسرے ملک سے جنگ کا خطرہ مول لینے سے بھی گریز نہ کیا۔ جب شجاع امیر دوست محمد خان سے شکست (۱۸۳۴ء) کھا کر بھاگا تو امیر کابل نے رحمدل خان گورنر قندھار کو اس کے تعاقب میں روانہ کیا۔ شجاع بے یار و مددگار گرتا پڑتا قلات کی بلوچ سلطنت میں داخل ہو گیا۔ میر مہراب خان بلوچ نے مہمان کو خوش آمدید کہا اور اس کا تعاقب کرنے والوں کو فیصلہ کن انداز میں کہلا بھیجا کہ اب شاہ شجاع بلوچوں کا مہمان ہے اور مہمان کی حفاظت کرنا بلوچی شیوہ ہے۔ لہٰذا اسے شجاع کے تعاقب میں بلوچی حدود سلطنت سے باہر رہنا چاہیئے۔ ورنہ بلوچ اپنے مہمان کی حفاظت میں سر دھڑ کی بازی لگا دیں گے۔ رحمدل خان بھی جانتا تھا کہ خانِ بلوچ (میر مہراب خان) کے قول و فعل میں فرق نہیں ہوتا لہٰذا وہ واپس چلا گیا۔

مشہور انگریز سیاح پوٹنگر نے اپنے سفرنامہ میں لکھا ہے کہ "جب ہم سردار ایدل خان رخشانی بلوچ کے مہمان خانہ میں پہنچے جو بلوچی گدان (خیمہ) تھا تو ہم نے اپنے کو ہر طرح سے محفوظ پایا۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ ۔۔۔ دوسرے دن جب میرا ایک ہندوستانی ساتھی اپنے لیے روٹی پکانے کو آٹا گوندھ رہا تھا تو ایک بلوچ نے اسے دیکھ کر کہا کہ یہ کیا کر رہے ہو! کیا تم ہمارے سردار کو بدنام کرنا چاہتے ہو؟ مانا کہ ہم ریگستان میں رہتے ہیں اور غریب ہیں لیکن ہم نے اسی حالت میں بلوچستان کے بادشاہ میر نصیر خان کو اس کے تمام لشکر کے ساتھ پانچ دن

۱۔ تذکرۃ الواقعات عرف ہمایوں نامہ صفحہ ۱۱۱ جوہر آفتابچی ترجمہ احمد الدین
۲۔ تاریخ بلوچستان صفحہ ۳۲۷ صالح محمد خان لہڑی۔

تک ایسی مہمانی دی کہ میر نصیر خان نے خوش ہو کر قوم کو " دلکشا " کا خطاب دیا ۔"

راست روی

بلوچ فطرتاً صاف گو اور راست باز ہے ۔ اس کے دشمن بھی معترف ہیں کہ وہ سچ کو سچ اور غلط کو غلط کہنے میں ہمیشہ بے باک ہے ۔ سر ڈینزل ایبٹ سن کے مطابق " بلوچ صاف گو اور ایماندار ہے جب تک کہ اسے موجودہ ماحول نہ بگاڑ دے ۔" رند و لاشار کی تیس سالہ جنگ کے دوران دل ملک نامی رند سردار ایک سخت محاربہ کے بعد رات کے وقت راستہ بھول کر اپنے دشمن میر گوہرام خان لاشار کے ہاں مہمان ہوا کھانا کھانے کے وقت جب وہ دستر خوان پر اکٹھے ہوئے تو انہوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا مگر مہمان پر وار کرنا بلوچی روایات کے خلاف تھا البتہ میر گوہرام خان نے دل ملک خان کو مشورہ دیا کہ وہ اس جنگ میں رند کی بجائے لاشار کا ساتھ دے مگر دل ملک خان نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے جواب دیا "

رندا خدا لاشار نہ کنت

مسلمان ہندو نہ بی

تراغ نہ زبری کافیری

یعنی خدا نہ کرے کہ رند جنگ میں لاشار کا ساتھ دیں ۔ جس طرح سے مسلمان ہندو نہیں بن سکتا اسی طرح سے شریف آدمی اپنے موقف سے بھی ہٹ نہیں سکتا ۔

مسٹر البرٹ دک اپنی کتاب میں بلوچوں کی راست روی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ " ہندوستان کے باشندوں کی نسبت بہت کچھ مخالف و موافق کہا جا چکا ہے ۔ مگر شاید بہ معاملہ عمدہ طور پر یوں کہا جا سکتا ہے کہ جہاں احسان اور پاس و لحاظ کا دخل ہوتا ہے وہاں تو کسی ہندوستانی کی بات کا حد درجہ کا اعتبار کیا جا سکتا ہے مگر دیگر حالتوں میں صداقت کے خلاف امید کی جا سکتی ہے ۔ اس کے برخلاف بلوچی راست باز ہیں کیونکہ وہ اس قدر بہادر اور باہمت ہیں کہ جھوٹ بول ہی نہیں سکتے ۔"[3]

بہادری

بلوچ ایک بہادر قوم ہے اور جب کبھی زمانے نے اس کو آزمایا تو اُسے اس وصف میں پورا پایا ۔ فردوسی

(۱) تاریخ بلوچستان ص ۱۶۱ میر گل نصیر خان نصیر (۲) Punjab castes P. 42 Sir Denzil Ibbetson

(۳) " بلوچستان کے سندھ " اے ایچ البرٹ دک ترجمہ سید صادق کنتوری ص 192

کے مطابق عظفش ۔ دارا اور دیگر ایرانی شہنشاہوں کے وقت ان کی فوج کا بیشتر اور بہترین عنصر بلوچ تھے جن کی امداد سے دارا اول نے ۵۱۲ ق م میں درہ دانیال سے گذر کر یورپ کو باجگزار بنایا۔ بلوچوں کے متعلق فردوسی لکھتا ہے کہ "دشمن نے میدانِ جنگ میں ان کی کبھی پیٹھ نہیں دیکھی تھی اور وہ لڑائی کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے۔"

کیخسرو کی موت پر جب اردشیر پاپکاں تختِ ایران پر بیٹھا تو اس کی طاقت اور وسعت کا اندازہ اس امر سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے پاکستان کے تمام علاقے اور ہندوستان کے کچھ حصے پر بھی قبضہ کر لیا اور مغرب میں یونان اور رومانیہ تک کا وسیع علاقہ اس کا باجگزار تھا مگر وہ بلوچوں کو اپنا دوست بنانے میں ناکام رہا۔ اردشیر اپنی تمام طاقت اور حربے استعمال کرنے کے باوجود بلوچوں کے مقابلے میں ناکام رہا۔

برٹن کے الفاظ میں "بلوچ کا رنگ خوبصورت اور جسم طاقتور ہے۔ وہ کافی سخت جان اور میدانِ جنگ میں کافی دلیر واقع ہوا ہے۔ اس کے نظریات بابت عزت مخصوص طرز کے ہیں اور وہ بزدلی کو نفرت اور حقارت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اسی طرح وہ اپنی قومیت پر (بلوچ ہونے پر) بھی فخر کرنے والا ہے۔" بلوچوں نے اپنی دلیری کا اظہار جنگ میانی میں خوب کیا۔ اگرچہ ان کا دشمن جدید ترین اسلحہ سے لیس تھا مگر بلوچوں نے تلوار، ڈھال سے انگریزوں کا ایسا شاندار مقابلہ کیا کہ ان کی پسپائی پر انگریزوں کو ان کا تعاقب کرنے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایڈورڈ۔ ای۔ آلیور لکھتا ہے کہ "بلوچ دشمن پر ہمیشہ سامنے سے حملہ کرے گا۔ وہ جسمانی طور پر طاقتور سخت جان، دلیر اور قدرتی طور پر جنگجو ہے۔ وہ عادتاً صاف گو، باعتبار اور قابل بھروسہ ہے۔ ان کو نسلی طور پر کئی مورخ اپنے اپنے انداز میں بیان کر چکے ہیں اور یہاں اسے دہرانا چنداں سودمند نہیں۔ مرحوم سر میکگریگر جو اُن کو نہایت اچھی طرح سے جانتا تھا، ان کے متعلق بڑا حسن ظن رکھتا تھا۔ اس کے الفاظ میں بلوچ سخت جان اور جنگجو قوم ہے۔ ان کا طریق جنگ عجیب اور اپنے ہمسایہ پٹھان سے زیادہ مہلک ہے۔۔۔ بلوچوں کی بہادری اور دلیری سخت قسم کی ہے جس کا اظہار انہوں نے ہمارے خلاف اگرچہ ایسا نہ کیا جس طرح سے انہوں نے اپنی قبائلی جنگوں میں کیا ہے مگر پھر بھی اگر تمام حالات کو مدنظر رکھا جائے تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ بلوچ ہمارے ساتھ افغانوں کی نسبت بہتر طریقے سے لڑے ہیں۔۔۔۔۔۔ بحیثیت قوم وہ غریب ہیں مگر وہ باقاعدہ فوج میں بھرتی ہونے پر رضامند نہیں ہوتے کیونکہ وہ نہ وردی پہننا پسند کرتا ہے اور نہ ہی پریڈ پر رضامند ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کسی کے احکامات کو برداشت نہیں کر سکتے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ پیدائشی شہسوار ہیں اور وہ ایک خاص سخت جان گھوڑوں کی نسل پالنے والے ہیں جن کی مانند بلوچ بھی

1- Sind Gazetteer Vol. I P. 89

متحمل مزاج اور سخت جان ہیں جن کا بلوچ کوہستانی کی آزادی نے خوگر بنا دیا ہے۔ مسٹر الیسٹ وک نے اپنی کتاب میں بلوچوں کی قوت برداشت کی خوب داد دی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ تمام لوگوں سے زیادہ عرصہ تک بلوچ پانی کی خواہش روک سکتے ہیں۔ جب وہ بہت دور ڈاکے ڈالتے ہیں تو صرف ایک بار پانی پیتے ہیں اور ان کی تپش میں کبھی نہیں پیتے۔ دراصل وہ ایک قسم کی نہایت مشاقی کرتے ہیں اور جوان کا مقابلہ کرنا چاہیں وہ بھی اسے حاصل کریں مگر کوئی یورپین اپنی طبیعت کو اس قدر تبدیل کرنے کی امید نہیں کر سکتا۔ کہ سخت جانی میں ان کا ہم پلہ ہو۔ بلوچی لگاتار پچاس پچاس اور ساٹھ ساٹھ بلکہ ستر میل تک بغیر کسی جگہ ٹھہرنے کے چلے جاتے ہیں۔"

پنجاب میں سکھوں کے عروج کے زمانے میں اگرچہ بلوچوں کو ان سے زیادہ واسطہ نہ پڑا مگر جب بھی سکھوں سے ان کا مقابلہ ہوا تو وہ بلوچی قبائلی لوگوں کو مطیع کرنے میں بالکل ناکام رہے بلکہ زک اٹھائی۔ ۱۸۱۹ء میں رنجیت سنگھ نے ڈیرہ غازیخان کے درانی گورنر کو نکال کر قبضہ کر لیا مگر وہ بلوچ قبائل کو مطیع کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ بزدار، کھوسے، مزاری وغیرہ قبائل نے سکھوں کی خوب درگت بنائی۔ سکھوں کی بلوچوں کے ساتھ یہ چھیڑ چھاڑ رنجیت سنگھ کے لئے سخت نقصان دہ ثابت ہوئی جس سے ڈیرہ غازیخان میں حکومت پنجاب کے سرحدی قلعہ جات بلوچوں کی مار کی زد میں آگئے۔ سکھوں پر بلوچوں کا اس قدر خوف طاری تھا کہ دن کے وقت بھی قلعوں کے دروازے بند رکھتے تھے اور قلعہ دار کی اجازت کے بغیر کوئی آدمی نہ تو قلعے کے اندر آ سکتا تھا اور نہ ہی باہر جا سکتا تھا۔ بلوچوں اور سکھوں کے مقابلوں کی بابت موہن لعل کے سفرنامہ میں مورخہ یکم مارچ ۱۸۳۶ء کے اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ جب کھوسے بلوچوں نے عمر کوٹ پر حملہ کیا تو سکھ لشکر نے ان کا مقابلہ کیا۔ بلوچوں نے پچاس سکھوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دیا۔ اس جنگ میں بلوچوں کا جانی نقصان صرف دو جانبازوں کا تھا جن کی لاشیں وہ کچاوے میں لاد کر اپنے ہمراہ لے گئے۔ اسی سفرنامہ میں موہن لعل ۷ مارچ کو تحریر کرتا ہے کہ وہ ایک میدان کارزار سے گزرا جہاں چند روز قبل سکھوں اور بگٹیوں کی لڑائی ہوئی تھی۔ اور وہاں چوبیس سکھ مارے گئے تھے۔

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں کمال خان بلوچ مٹھی بھر بلوچوں کی مدد سے دریائے راوی کے کنارے شیر گڑھ سے دلی والا تک کے علاقے پر قبضہ جما کر انگریزوں کو پریشان کرتا رہا۔ کمال خان کی دلیری اور حوصلہ مندی کی بدولت بلوچ مدت تک انگریزوں کے دانت کھٹے کرتے رہے۔ نیز ان اور سکھوں کے درمیان شمع آزادی کو روشن رکھنے کا

---

(1). Across the Border — Pathan & Baloch P. 21 E. E. OLIVER

(2). "تاریخ دست کوہ سندھ" ای۔ بی الیسٹ وک ترجمہ سید ضامن کنتوری ص ۱۲۲

کامیاب جدوجہد کرتے رہے اور دیگر قبائل انگریز کا ساتھ نہ دیتے تو کمال خان تاریخ پنجاب میں ایک درخشاں ستارہ ہوتا ۔ اس مرد مجاہد کے صدر مقام کے کھنڈرات اب نور شاہ کے قریب پائے جاتے ہیں ۔
بلوچ بہادر کی بڑی قدر و منزلت کرتے ہیں اور میدان جنگ میں بہادرانہ موت مرنے والوں کے متعلق پشتوں تک تعریف کے گیت گائے جاتے ہیں مگر راہ فرار اختیار کرنے والوں کے لئے مذمت اور لعنت ہوتی ہے ۔ قبائلی دور کی ایک بلوچی نظم کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے ۔

سات دفعہ مجھے یاد ہے خداوند تعالیٰ کے سو خزانوں کا دروازہ
اور شاہِ مرداں اور چاروں یاروں کو اور پیغمبروں کو
دنیا سے میں نے مانگا ایمان کا پردہ
دریا کی لہر کی مانند مجھے کیمیاگری اشعار آتی ہے ۔
میرے اور میری آنکھوں کے مددگار حضرت علیؓ ہیں
دیکھے میں نے خداوند تعالیٰ کے تماشے اور قصے
آدمی خاک ہو گئے قبروں میں
سید اور سردار سوادار محلوں سے اٹھ کر پیوند خاک ہو گئے ۔
مسلمان، سخی لوگ اور مومن
اور بیگمات اپنے شاندار مکانات اور رنگین چارپائیوں سے اٹھائے گئے
جہاں کا قافلہ گذر رہا ہے اور اس کا رخ عدم کی طرف ہے ۔
سوائے شیخ سربلا (ایک ولی کا نام) جو چاروں طرف سیر کرتا ہے ۔
بیٹے اپنے نیک بخت باپوں سے تکرار کرتے ہیں ۔
اور حرص کی وجہ سے بھائی بھائی سے جدا ہوتا ہے ۔
ہر آدمی کہتا ہے کہ میں بھوکا ہوں، اور سیر نہیں ہوا
چھوڑ دو جھوٹے جہان، جھوٹی کہانیوں، اور قصوں کو
خداوند تعالیٰ کے کام میں تم غور دیکھے ۔
اس دنیا کے رود بہتے ہوئے خشک ہو جاتے ہیں ۔
خدا بندوں کو دی ہوئی تمام نعمتوں کو چھین لیتا ہے ۔
جب ازل (قضا و قدر) اٹھاتی ہے تو آدمی آسائش کی جگہ نکلتا ہے

ملک الموت لے جاتا ہے ساتویں دن کی منزل پر
مسمی دلیل لشکر کا سر گروہ ہوا۔

... .

دلیل نے کہا کہ میں قسم دوں گا
اور بہادری کے نام پر جوہر دار تلوار چلاؤں گا۔
مسمی چھپیٹہ نے جرأت سے اپنے کو ہتھیاروں سے مسلح کیا
جن میں کارد، خنجر، اور کندھے پر دو تال بندوق شامل تھی۔
لڑائی میں چھپیٹہ اور دلیل دونوں مارے گئے
یہ خبر کھا گننے والے دنیا والوں تک لے گئے۔

... .

داد محمد نے لشکر کی کمان سنبھال لی
یہ لشکر امیروں کے ڈیروں پر ٹوٹ پڑا
گلّن شام کے کالے بادلوں کی مانند جم گیا
جبکہ اس کے نرم کپڑے اور ریشمی کورٹ لٹکتا تھا
فاضل نے جوہر دار سبز تلوار میان سے نکالی
اور دلہا دلہن کی مانند اپنے جسموں کو ہتھیاروں نے آراستہ کیا
بھورا اور بخشہ میدان جنگ میں طرول کے ساتھ موجود ہیں۔
بخشوانی ہمیشہ دشمن کی تلواروں کو روکنے والے ہیں۔
دشمن کو لگا نے خون میں دھبوں (سرخ زنگ) کی مانند رنگ دیا۔
محمدان میدانِ جنگ میں پاک شہید ہو کر گرا۔
ملک کو دشمن کے بھاری لشکر نے پامال کیا
جبکہ مبارک زور شور سے دشمنوں کے حملوں کا جواب دے رہا تھا
داؤد رندوں (ایک نامور بلوچ قبیلہ) کی مانند مستقل مزاجی سے ڈٹا ہوا تھا
کیونکہ سعادت مند بیٹے ہمیشہ اپنے باپ کے پہلو میں جنگ میں شامل ہوتے ہیں
(مبارک اور داؤد باپ بیٹا تھے)

فجر کے وقت سید دکر لینے کے لئے حوریں آئیں (یعنی مارا گیا)
سب نے شرابِ مرگ منگوں سے اکھٹے نوش کیا

شعر کو ختم کیا ہی نے اور پردہ کا سوال کرتا ہوں
کلمہ پڑھو حضرت محمدؐ کے دین کے مسلمان ہو جاؤ!

جب انگریزوں نے ہوس ملک گیری میں قلات پر حملہ کیا تو وزراء اور سرداروں نے میر محراب خان بلوچ خان قلات کو مشورہ دیا کہ وہ فی الوقت قلات سے نکل جائے اور پھر کسی مناسب موقع پہ تاج و تخت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ میر محراب خان بلوچ نے اس تجربہ کو سختی سے رد کر دیا اور فرمایا کہ اگر اُس نے اس آڑے وقت میں اپنے عوام کو چھوڑ کر جان بچائی تو بلوچ قوم رہتی دنیا تک اُس پہ اِس بزدلی کے سبب لعنت بھیجتی رہے گی۔ اُس نے اپنی بات سچ کر دکھائی اور شیر میسور ٹیپو سلطانؒ کی طرح میدانِ کارزار میں شہادت پائی۔

سخاوت

بلوچوں کی قومی تاریخ ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے جس سے ان کی فیاضی اور سخاوت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ چونکہ بلوچ کی نظر میں سخاوت اور فیاضی سب سے بڑا گن ہے لہٰذا بلوچ اپنے حاکم یا سردار کی اچھائی اور بُرائی جانچتے وقت سب سے زیادہ اہمیت اس کی فیاضی اور سخاوت کو دے گا۔ اس کی نظر میں کنجوس کبھی اچھا حکمران نہیں بنتا۔ جو حاکم اور سخی سردار ہو گزرے ہیں، بلوچ ان کو نہایت عقیدت اور احترام سے یاد کرتے ہیں۔ میر سمندر خان کو جب معز الدین نے ایک لاکھ روپیہ بطور خدمت کے صلہ میں دیا تو اس نے یہ تمام رقم اپنے مصاحبوں اور لشکر میں تقسیم کر دی۔ شہزادہ نے جب دوبارہ اسی قدر رقم دی تو اس نے پھر یہ رقم تقسیم کر دی۔ میر ابراہیم والی خاران کو جب ۱۷۱۶ء میں شاہ حسین غلزئی نے تین لاکھ روپے کی رقم دی تو اس نے تمام رقم کو بانٹ دیا اور ابراہیم لکھ بخش کا خطاب پایا۔ دراصل بلوچ سیم و زر کا پجاری نہیں بلکہ وہ اپنے مال سے ہر ایک کو فیض پہنچانے کا قائل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلوچ علاقوں میں ہر جگہ غرباء اور مسافروں کے لئے لنگر کھلے ہیں جہاں سے وہ پیٹ بھر کر کھانا کھا سکتے ہیں۔

وفاداری

بلوچ اپنے امیر اور سردار کا نہایت وفادار ہوتا ہے اور اس کی وفاداری عقیدت کی حد تک بڑھ جاتی ہے بشرطیکہ اس کی عزت نفس کا احترام کیا جائے۔ اس کی وفاداری دھن، دولت اور مال و متاع سے حاصل نہیں کی جا سکتی بلکہ صرف عزت اور احترام برقرار رکھ کر حاصل کی جا سکتی ہے۔ پہاڑی بلوچوں میں ان کا سردار روحانی پیشوا کا درجہ رکھتا ہے جس کی عزت اور ناموس کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی سے دریغ نہیں کیا جاتا۔ اگر بلوچوں نے دہلی کا تخت دوبارہ حاصل کرنے میں ہمایوں کی امداد کی تو 1857ء کی جنگِ آزادی میں بھی انہوں نے ملک و ملت کی خاطر اُس کی اولاد سے وفاداری کا پورا پورا ثبوت دیا۔ اس عہد بعہد میں نوابان فرخ نگر اور بہادر گڑھ جو بلوچی روایات کے امین تھے، آزادی کی شمع پر قربان ہو کر اپنی وفاداری اور جذبۂ حریت کی لاج رکھ گئے حالانکہ دیگر والیان ریاست نے چڑھتے سورج کی پرستش کی اور انگریزی کی امداد میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ مگر بلوچ آخر دم تک اپنے سلطان سے وابستہ رہے۔

کلہوڑہ خاندان کے ہاتھوں یکے بعد دیگرے بلوچوں کے کئی نامور سردار قتل ہوئے۔ اُن کی سفاکی سے تنگ آکر بلوچوں نے جب کلہوڑوں سے ٹکر لی تو کئی دفعہ تاجِ سندھ اُن کے رحم و کرم پر ہونے کے باوجود اسے خاندان کلہوڑہ کے کسی فرد کے حوالہ کر دیتے کیونکہ بلوچوں کی وفادار فطرت یہ برداشت نہ کر سکتی تھی کہ وہ ظالم آقا کی اولاد کو بھی اس کے حق سے محروم رکھیں۔ بلوچوں کی وفاداری کی بدولت تاج سندھ بار بار اُن کے ہاتھوں میں آنے کے باوجود خاندانِ کلہوڑہ کی طرف منتقل ہوتا رہا۔ ایچ۔ ٹی سورلے نے اپنی کتاب "شاہ عبداللطیف آف بھٹ" میں بلوچوں کی اس وفاداری پر اظہار حیرت کیا ہے۔ آخر جب خاندانِ کلہوڑہ کے مظالم انتہا سے بڑھ گئے، تو بلوچوں نے ملک کی سلامتی اور حفاظت خود اختیاری میں نظم و نسق سنبھالا۔ اس حالت میں بھی انہوں نے غیر ملکی افواج کو اپنے وطن میں لانا معیوب سمجھا کیونکہ غیر ملکی فوج کے داخلہ پر وطن سے وفاداری کے جذبہ کو ٹھیس لگنے کا احتمال تھا۔

چارلس نیپیر نے جب ہوس ملک گیری میں سندھ پر حملہ کیا تو کراچی کا قلعہ دار بچل خان تھا (اگرچہ سندات کی کتاب میں اس کا نام حاصل بن بچہ خان درج ہے) کراچی کی بندرگاہ میں انگریزی جنگی جہاز لنگر انداز ہو گئے اور فوج ساحل پر اُتر گئی۔ نیپیر نے بچل خان کو مطلع کیا کہ وہ معمولی جمعیت کے سہارے انگریزی دل کا مقابلہ نہیں کر سکتا لہٰذا بہتر ہے کہ وہ قلعہ اور شہر بغیر لڑائی اس کے حوالے کر دے مگر اُس وفا کے پُتلے نے جو جواب دیا وہ اس قابل ہے

---

(1) A collection of treaties, Engagements & Summads P-55 Vol. VII Ed. 1865 C. U. Aitchison.

کہ زندہ اقرار کے افراد اسے اپنی زندگی کی اساس بنا لیں، بچل خان نے جواب دیا" مانا کہ تمہاری بحری اور بری فوجیں بڑی کثیر تعداد میں ہیں اور تمہاری توپیں دور مار کرنے والی ہیں مگر میں نے اپنے آقا امیران سندھ کا نمک کھایا ہے۔ جو فرض میرے ذمہ لگایا گیا ہے اس کی بجا آوری کے لئے میں آخری قطرۂ خون بہانے سے بھی دریغ نہیں کروں گا۔ میں نتائج سے بے پرواہ ہوں۔ میرا کام صرف فرض کی احسن طریقے سے بجا آوری ہے اور کسی قسم کا خوف اور لالچ مجھے اپنے فرض سے ہٹا نہیں سکتا"۔ بچل خان نے اپنے فرض منصبی کو پورا کیا اور جب اسے افسران بالا سے حکم ملا تو قلعہ حوالے کر دیا۔ اگر سکندر اعظم اپنے حریف راجہ پورس کی وفاداری، احساس ذمہ داری اور جسمانی قوت و صورت کی تعریف کرتا ہے تو نیپیئر بھی بچل خان کی وفاداری، احساس ذمہ داری اور حسن جسمانی کی تعریف کرنے میں فخر محسوس کرتا ہے۔ مگر افسوس کہ جس پاکستانی بہادر کی دشمن بھی تعریف کرتے ہیں آج پاکستان کی آزاد مملکت کے اس عظیم شہر میں اس بہادر کے شایان شان کوئی یادگار از قسم کالج، ہسپتال، فوجی بیرک وغیرہ قائم نہیں۔ البتہ ہمارے دشمن اور آزادی سلب کرنے والے دشمنوں کے نام پر میری ویدر ٹاور، نیپیئر روڈ اور بیرک ضرور موجود ہیں۔ کیا یہ عظیم بے حسی کی دلیل نہیں ہے۔

ایفاء وعدہ

بلوچ قبائل میں ہمیشہ باہمی لڑائیاں ہوتی رہی ہیں، مگر جب صلح ہو گئی تو بلوچ ہمیشہ اپنے عہد پر قائم رہا بہت کم دیکھنے میں آئے گا کہ بلوچوں نے عہد شکنی کی ہو جس بات کی ایک دفعہ ہاں کر لی تو اس پر ہمیشہ قائم رہے گا۔ سر ڈینزل ابیٹ سن بلوچ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ" بلوچ اپنے وعدہ کا پکا ہے......یہی وجہ ہے کہ تمن ضلع ڈیرہ غازیخان (اب ضلع راجن پور) کے مغرب میں پہاڑ پر ایک پتھر ہے جو" لعنت کا پتھر" کہلاتا ہے یہ پتھر ان لوگوں کی یادگار ہے جو اپنے ساتھیوں سے دغا کریں۔[2]

بلوچستان کے علاقے کی ابتدائی سروے کرتے ہوئے مسٹر فلائیر کو بنار عباس، بوشہر وغیرہ علاقے میں بھی جانا پڑا۔ وہ لکھتا ہے کہ" اس سفر کے دوران میں عزت نفس اور وقار کا عجیب و غریب واقعہ دیکھنے میں آیا۔ مجھے ایک دفعہ بہت بڑی رقم جسک بھیجنے کی ضرورت ہوئی تو میں نے فیصلہ کیا کہ اپنے نوکر ابراہیم کو بھیج دوں مگر اسی وقت معلوم ہوا کہ ایک آدمی جسک جا رہا ہے اور سب نے بتایا کہ وہ رقم پہنچا دیگا۔ اُس کے پاس گئے۔ تو وہ آدمی اپنے سفر پر روانہ ہو کر ابھی جھاڑیوں میں نظروں سے اوجھل ہوا تھا۔ لوگوں نے اُسے آواز دے کر واپس بلوایا۔ اور رقم اس

---

(1) Conquest of Sind Vol. I Charles Napier
(2) Punjab Castes Sir Denzil Ibbetson.

کے حوالے کردی ۔ تمام لوگ اُس سے ناواقف تھے اور جب میں نے رقم تلف ہونے کا اندیشہ ظاہر کیا تو اس شخص نے جواب دیا کہ وہ بلوچ ہے یعنی بلوچ ہونا بااعتبار ہونے کے مترادف ہے ۔ اس شخص نے واقعی رقم پہنچادی اور مجھے شک کرنے پر شرمندگی کا احساس ہوا ۔ یہ سچ ہے کہ ایک بلوچ قبیلہ دوسرے کو چھاپہ مار کر کے لوٹ لے گا مگر وہ کبھی چوری نہیں کریں گے"۔ مگر اب بدقسمتی سے ان لوگوں میں چوری کی برائی کی طرف رغبت بڑھ گئی ہے ۔

سادگی

بلوچ کو ماحول نے نہایت دلیر، جفاکش اور سادگی پسند بنا دیا ہے۔ اس کی سادگی نہ صرف وضع قطع اور رہن سہن میں عیاں ہے بلکہ وہ اپنے خیالات کے اظہار میں بھی سادگی پسند ہے ۔ اس کی شاعری میں بھی فارسی طرز کی رنگ آمیزی نہیں بلکہ وہ مقصد کو نہایت سیدھے سادہ مگر شیریں طریقہ سے ادا کرتا ہے ۔ ایک بلوچی نظم کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے :-

اے ہوشیار ڈوم لے آؤ اپنا لکڑی کا عمدہ تنبورہ
بڑی نخرہ کو پاس میرے آکر رکھو!
تمہارے کاموں سے شکر ہے اے سچے خدا
تمہارے کاموں کو دیکھ کر میں حیران اور تھک گیا ہوں
کون ڈالے گا ہاتھ تمہارے عجائب کاموں میں
آدمی پوری عقل نہیں رکھتا واسطے سمجھنے ان کاموں کے
یہ جہان خوش ہے دولت جمع کرنے میں
یہ جہان جھوٹا ہے اور جھوٹے سودے رکھتا ہے
چاروں طرف پتھر اور فولاد کے پہاڑ ہیں!!
عمر گزرنے پر ملک الموت آتا ہے سر پر
لے جاتا ہے بادشاہوں کو رنگین چارپائیوں کے اوپر سے
طلائی (خوبصورت) بچوں اور بھائیوں کو مجلس سے
باندھے ہوئے گھوڑے رہ جاتے ہیں اصطبل میں
اگر نصیب ہے تو اپنے ساتھ ایک کفن لے جاتا ہے
ہے فنا ان کے واسطے جنھوں نے جھوٹی گواہی دی!!

(1) Unexplored Baluchistan E.A.Floyer P.138

اُن کی آنکھیں اندھی ہوگئیں اور زبان گونگی؛!
فنا اس کو ہے جو عدالت میں رعایت یا بے انصافی کریں
رسولؐ کے حضور میں کس طرح سے جائیں گے
فنا اس کو ہے جو دینے والے کا راستہ روکے
جان بوجھ کر اپنے تئیں آگ میں ڈالتے ہیں!
نیکی بہتے ہوئے دریا میں بھی گم نہیں ہوتی
اندر قرآن کے سب الفاظ ظاہر ہیں

جب تحدار اضی ہوتا ہے خاکی بندے پر
آپ رسولؐ بٹھائے گا پل صراط کے منہ پر

بلوچ کی سادگی اور ویرانہ فطرت کی عکاسی بلوچی کے نامور شاعر بالاچ خان گورگیج نے ان الفاظ میں کی ہے:-

پہاڑ بلوچوں کے قلعے ہیں۔
اور اُن کی چوٹیاں ہماری فوج ہے
اُن کی بلندیاں ساتھی
اور بغیر راہ چٹانیں دوست ہیں۔
ہماری شراب بہتے ہوئے چشمہ کا پانی ہے
کانٹے دار جھاڑیاں ہمارا بستر
زمین ہمارا تکیہ ہے
میری اسفید چیل میرا گھوڑا
تیر میرے بیٹے ہیں
نوکدار خنجر میرا داماد ہے
چوڑی ڈھال بھائی بند
اور گہرے زخم کرنے والی تلوار کو میرا باپ تصور کریں

(۱) تاریخ بلوچستان لالہ ہتورام

قوانین جنگ اور جنگی قیدی سے سلوک

جنگ کے دوران بلوچ کبھی کسی عورت، بچہ اور بوڑھے پر وار نہیں کرے گا۔ یہی وجہ ہے کہ میدان جنگ میں بلوچ عورت نے تیمارداری، مرہم پٹی اور پانی پلانے کا کام کیا ہے۔ میدان کارزار کے قریب کی عورتوں کو جب لڑائی کا حال معلوم ہوتا ہے تو وہ فوراً میدانِ جنگ کی طرف پانی کے مشکیزے لیکر دوڑتی اور وہاں بلاتفریق دوست و دشمن پانی پلانے، مرہم پٹی اور دیگر فرائض سرانجام دیتی۔ اگر لڑائی کے دوران میں اتفاقیہ طور پر کبھی عورت پر وار ہو جائے تو بلوچوں کے نزدیک یہ ناقابل تعزیر جرم ہے۔ جب ڈیرہ غازیخان کے دو قبائل درلشک اور مزاری کے درمیان جنگ ہوئی تو ایک مزاری عورت اتفاقیہ طور پر زخمی ہو گئی تو اس سے درلشک سخت بدنام ہوئے اقوام کے رسم و رواج دراصل جغرافیہ اور ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ عرب اور بلوچ دونوں صحرائی اقوام ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے رسم و رواج بھی ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ جنگ میں عربی بدو بھی بلوچوں کی مانند عورت پر وار کرنے کو باعث شرم سمجھتے ہیں۔ مسٹر ایس۔ ایس کرک برائڈ طویل عرصہ تک اردن، شام، فلسطین اور عرب کے بدو اعرابوں کے ساتھ کام کرتے رہے۔ وہ بدوی عورتوں کے متعلق اپنی کتاب میں لکھتے ہیں کہ "عرب بالخصوص بدو اعراب کا جنگ کی حالت میں عورتوں سے سلوک قابل تعریف ہوتا ہے۔ کسی عورت کو قتل یا زخمی کرنا وہ بڑی بے حرمتی کی بات سمجھتے ہیں۔ اور جب امن قائم ہو جاتا ہے تو مقتولہ عورت کا زرِ قصاص مرد سے چار گنا ہوتا ہے۔ خواہ وہ اتفاقیہ ہی قتل ہوئی ہو۔ بعض اوقات عورتوں کو ارادتاً بھی قتل کیا گیا ہے۔ مگر اس صورت میں قبیلے کو عرصہ دراز تک اس قتل کی وجہ سے طعنے برداشت کرنا پڑے۔ میرا کئی قبائلی جنگوں میں مشاہدہ ہے کہ جب عورتیں جنگ کے دوران زخمیوں کو اٹھانے کے لئے جاتی ہیں تو مردوں کے ہاتھ اسلحہ کے استعمال سے رک جاتے ہیں۔"

۱۸۳۹ء میں بلوچ قبیلہ مری اور انگریزوں کے درمیان جنگ ہوئی تو انگریزوں نے زبردست شکست کھائی اور بلوچوں نے سامان جنگ کے علاوہ 80 اسی قیدی بھی بنائے جنہوں نے جان بخشی کی درخواست کی۔ مری دلیروں نے اپنی قومی روایات کے مطابق ان کی جان بخشی کی کیونکہ

شکار مردہ سزاوار شہباز نہیں (اقبالؒ)

اور ان قیدیوں کو بہترین غذا و سامان رسد دیا اور بحفاظت پہاڑ سے گذار کر انگریزی سرحد پر پہنچا دیا۔ بر ائن کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا کیونکہ بلوچ جنگی قیدی سے ہمیشہ اعلیٰ سلوک کا مظاہرہ کرتا ہے۔

---

(1) A Shackle of Thorns P. 72 Ed. 1956
Sir Alec Seath Kirkbride

کلہوڑہ خاندان کے حکمران میاں غلام نبی خان نے جب بلوچوں کے کئی نامور سردار دغا سے قتل کرا دیے تو وہ بھڑک اُٹھے۔ بلوچوں اور کلہوڑوں کے درمیان لنیاری تعلقہ شہدادپور میں مقابلہ ہوا جس میں کلہوڑوں کی فوج کی تعداد تیس ہزار تھی جب کہ بلوچ صرف چھ ہزار کی تعداد میں تھے۔ اس جنگ کے ابتدائی مراحل میں کلہوڑہ فوج کا بہترین جرنیل فیروز خان پتافی مارا گیا تو میاں غلام نبی خان کامیابی سے ناامید ہو گیا۔ اس نے اپنے سپہ سالار تیجا لیکی بھی کے مشورے کے خلاف صلح کی خواہش کا اظہار کیا جس پر بلوچوں کا سردار میر بجار خان رضامند ہو گیا مگر تیجا نے میاں صاحب کو بڑی بے دردی سے قتل کر دیا۔ بلوچوں نے اسے شاہی اعزاز کے ساتھ دفن کیا۔ تیجا لیکھے فرار ہو گیا۔ جب میاں عبدالنبی خان کو میاں غلام نبی خان کے قتل کا علم ہوا تو اس نے کلہوڑہ خاندان کے اکثر مردوں مثلاً میاں سرفراز خان وغیرہ کو قتل کرا دیا کیونکہ اسے یقین تھا کہ بلوچ خاندان کلہوڑہ میں سے کسی کو تخت پر بٹھائیں گے لہٰذا اس نے تمام مدمقابل کا صفایا کر دیا۔

تیمور شاہ ابدالی کو جب سندھ میں بلوچوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا علم ہوا تو ان کو کچلنے کے لیے عزت خان کو روانہ کیا۔ اس کے ساتھ ہی حاکم ڈیرہ غازیخان کو شاہی فرمان کے ذریعہ اخراجات اور فوج سے مدد کا حکم دیا۔ عزت خان کی امداد کے لئے سندھ کے کھوسے، نواب بہاولپور اور خان قلات کی فوجیں بھی آ گئیں۔ اس طرح کابل کے لشکر کی مجموعی تعداد تیس ہزار تھی جس کے مقابلے پر بلوچ صرف اٹھارہ ہزار کا لشکر مقابلہ میں لا سکے۔ شکارپور کے قریب مقابلہ ہوا جس میں کابلی لشکر ہزاروں لاشیں چھوڑ کر فرار ہو گیا۔ میدان جنگ کا محل وقوع کچھ ایسا تھا کہ شکست خوردہ لشکر کا کوئی حصہ فاتح کے ہاتھوں سے بچ کر نہ جا سکتا تھا مگر میر بجار خان نے شکست خوردہ لشکر کے تعاقب سے منع کر دیا تاکہ مخلوق خدا ناحق تباہ و برباد نہ ہو۔ کچھ ابدالی لشکر نے قلعہ میں پناہ لی مگر انہوں نے جلدی ہتھیار ڈال دیئے۔ میر بجار خان نے ان قیدیوں کو نہ صرف رہا کیا بلکہ ہر سردار کو انفرادی طور پر بلا کر اس کا حسب نسب دریافت کر کے خلعت، گھوڑا اور زاد راہ دے کر رخصت کیا۔ یہ تھا بلوچی قانون جنگ جس کو میر بجار خان نے احسن طریقے سے نبھایا۔ اب ذرا اس سلوک کا مقابلہ نادر شاہ کے عمل سے کیا جائے جس نے دہلی کے قتل عام میں ڈیڑھ لاکھ آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اسی طرح سے بندہ بیراگی نے سامانہ اور سرہند پر جب ۱۷۰۹ء میں حملہ کیا تو سامانہ کی تمام مسلمان آبادی جس کی تعداد دس ہزار تھی، تہ تیغ کر دی گئی جبکہ سرہند میں عوام سے اس سے بھی بدتر سلوک روا رکھا گیا۔ حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کیے گئے اور بچوں کو زمین پر پٹخ پٹخ کر قتل کیا گیا[1]۔ اسی طرح سے تیمور لنگ نے سرسہ، فتح آباد اور لونی کی فتح کے وقت ایک لاکھ قیدی بنائے اور پھر ان کو قتل کر دیا۔ ۱۷۵۶ء میں ادینہ بیگ نے جو خود ایک ارائیں مسلمان تھا مرہٹوں کے ساتھ مل کر سرہند کے مسلمانوں کا قتل عام کیا اور پھر شہر کو آگ لگا دی۔

۱؎ تاریخ پنجاب صہ ۴۰۸ اقبال صلاح الدین

تین بھائی احمد، علی اور حسن جو تاریخ میں بوامیہ کے نام سے مشہور ہیں خلیفہ بغداد پر حاوی ہو گئے۔ انہوں نے ۹۴۶ء میں فارس اور اصفہان پر قبضہ کر لیا۔ اس وقت جیرفات پر بلوچ قابض تھے۔ احمد نے جیرفات پر حملہ کیا اور معاہدہ کے باوجود وعدہ خلافی کر کے رات کو حملہ کیا مگر بلوچ مستعد تھے اور انہوں نے احمد کی فوج کو گاجر مولی کی طرح کاٹ دیا۔ صبح کے وقت احمد نیم مردہ حالت میں پایا گیا۔ اس کا ایک بازو کٹ چکا تھا۔ بلوچ حکمران ابن کلواہی نے اس کا علاج کرایا۔ اور جب وہ شفایاب ہو گیا تو علی کے پاس اصفہان روانہ کر دیا۔ علی نے اس احسان پر شکریہ ادا کرنے کی بجائے دوبارہ حملہ کیا مگر شکست کھائی۔

بلوچ فطرتاً غیر ضروری خونریزی سے احتراز کرنے والا ہے اور ان کے ہاتھ تاج و تخت حاصل کرنے کی خاطر اپنے رشتہ داروں کے خون سے بہت ہی کم داغدار ہوئے ہیں حالانکہ تاریخ پاک و ہند میں اس دھبہ سے کوئی خاندان نہیں بچ سکا۔ اس کے برخلاف سندھ کے بلوچ حکمران خاندان کے ہر فرمانروا نے اپنی اولاد کی بجائے اپنے بھائی کو تاج و تخت کے لیے منتخب کیا کیونکہ حکومت اور تاج ان کی نظر میں خدمت خلق کے سوا کچھ اور نہ تھے۔ تحت قلات کے بلوچ وارثوں نے بھی شدید ضروری مواقع کے علاوہ کبھی انسانی خون نہیں بہایا۔ تاریخ میں ایسے مواقع بہت کم نظر آئیں گے جب حکمرانوں نے تاج و تخت پر غاصبانہ قبضہ کرنے کی کوشش کرنے والوں کو معاف کیا ہو بلکہ بعض سلاطین دہلی نے اپنی اولاد کی گردنیں اڑا دیں جب انہیں شبہ ہوا کہ وہ تخت حاصل کرنے کی خاطر ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔ نادر شاہ نے اپنے بیٹے نصر اللہ خان کو اسی شک کی بنا پر اندھا کر دیا۔

ایران کے شاہ عباس اعظم (۱587ء تا 1629ء) نے اپنے بیٹے صفی مرزا کو قتل کرا دیا۔ دوسرا بیٹا قدرتی موت مرا۔ تیسرا بیٹا خدابندہ تھا جس کی آنکھوں میں باپ کے حکم پر دہکتی ہوئی سلائی پھیر کر اندھا کر دیا گیا۔ چوتھے بیٹے کی آنکھیں نکلوا دیں۔ مگر یہاں پر یہ حالت رہی کہ بار بار کی بغاوت کے باوجود انہیں صرف پابند قید کیا گیا۔

بلوچوں نے یرغمال کے ساتھ بھی ہمیشہ شاہانہ سلوک روا رکھا اور ان کا فاتح خاندان کے شہزادوں نے استقبال کیا۔ تاکہ ان کی عزت نفس مجروح نہ ہو اور وہ شکست کی ندامت بھول جائیں جب سندھ سے بلوچوں نے بہاولپور کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا تو اس نے نہ صرف صلح کر لی۔ بلکہ تاوان جنگ کی ادائیگی تک اپنے بیٹے شہزادہ محمد رحیم خان کو بطور یرغمال دربار سندھ کو روانہ کیا۔ 1227ھ میں جب اس کی نہ ا لیبی

(۱) تاریخ ایران جلد اول صد 392 پروفیسر مقبول بیگ بدخشانی

ہوئی تو بلوچوں نے تحائف بیش بہا اور خلعتِ شاہانہ عطا کیئے۔ اب ذرا اس سلوک کا موازنہ انگریز سے کیجئے جو انہوں نے شیرِ میسور سلطان ٹیپو شہید کے بیٹوں سے روا رکھا۔

ضلع ہذا میں قبائل کے درمیان اکثر لڑائیاں ہوتی رہیں ہیں اور ان کے سدِ باب کے لئے یرغمال لیئے جاتے تھے تاکہ دوسرا قبیلہ اپنے آدمیوں کی حفاظت کے نقطۂ نظر سے کوئی چھیڑ چھاڑ نہ کر سکے۔ بیلہ کے لغاری، قائم دالا کے کھوسے، ہنگر دھڑہ کے بزدار اور فقیر تنکانی کے تنکانی اس کی خاص خاص مثالیں ہیں۔ ان لوگوں سے یعنی یرغمالیوں سے میزبان قبیلہ نے اس قدر مشفقانہ سلوک روا رکھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے وہیں کے ہو کر رہ گئے۔

طریقۂ جنگ

بلوچ جنگ میں پیادہ بہتر لڑتا ہے۔ اگر وہ کہیں دُور دراز علاقے سے بھی حملہ آور ہوتا ہے تو میدانِ جنگ کے قریب گھوڑوں سے اتر کر لڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قدیم اشعار میں "گھوڑوں سے اتر پڑے" جنگ کرنے کے مترادف ہے۔ بلوچ دشمن پر چھپ کر وار کرنا عیب سمجھتا ہے لہٰذا وہ اپنے دشمن پر للکار کر حملہ کرے گا اور اسے اتنی مہلت و ڈھیل دے گا کہ وہ اپنی مدافعت کر سکے۔ بلوچ کسی محفوظ مقام پر دبک کر دشمن کی گھات میں بیٹھنا پسند نہیں کرتا ہے۔ اور نہ ہی کسی محفوظ مقام میں رہ کر دشمن پر وار کرے گا بلکہ وہ اپنے دشمن سے گتھ کر لڑنے کا قائل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب کسی قوم کو بلوچ سے بوقتِ جنگ واسطہ پڑا تو فریقین کا بھاری جانی نقصان ہوا۔

بلوچوں کے خصائل اور سخت جانی کا مسٹر شانڈ ان الفاظ میں ذکر کرتا ہے: "صحرائے عرب کے بدو کی مانند بلوچ پیدائشی گھڑ سوار ہے اور وہ گھوڑوں کی ایک سخت جان نسل کو پالتے ہیں جن کو خصوصی تربیت دے کر پیاس برداشت کرنے کی عادت ڈالی جاتی ہے۔ اس طرح وہ طویل وقفوں کے علاوہ پانی کے حاجت مند نہیں رہتے۔ کہا جاتا ہے کہ ان گھوڑوں کو کچا گوشت کھانے کی بھی تربیت دی جاتی ہے جس سے وہ نہ صرف پانی کے حاجت مند نہیں رہتے بلکہ عارضی طور پر قوت بھی اس سے حاصل کرتے ہیں۔ . . . .

بہرحال ایسی تربیت ان علاقوں میں نہایت مفید ثابت ہوتی ہے جہاں پانی کی قلت ہے اور وہاں صرف کوتاہ قد فراش کے پودے اگتے ہیں۔ میدانی علاقے پر چھاپہ مارتے وقت جب وہ لوٹ کھسوٹ کا مال جمع کر رہے ہوں تو کارگزاری کے بعد وہ فوراً اپنے گھوڑے کی طرف جائیں گے جن کو محافظ کے پاس چھوڑا گیا تھا۔ یہ گھوڑے بکری کی مانند صحیح جگہ قدم رکھنے کے خوگر ہوتے ہیں اور چٹانوں اور ندی نالوں کو بڑی سہولت سے پھلانگ سکتے ہیں اور اس طرح تعاقب کرنے والوں کو جُل دے جاتے ہیں۔

جان جیکب نے جب سرحدی چوکیاں قائم کیں تو انہوں نے یہاں پر تین عدد ٹنی تکلیف دی۔ ان بلوچوں کو جب کبھی

گھیر لیا گیا تو انہوں نے پوری قوت سے دشمن کا سامنا کیا اور آخری آدمی تک مرنا قبول کرتے تھے مگر ہتھیار ڈالنے پر تیار نہ ہوتے تھے۔ سر ولیم نپیر کے بیان کے مطابق بلوچ میدان کارزار میں عورتوں اور بچوں کو اپنے ہمراہ رکھتے تاکہ وہ اُن کے تحفظ میں رہیں۔ بسبب حالات ناساز گار ہو جاتے تو وہ اِن کا قتل عام کا حکم جاری کر دیتے۔"

ٹروڈسکی نے بلوچوں کی عادات و خصائل کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔" پٹھانوں کی مانند بلوچوں میں بہت سے اوصاف اور برائیاں ہیں جو نیم متمدن اور وحشی اقوام میں ہوتی ہیں۔ دونوں اقوام میں مہمان نوازی ایک مقدس فریضہ ہے اور مہمان کی حفاظت ناقابل سبکدوش ذمہ داری اور انتقام اہم ترین فرض ہے۔ دونوں ایک خاص قانون عزت کے قائل ہیں۔ موجودہ نظام یورپ سے بہت مختلف ہے۔ دونوں اللہ اور اس کے رسول کے ماننے والے ہیں مگر بلوچ سامنے سے حملہ کرے گا جبکہ پٹھان پیچھے سے۔ بلوچ اپنے وعدے کا پابند ہے تو پٹھان اپنے فوائد کے لحاظ سے عمل کرے گا۔

قصہ کوتاہ ـــــ! پٹھان کی نسبت بلوچ کم مفسد، دغاباز، خونخوار اور متعصب ہے۔ لہذا اُس میں جس قدر مذہبیت کم ہے، اسی قدر شیطانیت بھی کم ہے۔ بلوچ جسمانی لحاظ سے اپنے شمالی ہمسایہ کی نسبت چھوٹے قد اور بھر پور جسم والا ہے مگر پشت ہا پشت کی آزادی نے اسے شیر دل اور مردانہ اوصاف کا حامل بنا دیا ہے۔ اُس کا لمبا کتابی چہرہ اور حسین تراشیدہ خط و خال، عقابی ناک، چپڑی ہوئی زلفیں، داڑھی اور مونچھیں ہوتی ہیں۔ وہ اعلیٰ شہسوار ہے اور اس کا لباس ایڑی تک لمبا موٹے کپڑے کا کرتہ ہے جو کمر پر پیٹا ہوا ہوتا ہے۔ اس کے کندھوں پر لمبی چادر ہوتی ہے اور شلوار استعمال کرتا ہے۔ جہاں تک ممکن ہو اس کا لباس سفید رنگ کا ہوتا ہے۔ اس کا اسلحہ تلوار، خنجر اور ڈھال ہے۔ عادتاً وہ خانہ بدوش ہے۔ اور عورتوں کے پردہ کا رواج نہیں مگر زنانہ عزت کا حد سے زیادہ حساس ہے۔ زناکاری معلوم ہونے پر مرد قتل کر دیا جاتا ہے اور عورت حکم کے تحت گلے میں پھندا ڈال کر خودکشی کر لیتی ہے۔ جنگ کے وقت بھی بلوچ کے دشمن کے زن و بچہ محفوظ رہتے ہیں۔" چونکہ بچے پر وار کرنا بزدلی کا فعل سمجھا جاتا ہے۔ لہذا بالغ اور نابالغ مرد میں تمیز کرنے کے اُن میں رواج تھا کہ نابالغ لڑکا صرف لمبا کرتا پہنتا تھا۔ جب وہ بالغ ہو جاتا تو شلوار استعمال کرتا جس سے یہ مطلب لیا جاتا تھا کہ وہ اب اپنی مردانہ ذمہ داریوں کو سنبھالنے کا اہل ہے۔

مسٹر فرائر نے بلوچوں کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے"۔ بلوچ عموماً دراز قد اور بھرپورے جسم کا مالک ہے۔ اُن کا چہرہ کتابی (بیضوی) اور وہ لمبے بال اور داڑھی رکھتا ہے۔ البتہ اُن کی

(1) General John Jacob P. 19-20 Shand
(2) The land of five rivers P. 107 H. C. Trovskie

مونچھیں شریعت کے مطابق کٹی ہوئی ہوتی ہیں۔ وہ بیباک اور خوش طبع ہے۔ وہ مزاح کو سمجھنے کی اہلیت رکھتا ہے اور اس سے پوری طرح سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ وہ سخت جان اور اعتدال پسند ہے۔ وہ لمبے سفر کو نہایت معمولی غذا پر طے کرنے کی قوت رکھتا ہے۔ بلوچ جوانمرد اور شہ زور ہے مگر وہ صرف جنگ کو اپنا پیشہ سمجھتا ہے جس کی وجہ سے وہ زراعت اور دیگر پُرامن دستکاریوں کو اختیار کرنے سے گریزاں ہے۔"[1]

مختصراً بلوچ کے قانون جنگ اور "شرف" کو یوں بیان کیا جاسکتا ہے:۔

(۱) بھاگتے ہوئے دشمن پر وار ہرگز نہ کرے گا۔

(2) جب دشمن ہتھیار ڈال دے تو اس پر ہاتھ نہ اُٹھائے گا۔

(3) دشمن پر للکارنے سے پہلے حملہ نہ کرے گا۔

(4) نابالغ لڑکوں، عورتوں اور بوڑھے مردوں پر حملہ نہ کرے گا۔

(5) سادات، عورت یا ہندو کے درمیان میں آنے پر لڑائی سے ہاتھ رک جائیں گے۔

(6) اپنے باہوٹ (پناہ میں آیا ہوا) کی ہر قیمت پر حفاظت کی جائیگی۔

(7) مہمان کی خدمت اور حفاظت میں کسی چیز سے دریغ نہ کیا جائے گا۔

(8) جب دشمن میرمتھ (عورتوں اور بچوں کا گروہ برائے معافی) لے کر آئے تو اس کی خطا معاف کرنا۔

(۹) وعدہ پورا کرنا خواہ اس کے لئے کتنی بڑی قربانی دینا پڑے۔

(۱۰) انتقام ضرور لیا جائے گا خواہ اس کے لئے کتنا انتظار کرنا پڑے۔

(۱۱) اپنی بیوی، بہن، بیٹی وغیرہ کی عزت (ننگ) پر جان قربان کرنا پڑے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ نے بلوچ کی خصلت کو "ارمغان حجاز" میں بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو" کے عنوان سے یوں بیان فرمائی ہے:۔

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دلی نہ بخارا
جس سمت میں چاہے صفت سیل رواں چل
وادی یہ ہماری ہے وہ صحرا بھی ہمارا
غیرت ہے بڑی چیز جہان تگ و دو میں

---

[1] First Regular settlement Report of D.G.Khan P.61-62
E.W.R. Fryer

پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

حاصل کسی کامل سے یہ پوشیدہ ہنر کر

کہتے ہیں کہ شیشہ کو بنا سکتے ہیں خارا

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر

ہر فرد ہے ملت کے مقدّر کا ستارا

محروم رہا دولت دریا سے وہ غواص

کرتا نہیں جو صحبت ساحل سے کنارا

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت

ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا

دنیا کو ہے پھر معرکۂ روح و بدن پیش

تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا

اللہ کو پامردیِ مومن پہ بھروسا

ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا

تقدیرِ امم کیا ہے؟ کوئی کہہ نہیں سکتا

مومن کی ہو فراست تو کافی ہے اشارا

اخلاصِ عمل مانگ نیاگانِ کہن سے

شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدارا

باب ۴

تمدّنِ بلوچ

بلوچی زبان

اگرچہ بلوچ ایک وسیع و عریض خطہ زمین پر آباد ہیں مگر بہت سے علاقوں میں انہوں نے مادری زبان کو چھوڑ کر ہمسایہ لوگوں کی زبان اختیار کرلی ہے۔ تاہم اس وقت بلوچی زبان صوبہ ہائے بلوچستان، سندھ پنجاب کے کچھ حصوں کے علاوہ ایران اور افغانستان میں "13 درجہ شمال سے شروع ہوکر جنوب کی طرف وہاں تک بولی جاتی ہے جہاں سے دریائے ہلمند جنوب سے شمال کی طرف بہتا ہے۔ اس کے علاوہ ایران کے صوبہ سیستان میں بلوچی اور فارسی ملی جلی بولی جاتی ہے۔ خانہ بدوش بلوچ کرمان اور خراسان میں بھی اپنی بولی کو استعمال کرتے ہیں۔ ایرانی بلوچستان میں بلوچی زبان بام پور تک پھیلی ہوئی ہے۔ یہ زبان (بلوچی) استعمال کرنے والے ایران میں بھی راس جسک تک موجود ہیں جو 58 طول بلد پر واقع ہے۔"[1]

بلوچی زبان کی دو بڑی شاخیں ہیں جن کو سلیمانی اور مکرانی بلوچی کے نام دیئے گئے ہیں۔ اول الذکر کوہ سلیمان میں رہنے والے بلوچ بولتے ہیں اور موخرالذکر کو مکران کے باشندگان کی زبان کہا جا سکتا ہے جس میں فارسی الفاظ کی زیادہ ملاوٹ ہے۔ "اگرچہ بلوچی زبان کے اکثر الفاظ بظاہر بگڑی ہوئی فارسی معلوم ہوتے ہیں۔ مگر ماہر لسانیات کی رائے میں بلوچی اور فارسی اتنا یا پرانی باختری زبان کی دو بیٹیاں ہیں اور اس لحاظ سے بلوچی زبان ایک علیحدہ اور مستقل زبان ہے۔ مسٹر گرائمرسن کے مطابق "اس کا حروف صحیح کا نظام بعض لحاظ سے انہی بنیادوں پر قائم ہے جس پر قرون وسطیٰ (چھٹی سے پندرھویں صدی عیسوی) میں پہلوی زبان قائم تھی۔ پروفیسر گائیگر کے نظریے کے مطابق اس میں ایسے الفاظ ابھی تک بغیر تغیر و تبدل کے محفوظ ہیں جو آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل اپنی اصلی آواز کو اس زبان میں ضائع کرنے لگ گئے تھے۔ جس کو اب جدید فارسی کہا جاتا ہے۔ اس کی گرامر میں بھی بعض قدیم عنصر محفوظ ہیں۔"[2]

---

(1) Linguistic Survey of India vol. I P. 104 G. A. Grierson
(2) " " " " " " " "

بلوچی ادب

جس علاقے میں بلوچ آباد ہیں، وہ عام طور پر صحرائی ہے جہاں بارش بہت کم ہوتی ہے۔ پہاڑوں کے سلسلے اور قبائلی نظامِ حیات نے ایک خاص طرزِ زندگی کی نشوونما کی ہے۔ اس زندگی میں بارش کو لوگ ہمیشہ رحمت سمجھتے ہیں کیونکہ اسی پر ان کے علاقے کی شادابی اور مویشیوں کے چارہ کی بہم رسانی منحصر ہے۔ لہٰذا ان کے شعراء نے بارش کو اپنی جولانیٔ طبع کا موضوع بنایا ہے۔ چونکہ قبائلی چپقلش سے لاانتہا جنگوں اور جھگڑوں کا سلسلہ شروع ہوا لہٰذا بلوچوں کا قدیم ادب اکثر بیشتر رزمیہ داستانوں پر مشتمل ہے۔ ان نظموں میں ہر قبیلے نے اپنے بہادروں کے کارناموں کو سراہا اور ان کو لافانی بنا دیا۔ اکثر نظموں میں مدمقابل قبیلہ کو کم اصلیت اور غیر بلوچ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے تاکہ ان کے تفاخر کو کم کیا جائے۔ ایسی ہی نظموں یا اشعار کو دیکھ کر سطح بین مورخ بعض قبائل کو غیر بلوچ تصور کرنے پر بضد نظر آتے ہیں۔ یہ رزمیہ نظمیں اپنے بہادروں کے جوش و خروش اور کارناموں پر داد دیتی ہیں مگر بعض ویدوں کے کئی حصوں کی مانند صرف محاربین کے ناموں کا دفتر بن کر رہ گئی ہیں۔ تاہم اکثر و بیشتر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہم ہی صحیح النسب بلوچ ہیں۔ اشعار کی دوسری قسم ہی وہ رومانی نظمیں شامل ہیں جن میں شیریں دوستن، سمی مست توکلی، سسی پنوں اور دیگر عشقیہ قصوں کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ بلوچوں کے ادب کا کچھ حصہ پیغمبروں، اولیاء اور بزرگوں کے حالاتِ زندگی اور ان کے اقوال کو موضوعِ سخن بنایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ بلوچی شاعری میں دستانغ مزاحیہ چٹکلے، چھوٹی نظمیں، پہیلیاں اور دو سخنے شامل ہیں۔ بچوں کو لوری دینے کا رواج تمام دنیا میں ہے جس میں ماں اپنی دلی آرزوؤں کا اظہار کرتی ہے۔ ایک روایتی بلوچ ماں کی لوری کا ترجمہ پیش کیا جاتا ہے۔ جیسے مسٹر ڈیمز نے ڈیرہ غازیخان کے مغربی علاقے میں سن کر تحریر کیا تھا:-

علم دین جوان ہوگا، سفید لباس پہنے گا (سفید لباس بلوچ کا عمومی لباس تھا)

وہ چھ ہتھیار باندھنے والا ہوگا۔

(وہ ہتھیار یہ ہیں) ڈھال، بندوق، کٹار

(اور اس کے کاندھے سے) کمان اور تیروں بھرا ترکش لٹکتا ہوگا۔

شیرازی تلوار بندھی ہوگی

وہ تیز دوڑنے والی گھوڑی پر سوار ہوگا۔

وہ رزم گاہ میں دشمنوں کے حملوں کا دنداں شکن جواب دے گا۔

اس کا مقابلہ کوئی نہ کر سکے گا

وہ ترکش سے تیر نکال کر چلائے گا۔
علم دین جوان ہوگا، وہ سفید لباس پہنے گا۔
اور چھ ہتھیاروں سے مسلح ہوگا۔

جناب کامل القادری نے "بلوچی ادب کا مطالعہ" میں تحریر فرمایا ہے کہ " ہر ماں کی آرزو یہی ہوتی ہے کہ اس کا بچہ جوان ہو، ماں باپ کا نام روشن کرے،" زندگی میں کامیابی وکامرانی اس کا قدم چومے" انہی جذبات کا اظہار عموماً لوری میں ہوتا ہے۔

لیکن جن امیدوں، جن توقعات اور جن آرزوؤں کا لوری میں ماں اظہار کرتی ہے، ان کا سرا اس کی تہذیبی سرزمین میں پیوست ہوتا ہے۔ مثلاً ایک بلوچ ماں ہی اپنے بیٹے کے لئے یہ آرزو کرسکتی ہے کہ وہ بڑا ہو کر چھ ہتھیار باندھے، صبا رفتار گھوڑی پر سواری کرے، رزم گاہ میں دشمنوں کا مردانہ وار مقابلہ کرے، فتح مند ہو، بہادر، شہسوار، انتقام جو، غیرت مند، قول کا صادق اور اقبال مند ہو۔ ایک لوری میں ماں اپنے بچے کو نصیحت کرتی ہے:

(ترجمہ) ماں تجھے نصیحت کرتی ہے۔ جنگ کے نازک لمحات میں
تیرا سر ہو اور تلواروں کی چھاؤں۔ مجھے توقع ہے کہ تو جوانمردی کا مظاہرہ کرے گا۔
جس طرح بہنوں کو بھائیوں سے ہمدردی کی توقع ہوتی ہے۔ جس طرح عاشق کو محبوبہ کی محبت کا یقین ہوتا ہے
قوم کو تیری بلوچ حمیت پر بھروسہ ہے، مجھے یقین ہے کہ تو میری لوری کا پاس کرے گا۔

بلوچوں کا قدیم ادب اکثر و بیشتر لوگوں کو ازبر یاد ہے جس کو پیشہ ور ڈوم اور عوام بڑی کاوش سے سینہ بسینہ محفوظ رکھتے آئے ہیں اور میلوں اور محفلوں میں سنا کر داد حاصل کرتے ہیں۔ سلیمانی بلوچی کے ادب کا کچھ حصہ مسٹر ایم ایل ڈیمز ڈپٹی کمشنر ڈیرہ غازیخان نے " پاپولر پوایٹری آف دی بلوچز"[1] کے نام سے شائع کرایا۔ مگر اس کے بعد کوئی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی۔

بلوچی ادب خالصتاً عوامی ہے اور اس پر مسٹر ڈیمز تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں " افغانستان اور اسلامی ہند میں فارسی شاعری جس شکل میں نمودار ہوئی، بلوچی ادب میں اس کا کوئی اثر نہیں ملے گا۔ بلوچی شاعری اپنی ہیئت اور

---

(1) The Popular Poetry of the Baloches M.L. Dames

مواد کے لحاظ سے بالکل سیدھی سادہ ہے اور اس میں ہر بات نہایت صاف اور سیدھے سادہ طریقے سے بیان کی گئی ہے۔ ماحول کی عکاسی بڑی خوبصورتی سے کی گئی ہے اور شاعر مرچ مصالحہ لگا کر اپنی بات کو زیادہ بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی کوشش نہیں کرتا۔ بلوچوں کی رومانی شاعری میں یوں محسوس ہوتا ہے کہ بازار کے ماحول میں بھی صحرا کی نسیم گھلی ہوئی ہے۔ فطرتاً بلوچ شہری کی بجائے صحرائی ہے جو کبھی کبھار شہر کے ماحول میں آجاتا ہے۔ اگرچہ اس کی محبوبہ شہری عورت ہوسکتی ہے مگر اُسے بھی بیان کرتے وقت وہ فطرت سے خیالات حاصل کرتا ہے۔ وہ جہاں عطر و جواہرات کا ذکر کرتا ہے وہاں وہ اس کے ساتھ بادل، موسلادھار بارش، بجلی اور آگ کے شعلوں کا بھی ذکر کرتا ہے جس سے عیاں ہوجاتا ہے کہ وہ صحرا کا باشندہ ہے۔"

بلوچی شاعر ہمیشہ صحیح النسب بلوچ ہوتا ہے مگر وہ اپنے کلام کو خود بیان کرنا پسند نہیں کرتا بلکہ اُس کا کلام اُس کے خاندانی ڈوم کی معرفت عوام تک پہنچتا ہے۔ علاقہ بزدار کا نامور اصلاحی شاعر علی محمد خان بزدار اپنے کلام میں اِس کا ذکر یوں کرتے ہیں جس کو دولت خان بزدار سے سُن کر لکھا گیا ہے:-

لوری زیرے مائیں گفتاراں	لوری (ڈوم) اٹھا میرے کلام کو
برگوشب گوریں ڈاتاراں	اور سنا اُن کو جن کے گلے میں گانی ہو یعنی صاحب فراست
یکھا جوڑ کھنی گو تھارا	جب وہ قبیلے کی محفل میں ہوں
کش شار مختاری کھسو جھارا	کہ تم کو نگہبان (اللّٰہ) نے مختیار کیا
گنواں فراموش کھنے کمہارا	اور تم نے کمہار (خالق) کو فراموش کردیا
کہ آدیا دے دز گارا	جس سے تمام آوا بگڑ گیا!
لئے یلیتھئے بازارا	خدا نے پھیل دیا (نعمت کو) بازاروں میں
ذرکیس باندی شہر	اس شہر کی جو سب سے اوّل قائم ہوا (مکّہ)
ہرکس پھا چھوہل الگارا	مناسب ہے فرد اس کی طرف دوڑے
شا موتی ذڑ ھقوں بے وارا	کیونکہ موتی (قرآن اور اسلام) بغیر محنت تمہارے ہاتھ آئے
کھوڑی عاتکوں پھا آدارا	کیونکہ تعاقب کنندہ (شیطان) تم سے چھین لینے آیا ہے
شاخ پھر دنیادی کارا	مگر تم دنیا دی کاموں میں مصروف ہو
نفسالاف کھنے گو کاٹھارا	خنجر سے اپنے نفس کو گھونپ دو
شے کوڑی سنگیں اعتبارا	اس چند روزہ زندگی کا اعتبار نہ کر
موتیا مدیک سیبنارا	اس عرصہ کی خاطر موتی مگر مچھ (شیطان) کے حوالہ نہ کر[1]

(1) The Popular Poetry of the Baloches M.L. Dames

شابجنگا ہارس آں ددشتی	تم نے (شیطان سے) جنگ تو اس دن ہاری
کہ مے مٹول شاہوا آہورا البوریں تھی	کہ جب تمہارا بنیاد (حضرت آدم) بہشت سے نکلا تھا
ہرچیزیں کلا تھا کشتی	جہاں ہر چیز موجود تھی
نی پیڑھی واں بھیری اولاداں	اور اب تمام اولاد (بنی آدم) روتی ہے
کل پھر جہراں گریاناں	تمام عمر زور زور سے
نیں آں کینس بانڈواں نیلی سایئں	اب پرانے مقام پر قائم نہیں
بارشا باہرا اہوریں	بلکہ بوجھ ایک طرف لڑھک گیا ہے
زور پھر جہلغاں الگاریں	جس کی وجہ سے اب ہمارا زور اترائی (گناہ) کی طرف ہے۔

بلوچی ادب میں بہت سی مذہبی نظمیں ہیں جن میں سے ایک پیش کی جاتی ہے جو بلوچی شاعر عبدالرحمٰن خان بن عمر خان چاکرانی بلوچ بزدار نے اپنے خالق کے حضور میں اپنے گناہوں کے اعتراف اور استغفار میں پیش کی اور اسے دولت خان بزدار سے سن کر لکھا گیا:۔

قدرتے ولیس خداوندی	پروردگار تیری طاقت بے انتہا ہے
کہ موسماں گوار خیں جڑی بندی	تیرے حکم کے تحت موسموں کا تغیر و تبدل ظہور پذیر ہوتا ہے
کھوکھری گجیس ککری گرندی	رحمت کے بادل تیرے حکم سے بربادی کا باعث بن جاتے ہیں
مہر گو قہراں بانتراں بندی	تو قہار بھی ہے اور رحیم بھی
نیا مستاں وشیں ناں سرکے سندھی	جس پر تو چاہتا ہے نعمتوں کی بارش کرتا ہے
لیرے نوڑانی بنا نندی	جس کو چاہے تو بنیادوں کو ہلا کر رکھ دے
قیرو مسیازانیں مڑاگندی	بندوق کی گولی سے بھی اسے موت آتی ہے جس کو تو چاہے
کنتغاں دنیا بادشاہ چیندی	کئی اولیاء اور سلاطین اس جہاں سے کوچ کر گئے
اے جہاں ورد عیدنے بری بندی	کیونکہ یہ دنیا بے وفا اور جھوٹی ہے
حبرنیں کھیسوں نادر کاراں	میں اس کی قدرت پر حیران ہوں
لجعض کھاں کھیں بھبو غیں جھاڑاں	کہ بعض کو لاکھ کر دیتا ہے اور لاکھوں کو فنا کر دیتا ہے
بیرا بیٹھنیں مرنے باداں	جلد تباہی لا کر نہہ و بالا کر دیتا ہے
چور کھاں دیری لبستغیں شہراں	کئی شہروں کو لمحوں میں تباہ کیا

سنے گذی میاز مقداراں	کسی کام کے کرنے میں دیر نہیں کرتا
ڈالوٹھاں تشے گنجیں لنگراں ٹہراں	میں تیرے خزانہ سے امان اور معافی کا طلبگار ہوں
دیر دسے مولا تھاڈ وسی تہراں	اور اپنے قہر سے مجھے محفوظ رکھ
بخشش مائیں سائیں بھیک سی خواراں	میرے مولا! مجھ گنہگار کو بخش دے
آں سحلاں خالیغیں گنہگاراں	کیونکہ میرے پاس سوائے گناہوں کے بوجھ کے
	کوئی زادِ راہ نہیں

بلوچی شاعری میں حُبّ الوطنی کا اظہار بہت ہے۔ میر غوث بخش صابر کی نظم " گل زمین " مؤلفہ سید عابد رضوی سے شکریہ کے ساتھ نقل کی جاتی ہے جو جنگ 1965ء کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ ایک بلوچ مجاہد میدان جنگ کی طرف روانہ ہونے سے پہلے اپنی رفیقۂ حیات سے کہتا ہے:۔

تم مجھے اپنی زبان سے کہو ۔ تم دیسے بھی رکنے والا نہیں
میری رگوں میں بلوچوں کا گرم اور تازہ لہو مچل رہا ہے میں موم نہیں ہوں کہ دشمن مجھے اہمیت نہ دے
میں تو سنگین چٹان ہوں، کون توڑ سکے گا ؟ میری جوانی کی یہ جولانیاں
میرا یہ قد، یہ قامت اور قوّت یہ سب مجھے میرے وطن کی محبت نے بخشے ہیں۔
اور میں اپنی متاع اپنے ملک پہ نچھاور کردوں گا یہ میرے ملک کا دیا ہوا قرض ہے پیاری!
شوقِ شہادت نے مجھ پر نشہ طاری کر دیا ہے دشمن کی یہ مجال کہ سیالکوٹ کی لہلہاتی کھیتیوں کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھے۔ قصور اور راوی کے کنارے تک بڑھ آئے۔ بغداد، ملتان اور کوہاٹ کے محترم شہروں کو اپنے وجود سے نجس کرنے کی کوشش کرے۔
اب بھی اگر میں نے اس سرزمین کے تحفّظ کے لئے موت کا جام نہ پیا تو قیامت کے روز خدا کو کیا منہ دکھاؤں گا۔
میں قدم قدم پر دھرتی کی قسم کھاتا جاؤں گا۔
میری قسم، چاکر رند کا قول ہے ۔ میری قسم، نوری نصیر خان کی عظمت کی قسم ہے۔
مجھے دودھ کے پاک نام کی قسم ۔ دیکھو پاک وطن کی عزت مجھے پکار رہی ہے۔

بلوچی رومان

بلوچوں کی قومی زندگی میں کئی رومان پیدا ہوئے جو مدّت تک شاعروں کی جولانیٔ طبع کا موضوع بنے ہے۔ چونکہ

بلوچوں میں تحریر کا رواج نہ تھا لہٰذا اُن کے منظوم رومان سینہ بسینہ روایات کی صورت منتقل ہوتے رہے۔ اُن کے رومان میں سب سے مشہور گلنار ریورغ، سسّی پنّوں، شیریں دوستن، سمّو مست توکلی، ہانی مراد وغیرہ ہیں۔ جن اصحاب کو ان کے پڑھنے کا اشتیاق ہو وہ مسٹر ڈیمز کی کتاب " دی پاپولر پوائٹری آف دی بلوچیز" میں دیکھ سکتے ہیں

مکان

فطری طور پر بلوچ خانہ بدوش ہے اور موسم کے ساتھ نقل مکانی کرنے کا عادی ہے۔ البتہ جہاں حالات سدھر گئے ہیں وہاں پر مدنی زندگی اختیار کر چکا ہے۔ وہ عام حالات میں خیموں میں رہتا ہے جس کو بلوچی زبان میں گدان کہا جاتا ہے۔ جب تک قبائلی جنگیں عام تھیں اور ہر وقت دشمن کے حملہ کا خطرہ رہتا تھا تو گاؤں کے کاشتکار اپنے کھیتوں میں بھی چھوٹے چھوٹے برج تعمیر کر لیتے تھے جہاں اچانک حملہ کی صورت میں وہ لکڑی کی سیڑھی کے ذریعے برج میں داخل ہو کر سیڑھی اُٹھا لیتے تھے۔ ان برجوں میں دشمن سے مقابلہ کرنے کی غرض سے دیوار میں چھوٹے چھوٹے سوراخ ہوتے جن میں بندوق کی نالی رکھ کر فائر کیے جاتے۔ اگرچہ اب اکثر و بیشتر برج گر چکے ہیں مگر اب بھی کہیں کہیں موجود ہیں جن کو مقامی زبان میں ٹھل کہا جاتا ہے۔ بعض قصبے اور گاؤں ٹھل کے نام سے منسوب ہیں مثلاً ٹھل عالم خان، ٹھل علی محمدؒ (نزد دھڑ مد) ٹھل علو وغیرہ۔ ان برجوں سے سنتری بذریعہ ڈھول دشمن کے حملہ کی اطلاع کر دیتے تھے۔

لباس

بلوچ کا روائتی لباس چغہ نما کرتا ہے جو کمر پر چُنا ہُوا اور سامنے سے کھلا ہُوا ہوتا ہے جہاں تکمے یا بٹن لگے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ کرتا آجکل کے فیشن کے مطابق بوشرٹ سے ملتا جلتا لباس ہے۔ بلوچ کندھے پر ہمیشہ چادر رکھتا ہے اور سر پر پگڑی باندھتا ہے جس کا نچلا طرّہ چہرہ ڈھانپنے کا کام دیتا ہے۔ دوران سفر بلوچ اپنے چہرے کو عموماً ڈھانپ کر رکھتا ہے تاکہ وہ علاقے کی گرم لُو اور دشمن کی پہچان سے محفوظ رہے۔ اس کے کپڑے جہاں تک ممکن ہو سکتا ہے، سفید رنگ کے ہوتے ہیں کیونکہ وہ رنگدار کپڑوں کو ناپسندیدہ نگاہوں سے دیکھتا ہے۔ اس کی شلوار بھی سفید ہوتی ہے جو بہت ڈھیلی ڈھالی ہوتی ہے۔ تاکہ علاقے کی گرم آب و ہوا کے اثرات سے محفوظ رہے۔ عورتوں کا لباس بھی اسی طرح سے ہوتا ہے۔ تاکہ زنانہ جسم کے نشیب و فراز چھپے رہیں۔

خوراک

بلوچ جس طرح دیگر ضروریات زندگی میں سادگی پسند ہے اسی طرح سے خوراک کے معاملہ میں بھی د
نہایت سادہ واقع ہؤا ہے۔ گوشت، جوار، باجرہ اور گندم اُس کی عام غذا ہے۔ جب کبھی سبزی اور دالیں
میسّر آجایئں تو انہیں رغبت سے کھاتا ہے۔ جب گوشت میسّر نہ ہو تو روٹی کو گُڑ اور گھی میں ملا کر کھاتے ہیں
گندم کے آٹے کی دو تہوں کے درمیان گُڑ کو ریزہ ریزہ کرکے روٹی پکائی جاتی ہے جس کو بُھری کہا جاتا ہے
یہ مرغوب کھانا ہے۔ سفر پر جاتے وقت باجرہ کے آٹے میں گُڑ یا شکر ملا کر روٹی پکالی جاتی ہے جو کیک
یا بسکٹ کی مانند لمبے عرصے تک استعمال کی جاسکتی ہے۔ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑوں کو آگ کے
دو الاؤں کے درمیان لوہے کی سیخوں پر لٹکا کر بھونا جاتا ہے۔ اِس بُھنے ہوئے گوشت کو "سجّی" کہا جاتا
ہے۔ یہ بُھنا ہؤا گوشت کئی روز تک کام میں لایا جاسکتا ہے۔

سجّی کے ٹکڑے بکری اور دُنبے کی سالم ران پر مشتمل ہوتے ہیں۔ دورانِ سفر اگر بلوچ کو توا یا بخوبی (ایچ
کا توا) میسّر نہ آئے تو وہ کاک پکا لیتے ہیں۔ اِس کا طریقہ یہ ہے کہ آگ کا الاؤ ریت پر جلا کر اُس میں گول گول پتھر
کو گرم کرلیا جاتا ہے اور پھر ان کے گرد گوندھا ہؤا آٹا لپیٹ دیا جاتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اُسے انگاروں
پر رکھا جاتا ہے تاکہ بیرونی سطح خشک ہو جائے۔ پھر اس کو الاؤ والی ریت یا انگاروں میں دبا دیا جاتا ہے تھوڑی
دیر میں یہ روٹی اندرونی اور بیرونی حرارت سے پک کر تیار ہو جاتی ہے۔

اگرچہ آج کل دیاسلائی عام دستیاب ہو جاتی ہے مگر کچھ عرصہ قبل پہاڑی علاقوں میں آگ جلانے کے لئے
چقماق جسے بلوچی میں آزگر کہا جاتا ہے' استعمال کیا جاتا تھا۔ کوہستان کی جنگلی کھجور (پیش - مذری) کی جڑوں
سے نرم نرم روئی کی مانند ریشہ حاصل ہوتا ہے جس کو بلوچی میں پھڑن کہتے ہیں۔ اِس روئی کو شورہ کے پانی میں
بھگو کر خشک کرلیا جاتا اور بوقت ضرورت چقماق کے ٹکڑے کے ساتھ رکھ کر فولاد کو زور سے مارتے ہیں
جس سے آگ کا شرارہ نکل کر روئی کو سلگا دیتا ہے۔

فرنیچر

خانہ بدوش گھروں میں کوئی فرنیچر نہیں ہوتا۔ صرف چارپائی ہی زندگی کی لازمی آسائش ہے۔ امراء کے
گھروں میں غالیچے اور قالین استعمال کئے جاتے ہیں۔ ورنہ عوام کے ہاں پیش (پہاڑی کھجور) کی چٹائیاں، کام
دیتی ہیں۔

زیورات

بلوچوں میں ماحول کے مطابق زیورات استعمال کیئے جاتے ہیں ۔ اُن کی بودو باش جن لوگوں کے درمیان ہوتی ہے ۔ عموماً اُن کی طرز کے زیورات اُن میں بھی مستعمل ہو جاتے ہیں ۔ پہاڑی بلوچوں میں مندرجہ ذیل زیورات مروج ہیں :-

(1) بالیاں :- کانوں میں پہننے کا یہ زیور مختلف گولائی کے ہوتے ہیں اور ان کی تعداد بھی حسب استعداد مختلف ہوتی ہے ۔

(2) جھاریاں :- یہ بھی بالیوں کی طرز کا زیور ہے مگر ان میں چھوٹے چھوٹے بُندے لگے ہوتے ہیں ۔

(3) جھلنب :- یہ بالیوں کی خاص قسم ہے جس میں بالی کے ساتھ کئی پان نما اور پھلوں کی مانند کڑیاں مختلف قطاروں میں لٹکتی رہتی ہیں ۔

(4) چوڑیاں اور کنگن

(5) بلو پا :- ناک میں ڈالنے کا زیور ہے ۔

(6) کوکہ :- ہلکا پان نما زیور جس کی ڈنٹھل ناک کے اندر پھنسی رہتی ہے ۔

(7) انگوٹھی :-

(8) دو کی :- گلے کا طلائی زیور جو ایک پان نما ٹکڑے پر مشتمل ہوتا ہے ۔

(9) تعویذ :- گلے میں سونے یا چاندی کے چوکور اور کھوکھلے ٹکڑوں پر مشتمل زیور ہے جس میں تعویذوں کی تعداد تین اور سات کے درمیان ہوتی ہے ۔ یہ ہار کی مانند ناف تک لٹکتا رہتا ہے ۔

(10) چھولو :- بالوں کو سنوارنے کے بعد اپنی جگہ پر برقرار رکھنے کی غرض سے پراندے کی مانند چوٹی سے باندھا جاتا ہے ۔ اس میں رنگ برنگ کے سُوت یا ریشم کے دھاگے استعمال کرنے کے علاوہ چھوٹی چھوٹی کوڑیاں خوبصورت طریقوں سے ٹانکی جاتی ہیں ۔ اس کو لوڈی بھی کہا جاتا ہے ۔

آلاتِ موسیقی

بلوچوں میں دیگر اقوام کے آلات موسیقی مستعمل ہیں مگر نڑ پائنے خالصتاً بلوچی ساز ہے ۔ یہ لمبا بنسری نما ساز ہے جس میں بنسری کی مانند پہلو سے پھونک نہیں ماری جاتی بلکہ بجانے والا اوپر سرے سے پھونک مارتا ہے ۔ اس سے نڑ بجانے والا کسی گیت کی دھُن الاپتا ہے اور اس کا ساتھی اس گیت کے بول سُر ملا کر بولتا ہے ۔

یہ ساز بلوچوں کا مرغوب اور پسندیدہ ساز ہے اور فرصت کے لمحات میں تمام محفل لطف اندوز ہوتی ہے ۔ نڑ

کی سرحدی عموماً قندھار یا اٹک سے آتی ہے۔ نثر کا ایک گیت ملاحظہ ہو جو مری اور انگریز کی جنگ سے تعلق رکھتا ہے۔
انگریزوں نے جب مری قبیلہ پر چڑھائی کی تو مری دلیروں نے دشمن کے مقابلے کی ٹھانی۔ قبائلی رواج کے مطابق چودہ برس سے کم عمر لڑکے وطن کی حفاظت کے لئے شامل جہاد نہ ہو سکتے تھے۔ مری قبیلہ میں علی خان نامی ایک دلیر لڑکا رہتا تھا جسے وطن مقدس کی خاطر جہاد کرنے کا بڑا اشتیاق تھا مگر اُسے کم عمر سمجھ کر مری لشکر میں شامل نہ کیا گیا۔ اور اُسے بتایا گیا کہ جب تک اس کی داڑھی نہیں نکلتی وہ وطن کی حفاظت کرنے والے دستوں میں شامل نہیں کیا جا سکتا۔
غفر خان ایک قبائلی مقدم علی خان کی مخالفت میں پیش پیش تھا۔ علی خان کی جب تمام التجائیں رد کر دی گئیں تو اس نے اپنی زلفوں سے کنگھی نکال کر تپتے رخساروں پر اس زور سے چلائی کہ اس کے دندانے گوشت میں پیوست ہو گئے اور خون نے رس رس کر سرخ داڑھی کی صورت اختیار کر لی۔ علی خان کے ولولہ اور جذبات کی قدر کرتے ہوئے سردار قبیلہ نے اسے جہاد میں شامل ہونے کی اجازت دے دی۔ میدانِ کارزار میں علی خان نے حیرت انگیز دلیری کا ثبوت دیا۔ اور آخر کار قلعہ میں گھس کر انگریز افسر کو قتل کر دیا۔ جب انگریزی لشکر نے جوابی حملہ کیا تو اس نے پسپائی کو غیر موزوں سمجھا اور اپنی جان کو قومی مفاد میں اس طرح سے نثار کیا کہ ؎

در ملک خانی محمد رحمان حسین ترزی

دی کس طرح سے جان تہِ تیغ داغ نے
لب پر تبسم اور نظر یار کی طرف

شاعر نے اس واقعہ کو بلوچی کا جامہ اس طرح پہنایا ہے:۔

لوٹھتیں چندہ جہاناں	(انگریز) نے اطاعت طلب کی
زبل لستائی ورسرا	انہوں نے مجبور کیا
ہوکسو باگھی لغوراں	باقی سردار بزدل ثابت ہوئے۔
گوفتی لبانیں دفا	اطاعت قبول کر کے منہ کالا کیا
ماں جبر تا چندہ نوی آں	(مری نے کہا) میں ہرگز اطاعت قبول نہ کروں گا
باج شے متاسوا	خواہ موت ہی کیوں نہ قبول کرنا پڑے
ماں نوکری ذرہ نہ دراں	میں اس کی ملازمت (اطاعت) نہ کروں گا
ماں کھنانی حرکتا	بلکہ میں اُس سے جنگ کروں گا۔
ماں ھینشو گور کھاں سو کھنانا	اپنے مال مویشی ہانک کر وطن کو خیر باد کہہ کر
کوہلو گوازیں بقو شتغا	کوہلو (صدر مقام) سے آگے نکل جائیں گے
ملے مری ایں میل مچھی	مری اکھٹے ہوئے

بلوچی	اردو
آگری وڈھ سرا	دو وڈھوں کے درمیان رہائش کی
سی ہزار مڑھ مچھ بیسو	تیس ہزار مرد جمع ہوئے
درسریں اسے تھانوا	سریں کے تھانہ پر اُن کا شمار ہوا
آنکو لینٹری نواب خان	لینٹری (قبیلہ) کے سردار نے حال بتایا
حال داسوں تھئی دلی	کہ میں اپنے دل کا راز بتاتا ہوں
کافریں چیھی ہمیشیں	کافروں کا کہنا ہے
شابشکیں کلیں مری	کہ تمام مری یہ سمجھ لیں
یکں سے ہزار تنخواہ دیانو	تمندار کو میں تین ہزار تنخواہ دوں گا۔
نشتگاہ لوسما مدی	جو وہ اپنے گھر وصول کرتا رہے
تھئی چھیاڑھ دہ سالہ چندہ معافوں	چودہ سال تک تم سے کوئی ٹیکس نہیں لیا جائیگا
بھئی بسکو قید لیغیں مری	مری قیدی رہا کر دیئے جائیں گے۔
شا ختو بھاڑی کمن نے	(مری نے جواب دیا) تم بزدل قوم ہو۔
شارلشتو بھاڑ تھئی	تم نے ذلیل معاوضہ (آزادی کے بدلے) قبول کیا۔
ماں مری اسے تفراں اسے شئے	مگر مری کا ارادہ ہے۔
مارشنی بھیگہی	کہ رات کو حملہ کریں۔
میسخ تھئی نیاما قرآنیں	ہمارے درمیان قرآن کی قسم
تھادے حالاعذی	کہ یہ راز افشا نہ کرنا
کافرا مہل نولسیو تو پکے زوراجسائی	کافر چھپ چھپ کر فائر کرنے لگے
کافرے سرکار گلیالبسکو بے وارسے مشین	کافروں نے دھڑا دھڑ مشین گن چلائی
نے کھفتو خیر دیں نہکانی	خیر دین نہکانی مارا گیا
کہ جنگ بلوچیں کھٹتئ	جنگ بلوچوں سے جیت لی
گشتی ان منو ھڈا چھڑا ایتں	کہا کہ اب میں ھڈا (گولی بے اثر کرنے کا عمل) سے فارغ ہوں یعنی عمل جھاڑ پھونک کے قابل نہیں رہا
شار اختیار یں یا دسی	اب تم اپنی مرضی کے مالک ہو
بیا گر مدو خیس علی خان	اے علی خان اب تمہارے عمل کا وقت ہے
کہ زخم ہکلیں تفوی	کیونکہ تمہاری تلوار کی دھاک دُور دُور تک ہے

کافرادکی ردناناں	علی خان نے کئی کافروں کو تہ تیغ کیا
دریس دربیا ماجساگی	علی خان خوشی سے انگریز کو خیمہ میں قتل کرنے گیا
کھشخاں گورا مائیں مھٹیں	گورے کا قتل میرا کارنامہ ہے
بنواں ہقی مڑھے کھتی دسی	کوئی اور اس کا دعویٰ نہ کرے
گشتی کافریں لوٹپی ہملیشیں	اور ٹوپی (ہیٹ) کو پھینک کر کہا کہ یہ کافر کی ہیٹ ہے
بوسرا دی جعفرا	اب یہ جعفر خان کے سر پر رکھو
گوشں تھانہاں اٹا مڑدانے جنے	مرد کو پھر ایسی بات نہ کہنا
شے گنبذ روشا پھدا	گبنذ کی جنگ کے بعد
گونتری آدے سلاما	میرے محبوب (وطن) کو سلام کہنا
شیبیری گرڑ دغ لوی	اب میرا واپس آنا مشکل ہے۔
ارما شیبری گرڑ داں پھدا	اب اگر تکمیل مقصد کے بغیر آؤں
مناں تھانہاں شیغول مری	تو مری مجھے طعنہ دیں گے

آلاتِ موسیقی میں سارندہ کا استعمال بلوچوں میں بہت زیادہ ہے جس پر فولادی تار لگے ہوتے ہیں۔ یہ ساز عام طور پر میراسی اور ڈوم استعمال کرتے ہیں۔ اور توہم پرست لوگوں کے آسیب دُور کرنے کے لئے سب سے موزوں ساز تصوّر کیا جاتا ہے۔ آسیب زدہ کو آگ کے الاؤ کے قریب بٹھایا جاتا ہے۔ مریض پر عمل کرنے سے پہلے اُسے خوب عطر یا خوشبودار تیل لگایا جاتا ہے اور حرمل و لوبان کی دھونی دی جاتی ہے۔ پھر سارندہ والے دھیمے دھیمے سروں سے شروع ہو کر آہستہ آہستہ بلند ہونی شروع ہو جاتی ہے اور پھر ایک خاص دُھن بجائی جاتی ہے جس کے متعلق ان لوگوں کا اعتقاد ہے کہ آسیب زدہ انسان سر دھننے اور مافوق الفطرت حرکات کرتا ہے۔ سارندہ کی آواز کے ساتھ مریض سانپ کی مانند مست ہو کر سر جھٹکنے لگ جاتا ہے اور پھر بھوپا (عامل) کے پوچھنے پر مریض بیماری اور جن کے حملے کی وجوہات بتاتا ہے۔ ان کو رفع کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اکثر و بیشتر مریض محض مکر و فریب اور رُعب بازی کی خاطر یہ ڈھونگ رچاتے ہیں تاکہ لوگوں میں اُن کا وقار بڑھ جائے اور من مانی کارروائیاں کر سکیں۔ وہ عورتیں جن کے خاوند اُن کی قدر و منزلت اور خواہشات کا احترام نہیں کرتے عموماً یہ سوانگ بھر کر انہیں مرعوب اور خوفزدہ کرتی ہیں اور معمولی سنگی اور ناچاقی پر اس حربے کا پورا پورا فائدہ اٹھایا جاتا ہے۔

بیوقوف، اور توہم پرست خاندان بھی اس جھانسے میں آجاتے ہیں اور اُن کی تمام خواہشات کو پورا کرنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں۔ بعض حقیقی امراض مثلاً ہسٹیریا وغیرہ میں فی الحقیقت مریض پر تشدد بھی کیا جاتا ہے جس کو صحیح معنوں میں علاج کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس قسم کی متشدد کاروائیوں سے بے چارے مریض کی موت بھی واقع ہو جاتی ہے اور عزیز و اقارب خاموش تماشائی بنے رہتے ہیں۔ مریض کی آہ و زاری پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ تشدد صرف جن پر ہو رہا ہے۔ اور مریض کے جسم پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑتا جو حقیقت سے کوسوں دور کی بات ہے انسان کی آفرینش کے ساتھ ہی قدرت نے دکھ درد اور بیماریاں بھی انسان کے ساتھ وابستہ کردیں۔ بنی نوع انسان نے بھی اپنی تکالیف کو کم کرنے کی غرض سے مختلف جڑی بوٹیوں سے اُن کا مداوا کیا۔ جب دنیا کی مختلف اقوام ذرائع آمد و رفت کی سہولتوں کی نایابی سے اپنے حالات اور جغرافیائی حدود میں محدود تھیں۔ تو انہوں نے اپنے گرد و پیش اور ماحول کے مطابق طریقِ علاج کا انتخاب کیا۔ بلوچ چونکہ صحرائی اور پہاڑی قوم تھی۔ لہذا انہوں نے اُن پودوں سے کام لیا جو اُن کے علاقوں میں اُگتے تھے۔ اور اُن کا طریقِ علاج طب یونانی کی مانند جڑی بوٹیوں پر مشتمل ہے۔

اس کے علاوہ بلوچ جس طریقِ علاج کا سب سے زیادہ قائل ہے، وہ ہے ذبح کئے ہوئے جانور کی گرم گرم کھال مریض کو پہنانا۔ اس طریقِ علاج میں مختلف بیماریوں کے لئے مختلف جانور منتخب کئے جاتے ہیں۔ بلوچی حکیم کے مشورہ پر مریض کو بکری، دُنبہ، بھیڑ یا ہرن کی کھال تجویز کی جاتی ہے۔ تشخیص مرض کے مطابق اِن جانوروں کی نسل اور رنگت میں بھی انتخاب کیا جاتا ہے۔ سرخ رنگ کی بکری گرم مزاج مریض کے لئے مفید تصوّر کی جاتی ہے۔ موسم سرما میں عام طور پر دُنبہ کی کھال استعمال کی جاتی ہے۔ سانپ کے ڈسنے پر بھی کھال کے طریقہ علاج کو استعمال کیا جاتا ہے کیونکہ کھال کے پہننے سے پسینہ بکثرت آتا ہے اور اُن کا یقین ہے کہ زہریلے مواد کو کھال جذب کر لیتی ہے۔ علاوہ ازیں نفسیاتی لحاظ سے بھی انسان خدا کی امداد اور رحمت کا امیدوار بن جاتا ہے کیونکہ جانور کا گوشت فی سبیل اللہ غرباء میں تقسیم کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح سے نہ صرف علاج ہو جاتا ہے۔ بلکہ غریبوں کے لئے صدقہ اور خیرات کی گنجائش بھی نکل آتی ہے۔

جڑی بوٹیوں کے علاوہ تپدق جیسے مرض کے لئے گدھی کا دودھ مریض کو پلاتے ہیں جس سے مریض شفایاب ہو جاتا ہے۔ پہاڑی علاقہ کے بلوچ زمانہ قدیم سے چیچک کے ٹیکے سے واقف ہیں اور اسے استعمال کرتے تھے۔ اس کا ذکر لالہ حکم چند نے تواریخ ڈیرہ غازی خان میں بھی کیا ہے۔ اُن کا ٹیکہ اگرچہ آج کل کے ٹیکہ کی مانند باقاعدہ سیرم پر مشتمل نہیں ہوتا تھا مگر دونوں کا عمل تقریباً یکساں ہی ہے۔ جب تک بلوچوں کو آج کل کے طریقِ علاج کی سہولت میسر نہ تھی۔ تو وہ چیچک کے زخم پر پیدا شدہ کھرنڈ کو محفوظ کر لیتے تھے اور چیچک کی وبا کے ایام

سے قبل ان کھرنڈوں کو بھگو کر چاقو سے پیدا کردہ خراشوں پر باندھ دیا جاتا۔ یہ خراشیں عموماً بازو پر لگائی جاتی تھیں۔
بلوچوں میں داغنا بھی مروّج رہا ہے۔ مختلف بیماریوں میں مختلف اعضاء پر عمل کیا جاتا ہے۔ مثلاً زیح اور گھٹیا کے مریض کو ریڑھ کے نچلے حصّہ پر اور سرسام کے مریض کو ابرو کے درمیان ناک کے اُوپر داغ دیا جاتا۔ آنکھوں کی بعض امراض میں تالو اور کنپٹی پر داغ دیا جاتا ہے۔

فصد کھولنا اور سنگیاں لگوانا بھی اُن لوگوں میں مروج ہے۔ سانپ ڈسنے پر بعض مقامات کا عموماً اور سانپ کے ڈسنے کی جگہ سے خصوصاً خون خارج کیا جاتا ہے۔ عام طور پر ایک خاص قسم کا کدّو خون نکالنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ اِس کدّو کی لمبی گردن ہوتی ہے۔ جب خون نکالنا مقصود ہوتا ہے تو اس کدّو میں خاص مقدار میں مونج وغیرہ رکھ کر آگ سلگائی جاتی ہے۔ جب آگ سے اچھی طرح سے شعلہ نکل آتا ہے تو ہوا گرم ہو کر پھیل جاتی ہے۔ ڈسنے کے مقام پر کدّو کا منہ رکھ دیا جاتا ہے اور آگ آکسیجن کے ختم ہونے کی وجہ سے بُجھ جاتی ہے۔ کدّو کے اندر والی ہوا ٹھنڈی ہو کر سُکڑتی ہے تو دباؤ کی وجہ سے وہ زخم سے خون کھینچ لیتی ہے۔ کدّو لگانے سے پہلے اس مقام پر چاقو یا بلیڈ سے خراشیں لگا کر ہلکی سی پرت گُندھے ہوئے آٹے کی لگادی جاتی ہے تاکہ انگارے سے جسم نہ جلے۔

ضعیف الاعتقاد طبقہ پیروں، فقیروں اور گنڈہ تعویذ پر بہت زیادہ اعتقاد رکھتا ہے جو علاج کی بجائے دم و دُعا پر تکیہ کرتے ہیں۔ وہ ہر عارضہ کا علاج پیروں، فقیروں اور خانقاہوں پر چڑھاوے چڑھانا سمجھتے ہیں۔ اس عقیدہ کی بناء پر ہر جگہ خانقاہیں بنی ہوئی ہیں جن کے متولی لوگوں کی خیرات اور عطیات پر عیش کرتے ہیں۔ گونکی دسکی لکھتے ہیں کہ "سندھ میں پیر اپنے مریدوں سے اُن کی کل آمدنی کا آٹھواں سے نصف حصّہ تک وصول کرتے تھے حتیٰ کہ بعض پیروں کی آمدنی 1834ء میں چار لاکھ روپے سالانہ تک تھی"۔

جبکہ ستر سیر گندم کی قیمت صرف ایک روپیہ تھی۔ چونکہ یہ آسانی سے ہاتھ آنے والی آمدنی تھی لہذا اگر وہاں حقیقتاً کسی بزرگ کی قبر نہ بھی ہو تو کسی فرضی پیر کی قبر تیار کر لیتے ہیں اور عوام میں افواہ پھیلا دیتے ہیں کہ انہیں خواب میں پیر کی طرف سے بشارت ہوئی ہے کہ اُن کا دفنہ فلاں مقام پر تیار کیا جائے۔ اِس طرح سے اچھی خاصی آمدنی کا ایک ذریعہ پیدا کر لیتے ہیں۔ بلوچ عوام میں سخی سرور، پیر سبھری، زندہ پیر اور شہباز قلندر کی خانقاہیں خاص عقیدت کا مرکز ہیں۔ عوام میں جن، بھوت اور نظر بد کے حملے کا عام چرچا ہے۔ عورتوں میں یہ عام خیال پایا جاتا ہے کہ بعض عورتیں کسی معجزاتی طور پر دوسری عورتوں کے مکھن کو اپنی ماٹی میں بلوتے وقت کھینچ لیتی ہیں۔ لہذا حفظِ ماتقدم کے طور پر کوئی سیاہ چیز اور

خنجر ماں کے قریب رکھ دیا جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ جس عورت پر شک ہو اُس سے پہلے یا بعد دہی کو بلویا جاتا ہے۔ بلوچ بڑی کثرت سے شگون کے بھی قائل ہیں ۔

علم نجوم

بلوچوں میں دیگر اقوام کی مانند مختلف طریقوں سے پیش گوئی کا رواج ہے ۔ بلوچوں نے علم نجوم اپنی ہمسایہ اقوام سے بھی حاصل کیا ۔ مگر اُن کے ہاں خالص بلوچی طرز پیش گوئی بھی ہے ۔ جس کو وہ " ہنجھڑی " دیکھنا کہتے ہیں ۔ علم دست شناسی کی طرح اُن میں اعتقاد ہے ۔ کہ مستقبل کے واقعات کا اندازہ بھیڑ اور بکری کے پٹھے کی ہڈی کی لکیروں سے لگایا جاسکتا ہے ۔ اِس ہڈی کی لکیروں سے خوشی ، غمی ، جنگ ، بارش ، سیلاب ، باد و باراں ، قبائل کی آسودگی اور دیگر حالات کا اندازہ لگایا جاتا ہے ۔ بلوچوں کا یہ طریق کار کئی اور اقوام مثلاً ہنوں ۔ چینی اور منگول میں بھی مروّج تھا ۔ عہد قدیم میں ہن زمین میں گڑھی ہوئی تلوار کی پوجا کرتے اور اس کی سالانہ پوجا بطور تہوار منائی جاتی تھی ۔

اِس موقعہ پر ایندھن کا ایک بہت بڑا ڈھیر مربع صورت میں تیار کیا جاتا جس کا ہر ضلع تین سو گز ہوتا تھا ۔ یہاں پر نو مختلف قسم کے جانوروں کی قربانی دی جاتی تھی جن میں انسان بھی شامل ہوتا تھا ۔ انسان کے کندھے اور بازو کو کاٹ کر اُسے تڑپتا ہُوا اچھالا جاتا ۔ اور وہ جس پہلو پر اُن لکڑیوں پر گرتا اُس سے آئندہ کے واقعات کا اندازہ لگایا جاتا ۔ انتڑیوں اور بازو کی ہڈیوں کو صاف کر کے بھی پیشگوئی کا طریقہ مروج تھا ۔ اور اسی طریقہ سے ہنوں کے نامور سردار ایٹلا نے 450ء میں اپنی فتح کی پیشگوئی کی تھی ۔ جب وہ شہنشاہ روم کے لشکر کا مقابلہ کر رہا تھا ۔[1]

بلوچوں کی مانند کندھے کی ہڈی سے چینی بھی پیشگوئی کا کام لیتے تھے ۔ اور اس پر کتابت بھی کی جاتی تھی ۔ پیشگوئی کے لئے اِس ہڈی پر ایک چھوٹی سی نالی بنائی جاتی ۔ اور پھر ہڈی کو آگ پر گرم کیا جاتا ۔ گرمی سے اس نالی سے جو دراڑیں پھوٹتی اُن سے خاص معنی اخذ کئے جاتے تھے ۔[2]

(1) Decline and fall of Roman Empire vol. III P. 347 E. Gibbon

(2) East Asia vol. II P. 45 P. 386 E. O. Reischauer & J. K. Fairbank

بالوں کی وضع قطع

قدیم زمانے سے بلوچوں میں سر پر لمبے بال رکھنے کا رواج رہا تھا ۔ اور اب بھی قبائلی اور دیہاتی بلوچ سر پر لمبے بال رکھنے پر فخر محسوس کرتا ہے ۔ میر نصیر خان اعظم بھی سر پر لمبے بال رکھتا تھا ۔ مگر بعد میں ان کو کٹوا دیا ۔ بعض نوجوان مردوں میں یہ بال کئی لٹوں میں تقسیم کر لئے جاتے ہیں ۔ اور ہر لٹ کو سرکنڈے پر لپیٹ کر خشک کر لیتے ہیں ۔ جس سے ہر لٹ ایک کھوکھلی نلکی کی صورت اختیار کر لیتی ہے ۔ تاہم اکثر لوگ اپنی لمبی زلفیں پیٹھ پر ڈال لیتے ہیں یا ان کو اکٹھا کر کے گردن

کر پیچھے پگڑی میں لپیٹتے ہیں جیسا کہ ایران کے قدیم کتبوں میں نظر آتا ہے ۔ اس سے بالوں کے بکھرنے کا احتمال نہیں رہتا ۔ بلوچ کے نزدیک ڈاڑھی، پگڑی اور مرد اور کے سر کی قسم بہت بڑی قسم ہے لہذا کسی بلوچ کی پگڑی اتارنا یا ڈاڑھی نوچنا بہت بڑی گستاخی سمجھا جاتا ہے ۔

بعض قبائلی مقدمات میں ڈاڑھی نوچنا قتل کے معنی میں بھی لیا گیا ہے اور مجرم کو خون بہا ادا کرنا پڑا ۔ اکثر و بیشتر نوجوان شرعی طرز کی ڈاڑھی رکھتے ہیں اور کچھ لوگ طویل ڈاڑھیاں رکھتے ہیں ۔ بلوچوں میں یہ خیال عام پایا جاتا ہے کہ اگر ایسے مرد کی ڈاڑھی جس کو کبھی بھی کاٹا نہ گیا ہو، پانی میں ڈبو کر درد زہ میں مبتلا عورت کو پلا دیا جائے تو بچے کی پیدائش سہولت سے ہو جاتی ہے ۔ طویل ڈاڑھی کے بال کئی لوگ کھلے رکھتے ہیں مگر بعض قبائل میں سکھوں کی مانند ٹھوڑی اور کلوں پر دھاگے سے باندھ کر جلد کے ساتھ چپکا لیتے ہیں ۔ مزاری قبیلے میں عموماً اس طرز کی ڈاڑھی نظر آتی ہے ۔

بعض بلوچ خواہ وہ سر پر لمبے بال رکھیں یا چھوٹے تالو کے بال اُسترے سے منڈواتے ہیں ۔ اس رواج کی حقیقت کا علم نہیں تاہم یہ بھی ایک رواج رہا ہے ۔ ہندو بھی تالو کے بال منڈواتے تھے تاہم اس میں ان کے عقیدہ کا دخل تھا ۔ ہندو عقیدہ کے مطابق روح کے نکلنے کے لئے دس جگہیں ہیں ۔ البتہ امراء، بادشاہ اور نیکو کار لوگوں کی روح تالو سے نکلتی ہے اور روح کے نکلنے پر رعد کی مانند کڑک ہوتی ہے ۔ یہ کڑک نجات اور سعادت کی نشانی سمجھی جاتی تھی اور تناسخ کے عقیدے کے مطابق اب روح کسی مقتدر بادشاہ کے جسم میں حلول کرے گی ۔

ناچ اور کھیلیں

(۱) منتخب التواریخ ملا عبدالقادر بدایونی ترجمہ محمود احمد

بلوچوں میں جھومر سب سے زیادہ مرغوب ناچ ہے اور اصلیت کے لحاظ سے بھی یہ خالص بلوچی ہے ۔ اس ناچ میں مرد ایک دائرہ کی صورت میں کھڑے ہو کر ڈھول کی تھاپ پر رقص کرتے ہیں ۔ ہر فنکار ناچ کے ساتھ ساتھ دائرہ میں آگے بھی بڑھتا جاتا ہے ۔ یہ رقص شادی بیاہ اور خوشی کے موقعوں پر رچایا جاتا ہے ۔ ڈھول والا اس دائرے کا مرکز ہوتا ہے ۔ رقص کے دوران خاص خاص فنکار وقفہ وقفہ کے بعد دائرہ سے نکل کر ڈھول والے کے قریب دھمال کا مظاہرہ کرتا ہے اور مراسی (ڈھول والا) اس رقص یا دھمال کے مطابق اپنے ساز سے سُر تال نکالتا ہے ۔ اس خاص موقعہ کے ناچ کو بلوچی میں "تروڑا" کہا جاتا ہے ۔ جھومر کی کئی قسمیں ہیں مگر سب سے پسندیدہ رقص کو زہم ناچ یا رقص تلوار کہا جاتا ہے جس میں ناچنے والے تلواریں ہاتھ میں لے کر تیغ زنی کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔

بلیاٹ د میدانی بلوچوں میں بڑا مرغوب کھیل ہے ۔ اس میں کھلاڑی دو گروہوں میں بٹ جاتے ہیں ۔ ایک گروہ دائرہ کے اندر کھڑا ہو جاتا ہے اور دوسرا گروہ اُن کے ارد گرد پھیل کر محصورین میں سے کسی کو ہاتھ لگا کر دائرہ سے

نکل جانے کی کوشش کرتا ہے ۔ اگر حملہ آور ہاتھ لگا کر دائرہ سے نکل جانے میں کامیاب ہو گیا تو محصورین ؛ وہ آدمی کھیل سے نکل کر دائرہ سے باہر بیٹھ جائیگا ۔ دائرہ کے اندر والا فریق بھی کوشش کرتا ہے کہ ہاتھ لگانے والا جانے نہ پائے اور اسے اس طرح سے قابو کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ دائرہ سے باہر نکل نہ سکے ۔ اس طرح سے جس فریق کے تمام کھلاڑی بیٹھ جاتے ہیں ۔ (کھیل میں "مارا گیا" کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے) وہ ہار جاتا ہے اور دوسرے فریق کو فاتح قرار دیا جاتا ہے یہ کھیل دراصل جنگجو فطرت کا پُرامن مظاہرہ ہے ۔ اس کھیل میں انہوں نے فرصت کے لمحات کو قلعوں پر دھاوے بولنے اور مدافعت میں صرف کرنے کی کوشش کی ہے ۔

ہسست یا تلیاں میدانی بلوچوں میں بہت مقبول کھیل ہے ۔ اس میں ایک ایک جوڑی کھلاڑیوں کی حصہ لیتی ہے ۔ دونوں کھلاڑی لنگوٹ کس کر ایک دوسرے سے ہاتھ ملاتے ہیں اور باہمی رضامندی سے ایک کھڑا رہتا ہے جبکہ دوسرا اس کے گرد ایک آدھ چکر لگاتا ہے اور پھر اس کے مقابل کھڑا ہو کر اس کے سینہ پر ہاتھ رکھ کر کہتا ہے " شاباش اسے " جس کا مطلب ہے کہ آؤ اب کھیل شروع کریں ۔ اور اُلٹے پاؤں دوڑنا شروع کر دیتا ہے ۔ اس کا مقابل بھی سینہ تانے اس کی طرف دوڑتا ہے ۔ اور اُسے موقع دیتا ہے کہ اُس کے سینہ پر جچا تلا بھرپور ہاتھ مارے ۔ جب اُلٹے پاؤں دوڑنے والا اپنا وار کرتا ہے ۔ تو دوسرے کا فرض ہے ۔ کہ سینہ پر ہاتھ پڑنے کے بعد اُسے قابو کر لے ۔ اگر اُس نے اپنے مدِمقابل کا ہاتھ مضبوطی سے اپنی گرفت میں لے لیا تو وہ ایک نمبر جیت جاتا ہے ۔ اس طرح سے ہر ایک کو تین تین دفعہ ہاتھ مارنے کا موقع دیا جاتا ہے اور زیادہ نمبر حاصل کرنے والے کو کامیاب کھلاڑی تسلیم کر لیا جاتا ہے ۔

شادی بیاہ کے موقعوں پر بندوق سے نشانہ بازی کا مقابلہ ہوتا ہے ۔ ایسے موقعوں پر نیزہ بازی کا مظاہرہ بھی کیا جاتا ہے ۔ کامیاب کھلاڑی کے سر پر دستارِ فضیلت باندھی جاتی ہے ۔ دیگر اقوام کی مانند کشتی ، وزن اٹھانا ، کبڈی اور دیگر کھیلیں بھی بلوچوں میں مروج ہیں ۔

عید اور میلے

عام مسلمانوں کی مانند بلوچ بھی دونوں عیدیں مناتے ہیں البتہ عیدالاضحیٰ سے ایک روز قبل ایک اور قربانی کی جاتی ہے جس کو بلوچی زبان میں پھینینغ یعنی مردوں کی خیرات کہا جاتا ہے ۔ یہ قربانی بہترین جانور ذبح کر کے ادا کی جاتی ہے اور سورج ڈھلنے اور غروب کے درمیانی وقفہ میں جانور کو ذبح کیا جاتا ہے ۔ اس قربانی کا مقصد اپنے آباؤ اجداد کی روحوں کو ثواب پہنچانا ہے " تاکہ مُردے زندوں کی خوشی کے موقع سے پہلے اس قربانی سے آرام پائیں ۔ میلے پیروں ، فقیروں اور اولیاء کرام کے عرسوں پر لگتے ہیں ۔ جن میں تفریح کا سامان بھی پیدا ہو جاتا ہے ۔

شادی بیاہ

بلوچ لڑکی کا رشتہ دینے کے معاملہ میں حد سے زیادہ قدامت پسند واقع ہُوا ہے اور وہ حتی الامکان اپنی بیٹی غیر بلوچ کو رشتہ میں نہ دے گا۔ بلوچی تاریخ ایسے سینکڑوں واقعات سے پُر ہے کہ بلوچ نے بڑے بڑے شہنشاہوں کو بھی اپنی لڑکی کا رشتہ دینے سے انکار کر دیا خواہ اس انکار کی قیمت اُن کو اپنے خون سے ادا کرنا پڑی۔ بلوچی روایات کی رُو سے انہوں نے بدرالدین کو رشتہ دینے سے انکار کر کے بے وطن ہونا قبول کیا مگر اپنی قومی روایات کو ٹھیس نہ لگنے دی۔

خاندان کلہوڑہ کے وزیر اعظم میر بہرام خان نے اپنے حاکم اور بادشاہ میاں سرفراز خان کو لڑکی کا رشتہ دینے سے انکار کر کے نہ صرف اپنی جان پر کھیل گیا بلکہ کئی نامور بلوچ سردار بھی کلہوڑوں کے ہاتھوں دھوکہ سے مارے گئے۔ اس خونیں باب کے کھلنے کی بدولت سندھ کی حکومت کلہوڑوں سے نکل کر بلوچوں کے ہاتھ آگئی۔ ریاست بہاولپور کے حکمران نواب صادق محمد خان ثانی نے ۱۸۰۹ء میں اپنے وزیر اعظم نصیر خان گورگیج سے لڑکی کا رشتہ طلب کیا تو اس نے صاف انکار کر دیا جس کے نتیجہ میں خاندان گورگیج تباہ ہوگیا مگر اپنی روایات پر حرف نہ آنے دیا۔

صادق محمد خان ثانی نے نصیر خان کو دھوکہ سے قتل کرا دیا جس کے بدلہ میں بلوچوں نے "اپنی مستورات کو قتل کر کے کنوئیں میں ڈال دیا۔ سامان و مکانات کو جلا کر خاک کر دیا۔ اور جواہرات کو چکی میں پسوا کر ناکارہ کر دیئے گھوڑوں کے پاؤں کی رگیں کاٹ کر اُن کو بھی بے کار کر کے تلواروں سے مسلح ہو کر حملہ آور ہوئے۔"[1] اور اپنی آن پر فدا ہو گئے۔

بہادر شاہ اوّل کے عہدِ حکومت میں اگرچہ سلطنت مغلیہ کی وہ پہلی سی آب و تاب نہ رہی تھی مگر پھر بھی وہ شہنشاہ ہند تھا اور اس کی سلطنت ظاہری طور پر بڑی مضبوط تھی، مگر جب اُس نے سردار بہلول خان سے لڑکی کا رشتہ مانگا تو اُس نے شہنشاہ ہند کی اس خواہش کو نتائج سے بے پرواہ ہو کر ٹھکرا دیا۔ اگرچہ اس ٹکر میں بہادر گڑھ اور بلوچ پورہ (نزد دہلی) کے بہادروں نے کافی جانی نقصان اُٹھایا۔ مگر اپنی روایات کو پھر بھی برقرار رکھا۔ مٹھی بھر بلوچوں نے مدت تک سلطنت دہلی کی افواج کا قافیہ تنگ کئے رکھا۔ بہادر شاہ جب فوجی طاقت سے اُن پر قابو نہ پا سکا۔ تو سازش کے ذریعے اُن پر کامیابی حاصل کی۔

بلوچ رشتہ ناطہ عموماً اپنے قریبی رشتہ داروں میں ہی کرتا ہے۔ اور سب سے نزدیکی رشتہ دار کو دیگر رشتہ داروں پر ترجیح دی جاتی ہے۔ البتہ جب کوئی عورت زنا کا ارتکاب کرے۔ یا اُس کا چال چلن شک میں پڑ جائے تو اسے برادری سے دور کسی دیگر قبیلہ میں فروخت کر دیا جاتا ہے بشرطیکہ اس کی جان بچ جائے ورنہ عام طور پر زنا کی صورت میں

(۱) صبح صادق، ص ۹۷ عزیز الرحمٰن: عزیز

مرد قتل کر دیا جاتا ہے اور عورت کو زہر بحکم خود کشی کرنا پڑتی ہے۔ اب جبکہ قبائلی نظام کمزور ہو چکا ہے، ایسی عورت کو قبیلہ سے باہر فروخت کر دیا جاتا ہے مگر یہ کوشش ضرور کی جاتی ہے کہ وہ غیر بلوچ قوم میں نہ جائے۔ قریبی رشتہ داروں میں بھی عموماً وٹہ سٹہ کی شادی ہوتی ہے۔

منگنی

جب لڑکی اور لڑکے کے والدین رشتہ پر رضامند ہو جاتے ہیں تو لڑکی والوں کو سرخ رنگ کپڑوں کا جوڑا دیا جاتا ہے جو منگنی کی علامت ہے۔ اس تقریب پر حسب توفیق مٹھائی یا گڑ تقسیم کیا جاتا ہے۔ منگنی کے معاملہ میں لڑکے اور لڑکی کی رائے کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ والدین اپنی مرضی ٹھونس دیتے ہیں جس کی وجہ سے بے جوڑ شادیوں سے خطرناک سماجی نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ بعض دفعہ وٹہ سٹہ میں کسی لڑکی کے نکاح میں یہ شرط بھی رکھ دی جاتی ہے کہ اس شادی سے جو پہلی لڑکی پیدا ہوگی وہ فلاں کے بیٹے کی بیوی بنے گی۔ اسے لافی بازو کہا جاتا ہے۔ انگریزوں کی حکومت کے ابتدائی دور میں اسے قانونی حیثیت حاصل تھی۔

رسوم شادی

شادی کے موقع پر ڈوم مہمانوں کو اطلاع کر دیتا ہے اور شادی کی رسومات ادا ہونے پر دولہا کو تحائف دیئے جاتے ہیں۔ قریبی رشتہ دار دلہن کو بھی پارچات اور برتنوں کی صورت میں تحفے تحائف دیتے ہیں۔ پہاڑی بلوچوں میں نیوتا کا رواج بہت کم ہے البتہ میدانی لوگ نیوتا وصول کرتے ہیں جو ایک قسم کی امداد برائے اخراجات شادی ہوتی ہے۔ نکاح کے بعد کھیلوں کا مظاہرہ کیا جاتا ہے اور بندوقوں سے نشانہ بازی کی جاتی ہے۔ جب تک قبائلی نظام پوری قوت سے موجود تھا تو تمندار کی شادی کے موقعہ پر قبائلی لوگ سردار کو دنبہ، گائے یا نقدی کی صورت میں نذرانہ دیا کرتے تھے مگر اب اس کا رواج بہت کم ہو گیا ہے۔ لڑکے والے لڑکی کو زیورات اور ملبوسات دیتے ہیں۔ دلہن کے والدین اسے جہیز دیتے ہیں۔ امیر زیادہ جہیز دیتے ہیں مگر عوام جن کی مالی حالت زیادہ جہیز دینے کے قابل نہیں ہوتی وہ حسب ذیل اشیا ضرور دیتے ہیں۔

(۱) شیخن :- ایک قسم کا کپڑا جس پر شیشے رکھ کر آٹا پیسا جاتا ہے۔

(۲) لشکا :- ایک ادنیٰ تھیلا جس میں دوران سفر و حضر کپڑے وغیرہ رکھے جاتے ہیں۔

(3) تودا :- پیش (پہاڑی کھجور) کے پتوں سے بنا ہوا خیمہ جو حسب ضرورت ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جا سکتا ہے۔

(4) تھال :- آٹا گوندھنے کے لئے۔

(5) کٹورے :- جن کو بلوچی زبان میں کھدھا کہا جاتا ہے۔

(6) گڑوا :- وضو کرنے کا برتن

(7) جھقر :- آٹا پیسنے کی چکی

(8) دودھ دینے والا جانور :- یہ حسب استطاعت بکری، گائے یا بھینس ہوتی ہے۔ بلوچ دلہن شادی کے تیسرے روز اپنے والدین کے گھر ملنے کے لئے جاتی ہے۔ اس کو ستو آڑا کہا جاتا ہے۔

پیدائش

بچے کی پیدائش پر اس کے کان کے قریب آہستہ آہستہ اذان دی جاتی ہے۔ اور پھر گھٹی اس کے منہ میں ٹپکا جاتی ہے۔ اگر وہ لڑکی ہے تو جھنڈ یا کیکر کا کوئلہ رگڑ کر اور اس میں جنگلی ہرن، ہڑ بال یا مار خور کے پتے کو پانی میں حل کر کے پلاتے ہیں۔ ان اجزا کو شامل کر کے وہ خیال کرتے ہیں۔ کہ بچی ان کی مانند مضبوط، چست و چالاک اور ہنر مند ہو گی۔ البتہ لڑکے کی پیدائش پر کوئی مرد رشتہ دار اپنی انگلی کو تلوار سے تھوڑا سا چیر دے کر خون کو مندرجہ بالا گھٹی میں شامل کر دے گا۔۔ اور اسے تلوار کی نوک پر ٹپکا کر بچے کے منہ میں ڈالے گا۔ بعض اوقات اس میں گدھے کا تھوڑا سا خون بھی شامل کیا جاتا۔

ان ٹوٹکوں کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لڑکا ہرن کی طرح چست اور میدان جنگ میں گدھے کی طرح اڑ جانے والا ہو۔ اس کی موت اپنے بستر پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر نہ ہو۔ بلکہ اپنے دلیر آباؤ اجداد کی طرح میدان کارزار میں جان دے اور دشمن کو کبھی اس کی پیٹھ دیکھنے کا موقع نہ ملے۔ اب یہ طریق کار کم ہوتا جا رہا ہے۔

بعض بلوچی گھرانوں میں جب لڑکا پیدا ہوتا ہے۔ تو اس کی ماں اور دوسرے لواحقین رب العزت سے دعا مانگتے ہیں۔ کہ وہ بڑا ہو کر تلواروں کے سائے تلے شجاعت، استقلال اور عزت سے جان دے۔ تاکہ بلوچ قوم کا نام ہمیشہ سر بلند رہ سکے۔ ایک بلوچ ماں اپنے دائیں ہاتھ کی چھوٹی انگلی سے خون کے چند قطرے نکال کر بچے کے منہ میں ٹپکاتی ہے۔ اور کچھ اس کی گردن پر بھی مل دیتی ہے۔ اور ساتھ ہی کہتی جاتی ہے:

"میرے بچے صرف تلوار کی موت سے میرے دودھ کا حق ادا ہو سکے گا۔
جس میں عزت اور بہادری دونوں موجود ہوں گا۔"

بچے کی پیدائش کے چھٹے روز اس کا نام رکھا جاتا ہے۔ پہلا بیٹا ہونے کی صورت میں عام طور پر دادا کا نام رکھا جاتا ہے۔ ورنہ عام بلوچی نام دیا جاتا ہے۔ ساتویں روز خیرات کی جاتی ہے جس کو ششکان کہا جاتا ہے۔

---

(1) تاریخ بلوچستان ص 34 میر محمد خان لہڑی

بلوچ قبیلہ مگسی میں پیدائش کے وقت رسم گھڑی گھڑولا کو منایا جاتا ہے ۔اس رسم میں بچے کی پیدائش کی چھٹی رات کو جشن منایا جاتا ہے اور تمام مرد عورتیں ساری رات جاگ کر گذارتے ہیں۔ عورتیں سہرے گاتی ہیں۔ چودھویں رات کو ضیافت کی جاتی ہے جس میں معزز ترین فرد خاندان سے درخواست کی جاتی ہے کہ بچے کو ہنگھوڑے میں لٹا کر جھولا دے۔ بچے کے والدین چودہ سیر یا چودہ چھٹانک گڑ تقسیم کرتے ہیں اور بچے کو نزدیک ترین چشمہ یا کنویں پر لے جاتے ہیں۔ جو شخص وہاں موجود ہو اُسے کچھ رقم دے دیتے ہیں۔

اس رسم کے متعلق روایت ہے کہ حضرت امیر حمزہ کو کوہ قاف کی پریاں چھٹے روز اُٹھا کر لے گئیں تھیں اور چودھویں رات واپس کر گئی تھیں۔ لہٰذا بلوچ ماں کا فرض ہے کہ ان ایام میں اپنے بچے کی حفاظت کرے کیونکہ ان کو یقین ہے کہ بلوچ حضرت امیر حمزہ عم رسول اللہ کی اولاد ہیں۔

ختنہ کی سنّت اکثر بلوچوں میں شادی کی طرح منائی جاتی ہے۔ اور اس میں رشتہ داروں کو ضیافت میں مدعو کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ تو بچہ کی پیدائش کے سات روز بعد ختنہ کر لیتے ہیں مگر جن کی مالی حالت اچھی نہیں ہوتی تو وہ ختنہ دیر سے کرتے ہیں یا کسی دوسرے خاندان کے بچہ کے ختنہ کے موقع پر ختنہ کرا لیتے ہیں۔

رسُوماتِ مرگ

بلوچ میّت کو زیادہ دیر تک گھر میں رکھنے کے قائل نہیں بلکہ جس قدر جلد ممکن ہو سکے، تجہیز و تکفین کی رسُومات ادا کر دی جاتی ہیں۔ اگر متوفی وطن سے دُور ہو اور اس کے لواحقین کا ارادہ ہو کہ کچھ مدّت کے بعد لاش کو وطن لے جائیں گے تو میّت کو بطور "امانت" دفن کر جاتے ہیں اور مقررہ میعاد سے قبل میّت کو نکال لیتے ہیں۔ مدت مقررہ تک لاش صحیح و سالم رہتی ہے۔

تیسرے روز قل خوانی کرتے ہیں اور اس رسم کے بعد اگر متوفی مرد ہو تو اُس کے بڑے بیٹے کی دستار بندی کی جاتی ہے جس کے بعد وہ اپنے خاندان کا سربراہ اور اپنے باپ کا جانشین سمجھا جاتا ہے۔ رشتہ دار بھی اس کے لئے دنبہ بکری یا دیگر تحائف لا کر اُس کا غم غلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس تحفہ کو جھبر کہا جاتا ہے۔ جس دن موت واقع ہوئی ہو۔ اس روز اہلِ خانہ اظہارِ غم کے طور پر کھانا نہیں پکاتے لہٰذا قریبی رشتہ دار اُن کے کھانے کا انتظام کرتے ہیں اور اس کو دلبوژ (منہ کھولنا) کہا جاتا ہے۔ تین روز تک عزیز و اقارب ان کے کھانے کا انتظام کرتے ہیں۔

ٹھڈا کا عمل

بلوچ قبائل میں یہ اعتقاد ہے۔ کہ بعض خاندانوں کے لوگ بندوق کی گولی کو اپنے عملیات کی بدولت بے اثر اور

بے ضرر کر سکتے ہیں ۔ اِسے وہ ھُدا کا عمل کہتے ہیں ۔ جنگ کی صُورت میں یہ عمل کرنے والا میدانِ جنگ کے قریب اپنے عملیات جاری رکھتا ہے ۔ ھُدہ کا عمل کرنے والوں کو مخصوص پابندیوں پر کاربند رہنا پڑتا ہے ورنہ اُن کے عمل بے اثر ثابت ہوتے ہیں ۔

اِس قسم کا اعتقاد مغلوں میں بھی ہوتا تھا ۔ اُن کے متعلق مشہور ہے کہ وہ "یدہ پتھر" پر جادو وغیرہ کے عمل سے بارش لا کر جنگ وغیرہ میں فائدہ اُٹھاتے تھے ۔ چونکہ بلوچ کافی عرصہ مغلوں (منگول) کے اتحادی رہے ہیں، لہٰذا ممکن ہے انہوں نے یدہ پتھر کے متعلق معلومات اور عملیات حاصل کی ہوں اور یدہ سے ھُدا یا ھدہ بن گیا۔

چپاؤ

بلوچ قبائلی معاشرے میں چپاؤ جسے آج کل کی اصطلاح میں ڈاکہ زنی کہا جاتا ہے، دلیری اور بہادری کی علامت تصور کیا جاتا تھا ۔ ڈاکہ زنی کرنے والوں سے کبھی بھی نفرت یا حقارت نہیں کی جاتی تھی ۔ اُن کی نظر میں روزی کمانے کا یہ ذریعہ باعزت، شہرت یافتہ اور حامل مردانگی تھا اور اسے کوئی عیب تصور نہیں کیا جاتا تھا ۔ ان چپاؤ کی بدولت انتقامی کارروائیوں کا سلسلہ قبائل میں چلتا رہتا ۔ اگر آج ایک قبیلہ لٹ گیا تو کل لوٹنے والا نہ صرف اپنے اثاثے سے محروم ہوا بلکہ کچھ مردوں کی جان بھی چلی جاتی تھی ۔ اِس لوٹ مار کے دوران عورت کے جسم پر موجود قیمتی زیورات کو بھی ہاتھ لگانا باعثِ شرم و ننگ تھا ۔ اسی سبب سے عورتیں، بچے اور بوڑھے رات کو گھروں میں سوتے تھے ۔ البتہ مرد گھروں سے باہر جنگل میں رات گذارتے تھے تاکہ اچانک حملے کی صُورت میں محفوظ رہیں ۔ اُس دور میں چوری کو قابلِ نفرین فعل تصور کیا جاتا تھا ۔

جب انگریزوں نے پولیس، بارڈر ملٹری پولیس اور بلوچ لیوی کے ذریعہ لاقانونیت کو ختم کرنے کی بھرپور کوشش کی تو ڈاکہ زنی کی روک تھام ہوگئی ۔ چونکہ نوجوانوں کو اس کا متبادل نہ ملا جس سے وہ اپنے حوصلے اور قوت کا اظہار کر سکیں تو نتیجتاً ان لوگوں کو چوری کی مذموم عادت پڑ گئی جو اب دیہات کا بہت بڑا ناسُور ہے ۔ یہ قابلِ مذمت عادت پنجاب کے اکثر ومبیشتر اضلاع بالخصوص گجرات، سرگودھا، جھنگ، مظفر گڑھ، راجن پور اور ڈیرہ غازیخان میں وباء کی طرح پھیلی ہوئی ہے ۔ چوری عموماً انفرادی فعل نہیں ۔ بلکہ ہر بڑے زمیندار نے اپنے گرگے پال رکھے ہوتے ہیں ۔ جو دیہات میں اپنا وقار اور رسُوخ قائم رکھنے کی خاطر ان چوروں اور رسّہ گیروں کو پالتے ہیں اور امداد کرتے ہیں ۔ جب قانون نافذ کرنے والے اداروں کے ہاں یہ گرگے پھنس جاتے ہیں تو یہی زمیندار اپنے پالتو آدمیوں کو دوڑ بھاگ کر کے چھڑا لیتے ہیں ۔ جس زمیندار کے یہ گرگے عدالتوں سے بری نہ ہو سکیں اُس کی اہمیت اور دبدبہ کم ہو جاتا ہے ۔ اگر اُسے مختصراً بیان کرنا ہو تو کہا جا سکتا ہے کہ ہمارے دیہات پاکستان کی مملکت کے اندر چھوٹی چھوٹی ریاستیں ہیں جن کے یہ زمیندار ۔

(۱) امیر تیمور ۔ ہیرلڈ لیم ۔ ترجمہ بریگیڈیر گلزار احمد

حکمران ہیں ۔

ایڈورڈ آلیور کے مطابق "جب کوئی بلوچ پارٹی چپاؤ (دشمن پر حملہ) پر جاتی تو حاصل شدہ تمام مال و متاع کی قیمت لگا کر چپاؤ کے افراد پر تقسیم کیا جاتا ۔ تمام مال کا پانچواں (خمس) حصہ تو سردار قبیلہ کو دیا جاتا تھا ۔ اور باقی میں سے پیدل کو ایک حصہ ، گھوڑے کو ایک حصہ اور اگر اس کے پاس بندوق ہوتی تو نصف حصہ مزید دیا جاتا ۔ اگر وہ جنگ میں مارا جاتا تو اس کا حصہ اس کے رشتہ داروں کے حوالے کیا جاتا ۔ لوٹ کے تمام مال کو بیلوں کی قیمت پر تخمینہ لگایا جاتا ۔ ایک گھوڑی چار گائیوں کے برابر تصور ہوتی تھی ۔ ایک بندوق کی قیمت ایک بیل کے برابر جبکہ تلوار کو نصف بیل کی قیمت کے برابر سمجھا جاتا تھا ۔¹

نوٹ

ضلع ڈیرہ غازیخاں کی تاریخ اور تمدن پر مصنف کی چار گھنٹے کی ریکارڈنگ محکمہ "لوک ورثہ" اسلام آباد" نے محفوظ کی ہے ۔ جن اصحاب کو مزید معلومات حاصل کرنے کی خواہش ہو ، وہ اس ریکارڈنگ سے استفادہ کرسکتے ہیں ۔ یہ ریکارڈنگ 129 سے FR/84-C.125 پر محیط ہے ۔ جو ڈیرہ غازیخاں کی ابتدائی سروے " محکمہ لوک ورثہ اسلام آباد" نے 1985ء میں ریکارڈ کی تھی ۔

---

(۱) Across the Border — Pathan and Baloch P. 62
E. E. Oliver

باب 5

تمندار اور نظامِ تمنداری

ضلع ڈیرہ غازیخان کی تاریخ کے سلسلہ میں تمندار اور نظامِ تمنداری پر نہ لکھنا، حالات سے سخت نا انصافی ہوگی۔ اس نظام کی مکمل تفصیل اور اثرات وغیرہ کا بے لاگ جائزہ تو مستقبل کا مؤرخ ہی دے سکے گا البتہ مختصر سا بیان اِس نظام کی خرابیوں کو اُجاگر کرنے کے لئے کافی ہوگا تاکہ معلوم ہو جائے کہ اِس نظام کے کل پرزوں نے یہاں کے عوام کو کس قدر نقصانِ عظیم پہنچایا ہے۔

لفظ تمندار منگول (مغل) کی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی دس ہزار فوج کا افسر ہے۔ یہ عہدہ چنگیز خاں کے عہدِ حکومت میں دس ہزاری فوجی افسروں کو ملا کرتا تھا۔ لہٰذا لفظ تمندار کے معنی وہ سردار ہے جس کے ماتحت دس ہزار جنگجو ہوں مگر بلوچی تمندار میں دس ہزار افراد کی پابندی ضروری نہیں بلکہ مختلف بلوچ قبائل کی فوجی طاقت اس سے کم و بیش رہی ہے۔ بلوچوں میں تمندار سے مراد صرف سردار قبیلہ رہا ہے۔ خواہ قبیلہ بڑا ہو یا چھوٹا۔ جب بلوچوں اور چنگیزی حکمرانوں میں پورا اتحاد اور ہم آہنگی تھی، تو بلوچوں نے نہ صرف چنگیز خان کے قانون (تورہ) کو قبول کیا بلکہ اُن کے کئی رسم و رواج اور ناموں کو بھی اپنایا جن میں سے ایک لفظ تمندار بھی تھا۔

انگریزی عمل دخل سے قبل ڈیرہ غازیخان کے بلوچوں کی جو جتھہ بندی تھی، اُس میں قبائلی سردار یونان کی آزاد شہری ریاستوں کی مانند جمہوری سردار ہُوا کرتے تھے اور اُن کے سپرد قبائل کا نظم و نسق ہوتا تھا۔ یہ سردار وسیع اختیارات کے مالک تھے مگر یہ اختیارات اُن کو کسی بیرونی طاقت سے حاصل نہ ہوتے تھے بلکہ قوم کی طرف سے ودیعت ہوتے تھے جس کا نتیجہ یہ تھا کہ قبائلی سردار اپنے قبیلے کے روحانی باپ کا درجہ حاصل کر لیتے تھے۔ قبائلی بلوچ خاص حالات میں بڑی سے بڑی قسم اٹھانے کے لئے تیار ہو جاتے تھے مگر اُن کی عقیدت کی انتہا یہ تھی کہ وہ کسی بھی حال میں اپنے سردار کے سر کی قسم اٹھانے کے لئے تیار نہ ہوتے تھے۔ کیونکہ وہ قبائلی محبت کا مرکز اور سربلندی کی علامت تھا۔

اِن سرداروں کی زندگی کا مقصد قبیلہ کی فلاح و بہبود تھی۔ قبیلے کی راحت، آسودگی اور ترقی سردار قبیلہ کی عظمت کی علامت تھی۔ بوقت جنگ وہ قبیلے کا سپہ سالار ہوتا تھا اور عموماً بذاتِ خود لشکر کی کمان کرتا تھا۔ تمندار قبیلے کے مشورہ کے

بغیر اعلان جنگ اور صلح کرنے کا اختیار نہ رکھتا تھا بلکہ ایسے اہم فیصلوں کے لئے اُسے اپنی کونسل یا قبائلی معززین کے فیصلے کا پابند ہونا پڑتا تھا ۔ جب ایک دفعہ فیصلہ ہو جاتا تھا تو اس کو کامیابی کے ساتھ سرانجام دینا اُس کا فرض تھا ۔ بوقت جنگ قبیلہ کے تمام بالغ مردوں کو فوجی خدمات کے لئے حاضر ہونا پڑتا تھا ۔ کرنل پوٹنگر لکھتے ہیں :- کہ

" اُس دور میں ہر بلوچ کسان پوری طرح سے مسلح ہوتا تھا اور اُن کے سرداروں نے اُسے زیادہ موزوں سمجھا کہ اُن کو دوسرے قبائل پر مسلح حملوں میں استعمال کیا جائے ۔ اکثر قبائل میں بلوچوں سے بالکل کوئی ٹیکس نہ لیا جاتا تھا بلکہ وہ صرف مسلح جوان بوقت ضرورت دینے کے پابند تھے ۔ صرف تاجک (دہوار یا دہقان) یا جاٹ کاشتکار سے ٹیکس وصول کیا جاتا تھا جو قبیلے کی مفتوحہ اراضی کے کچھ حصے کو کاشت کرتے تھے ۔ بلوچ سے کچھ وصول نہیں کیا جاتا تھا "

قبائل میں سرداری نظام عہد قدیم سے چلا آ رہا ہے ۔ وزارت اطلاعات حکومت پاکستان کے مطابق مغلیہ دور میں بھی یہ نظام موجود تھا مگر اس کی صورت مختلف تھی ۔ اِس نظام کو قانونی تحفظ صرف انگریزوں کے دور میں حاصل ہُوا ۔ اس سے قبل اِس نظام کو کوئی قانونی تحفظ حاصل نہ تھا ۔ سرداری نظام کو انگریزوں نے قانونی تحفظ دے کر مختلف علاقے سرداروں کو بانٹ دیئے ۔ انگریز نے اعلان کیا کہ نہ تو وہ خود اس علاقے میں دخل اندازی کریں گے اور نہ ہی کسی دیگر کو اس میں مداخلت کرنے دیں گے ۔ انہوں نے سرداروں کے ساتھ معاہدے کئے ۔ اور یہ ان کی ذمہ داری قرار دی گئی کہ وہ اُن مخصوص علاقوں کا تحفظ کریں گے ۔ . . . . . . اس طرح انگریزوں نے ان سرداروں کی طاقت اور اختیارات پر مہر تصدیق ثبت کر دی جو انہیں قبائلی طرز زندگی اور عوام کی پسماندگی کی بدولت حاصل تھے ۔ یہ مہر ایسی تھی جس کو توڑنا سہل نہ تھا ۔ اِس طرح سے انگریزوں نے سنڈیمن کے وقت سے ڈیڑھ سو سال تک سرداروں اور سرداری نظام کی جڑیں مضبوط کیں ۔"[2]

میر خدا بخش خان مری اپنی کتاب میں ان سرداروں کے متعلق لکھتے ہیں کہ

" قبائلی سردار اور مقدم کو اس شرط پر برقرار رکھا جاتا تھا کہ وہ انگریز کے وفادار رہیں گے ۔ جب اُن کو اس معاملہ میں ذرہ برابر بھی شک ہو جاتا تھا تو سردار کو فوراً معزول کر دیا جاتا اور اس کی جگہ پر اس کا رشتہ دار یا قبیلے کا کوئی فرد تعینات کر دیا جاتا ۔ بعض اوقات نئے تمن بھی بنا لئے جاتے اور انہیں

---

(1) Travels in Balochistan & Sind P. 295
H. POTTINGER

(2) Prime Minister Abolishes Sardari System P. 15
Ministry Of Information Islamabad dated April 8, 1976

ہر قیمت پر برقرار رکھا جاتا ...... ان سرداروں کو کچھ مراعات اور قوم کی ادائیگی بصورت پنشن وغیرہ
ملتی تھی جس کے بدلے میں وہ اپنے قبیلے کے عوام کو قابو میں رکھتے۔ انگریز نے ان قبائلی سرداروں
کی لوٹ کھسوٹ پر کوئی پابندی عائد نہ کی جو وہ عوام کو انگریز کی جیلوں میں بھیجنے کی دھمکی دے کر
ٹیکسوں کی صورت میں وصول کرتے تھے۔ اسی سبب سے ہم دیکھتے ہیں کہ بلوچستان کے بدنصیب
لوگ تعلیمی، سیاسی، اقتصادی اور سماجی لحاظ سے ترقی نہ کر سکے کیونکہ اُن کے سر پر انگریزوں کی
جیل میں سڑنے کا خطرہ ہر وقت منڈلاتا رہتا تھا جو سردار کی حسب خواہش انگریز افسر بطور سزا
سناتا تھا۔ اُس دو دھاری پالیسی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس طرح انگریزوں کا مقصد پورا ہوا اور دوسری طرف
عوام کو مجموعی طور پر جاہل اور لاعلم رکھ کر انہیں کبھی متحد نہ ہونے دیا جس کی بناء پر وہ ہمیشہ آپس میں
خون خرابہ کرتے رہے۔"

جب انگریز بلوچوں کی سرزمین پر مسلط ہو گئے تو انہوں نے نظام تمنداری کو بحال رکھا مگر اس کی صورت
اور ماہیت یکسر بدل دی۔ اب ان تمنداروں کو انگریز نے آلہ کار بنا کر استعمال کیا جس سے تمنداروں کی طاقت کا سرچشمہ
قبیلے کی بجائے ایک بیرونی غاصب حکومت بن گئی۔ اس وجہ سے وہ اپنی قوم سے کٹ کر انگریز کے ہاتھوں میں کٹھ
پتلی بن کر رہ گئے جن کو حکومت وقت شطرنج کے مہروں کی مانند بساط پر چلاتی رہی۔ جب تک قبائل آزاد رہے
تو سردار قبیلہ زیادہ سے زیادہ قوم کی خدمت کر کے ہر دلعزیز ہونے کی کوشش کرتا تھا مگر حالات بدل جانے پر وہ
قبیلہ کی فلاح و بہبود سے لاپرواہ ہو کر انگریز کی خوشنودی حاصل کرنے کی غرض سے ہر وہ قدم اٹھانے پر تیار ہو گیا جس سے
انگریز کو فائدہ حاصل ہو سکتا تھا خواہ اُن کا اپنا قبیلہ اُجڑ کر رہ جائے۔ اس کے بدلے میں اُن کے دیئے ہوئے خطابات
اور کرسی نعمت عظمیٰ سے کم نہ تھے۔

آزاد قبائل کے سردار چونکہ اپنی قوم کی طرف سے منتخب شدہ ہوتے تھے لہٰذا وہ اپنی قوم اور قبیلہ کے لئے باعث
افتخار تھے مگر انگریز نے تبدریج اہل الرائے اور قوم کے مخلص سرداروں کو نکال کر حسب منشا موروثی سرداروں کو آگے
بڑھایا جو نہ تو عوام کے خیر خواہ تھے اور نہ ہی پسندیدہ بلکہ اُن کی سب سے بڑی خوبی اپنے ولی نعمت کی چاپلوسی تھی اور
احکامات کی اندھا دھند تعمیل کرنا تھی۔ انگریز نے ایسے سرداروں کے ہاتھ مضبوط کر کے انہیں استعمار کا آلہ کار بنایا۔
جس کا بہترین مظاہرہ انہوں نے سنڈیمن کے مشن قلات کے موقع پر کیا۔

---

1) Searchlight on Balochs & Balochistan
ed. 1974. Mir Khuda Bakhsh Marri

انہی کے کرتوت سے متاثر ہوکر بلوچی زبان کے نامور شاعر رحم علی خان نے جو اشعار کہے وہ "بلوچی ادب کا مطالعہ" میں جناب کامل القادری نے صفحہ 152 - 151 پر درج کئے ہیں۔ لکھتے ہیں:-

ترجمہ :-

انگریز اپنے سواروں کو بھیجتے ہیں ۔ اور تمنداروں کو اپنے پاس بلاتے ہیں۔
(اور کہتے ہیں) اے میرے ہاتھوں کے نمک کھانے والو۔ کیا خلعت یاد ہے ؟
جو ہم نے سر دربار دیئے تھے ۔ اگر وہ یاد ہے تو ہم تم سے کہتے ہیں ؛
آج تم ہمارے کام آؤ

ایک اور جگہ وہی شاعر کہتا ہے :-

ترجمہ :-

فرنگی آہستہ بڑھتا رہا ۔ غدار اس کی رہنمائی کرتے رہے ۔
نشیبی علاقوں کے بے غیرت انگریزوں کو یہاں لائے ۔ وطن غیور مسلمانوں سے خالی ہوگیا
(اور انگریز) شراب کی طرح اعصاب پر سوار ہوتا گیا ۔ اس کے اثرات کا ہٹانا وبال جان بن گیا
ملک میں فریب کا سکہ چل گیا ۔ عوام کو "بٹائی" کے ٹیکسوں سے زیر بار کیا گیا
بدمستی میں لوگوں نے خود ہی ملک اُن کے حوالے کیا ۔ پیسوں کے لئے وطن بیچ دیا۔
انگریز چالاک ہے، وہ فریب دینے کا ہنر جانتا ہے ۔ یہودی کا کام ہی منافقت ہے ۔

یہاں یہ مدّنظر رہے کہ نشیبی علاقوں کے بے غیرت سے مراد ڈیرہ غازیخان کے تمندار ہیں جنہوں نے ابورغال کا کردار ادا کیا ۔ ابورغال نے ابراھہ کی کعبہ کی طرف رہنمائی کی تھی ۔ عرب مدتوں تک ابورغال کی قبر پر لعنت اور گندگی کی بوچھاڑ کرتے رہے کیونکہ اُس نے معمولی فائدے کی خاطر وطن دشمنی کر کے بیت اللہ کو ڈھانے کے ارادہ میں مددگار اور معاون ہوا تھا ۔ یہ تمندار بھی سنڈیمن کی پہلی اور دوسری مشن میں رہنمائی کے فرائض سرانجام دیتے رہے ۔ اور آخر کار بلوچستان کو غلام بنا ڈالا ۔

انگریزوں سے پہلے یہ تمندار کسی منفرد حیثیت کے مالک نہ ہوتے تھے ۔ بلوچستان اور ڈیرہ غازیخان کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑنے والے رابرٹ سنڈیمن (ڈپٹی کمشنر ضلع ھذا) کے دستِ راست - آر ۔ آئی بروس نے تمنداروں کو وسیع اختیارات وغیرہ دینے کے معاملہ کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے :-

"ان میں سب سے بڑی تبدیلی یہی کی جائے کہ بلوچ اور پٹھان موروثی سرداروں

اور ملکوں کو اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا جائے اور پھر سرحدی معاملات میں اُن سے
کام لیا جائے .... اگر ہم ان کی پشت پناہی چھوڑ دیں تو اُن کا اقتدار پھر خاک
میں مل جائے گا ۔"

دراصل یہ لوگ انگریز کی مہربانی سے بڑے بن گئے ۔ لالہ ہتو رام لکھتے ہیں:۔ کہ

"سنڈیمن کی آمد سے قبل غلام حیدر خان کی حالت اچھی نہ تھی ۔ ازاں بعد صاحب ممدوح نے غلام حیدر
خان گورچانی کو اِس تمن کا سردار مقرر فرمایا ۔ یہ سردار بنظر حیثیت تمن اور کارگذاری کے سردار امام بخش
خان سے دوسرے درجے پر تھا مگر بایام تشریف آوری محتشم الیہ خستہ حالت میں تھا اور اپنے تمن کو
چھوڑ کر اپنے علاقے سے باہر ملازمت جمعداری پر گذارہ کر رہا تھا ۔"[2]

اِن لوگوں نے انگریز کے ہاتھ خوب مضبوط کئے اور عوام کو کچل دیا ۔ اپنے مفاد کی خاطر ہر جائز و ناجائز فعل سے
قطعاً گریز نہ کیا ۔ اِس خود غرضی اور ناعاقبت نا اندیشی کی بدولت قوم گمنامی اور بے حسی کے گڑھے میں گر گئی مگر سرداروں
کی تجوریاں سیم و زر سے پُر ہو گئیں ۔ تمنداروں کا جاہ و جلال جس قدر بڑھ گیا، عوام اسی قدر نانِ شبینہ کے لئے محتاج ہو
گئے ۔ تمندار اپنی زمین کی پیداوار کا حصّہ تو لیتے تھے مگر اب انگریز کی اجازت سے عوام کی زمینوں سے بھی پیداوار کی
چوتھائی بطور " بٹائی " تمندار کا حق تسلیم کیا گیا ۔ مویشیوں پر بھی ٹیکس بطور " ترنڑی " وصول کیا جانے لگا ۔ بٹائی کی
وصولی پر جو تمندار کے اہلکار مقرر تھے وہ انسانی لبادہ میں بھیڑیے ہوتے تھے ۔ اِن کی نہایت حقیر تنخواہ ہوا کرتی
تھی مگر وہ عوام کو لوٹ کر چند سالوں میں امیر بن جاتے تھے ۔ بٹائی نہایت ظالمانہ طریقے پر لی جاتی تھی ۔ پیداوار کا تخمینہ
زیادہ سے زیادہ تاخیر سے کیا جاتا تھا تاکہ کسان نالاں ہو جائے ۔ کسان کی فصل کھلیان میں پڑی رہتی تھی مگر اُسے
پہرے دار ایک دانہ بھی اٹھا کر لے جانے کی اجازت نہ دیتے تھے ۔ کسان کے بچے اور بیوی بھوک سے تڑپ تڑپ کر
جنگلی ساگ اور گھاس کھانے پر مجبور ہو جاتے تھے ۔

کسان اپنے بچوں کے پیٹ بھرنے کے لئے جنڈ کی پھلیاں جمع کر لیتے تھے اور اُسے کوٹ کر اس میں تھوڑا
سا جوار یا باجرہ کا آٹا ملا کر روٹیاں پکائی جاتی تھیں ۔ چونکہ جنڈ کی پھلی میں ایک زہریلا مادہ ہوتا تھا ۔ لہٰذا اس سے معدہ
اینٹھن اور درد ہوتا ہے اور بعض اوقات اِس سے موت بھی واقع ہو جاتی ہے ۔ راقم الحروف کو بھی ایک دفعہ ایسی
روٹی کھانے کا اتفاق ہوا تھا جو نہایت اذیت ناک تجربہ تھا ۔ اِس کے علاوہ پیٹ بھرنے کے لئے کھپ کے
پھول اور پھلیاں بھی استعمال کی جاتی تھیں ۔ عوام میں ان کارندوں کے ظلم و ستم کی کئی اندوہناک کہانیاں مشہور تھیں ۔
بٹائی کے علاوہ تمندار کے رقبہ کے محصول کا اندازہ لگانے کے لئے " کبتھ " کی جاتی تھی اور اُن کا کوئی کاردار یا
محالدار اپنا حق رشوت وصول کئے بغیر کبتھ نہ کرتا تھا ۔ اگر کسان نے اُن کو اچھی رشوت نہ دی ، جسے غلط العام میں کھ...

---

[2] تاریخ بلوچستان ص 308 لالہ ہتو رام ... [illegible]

کہا جاتا تھا، تو فصل کا تخمینہ اِس قدر زیادہ لگایا جاتا کہ وہ کئی فصلوں تک بھی ادا کرنے کے قابل نہ ہوتا اور پھر اِس کی فریاد اور اپیل سُننے والا کوئی نہ تھا۔ اِس لوٹ کھسوٹ سے عوام کی حالت ناگفتہ ہوگئی۔ تمندار کے کاردار اور کارندے ٹڈی دل کی طرح علاقے کو اجاڑنے لگے اور کسان اِس قدر مفلس اور بے بس ہوگیا کہ اُس کو زندگی کا رشتہ برقرار رکھنا مشکل ہوگیا۔ نہری اور رُود کوہی کے پانی پر اجارہ داری تمندار کی قائم تھی۔ اگر نہر میں پانی کی قلت ہوتی تو عوام کو پانی سے محروم کر کے نہری پانی سردار کی اراضیات کے لئے مخصوص ہو جاتا اور عوام حسرت سے دیکھتے رہ جاتے۔ یہاں یہ مدِ نظر رہے کہ اُس دور میں صرف طغیانی کی نہریں تھیں۔

تمنداری نظام میں تمنداروں کو جو آمرانہ اختیارات حاصل تھے، وہ اُن سے محروم ہونا ہرگز پسند نہ کرتے تھے۔ لہٰذا اُنہوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ اُن کے علاقے میں تعلیمی ادارے قائم نہ ہو سکیں تاکہ لوگ جاہل رہ کر اپنے حقوق کے لئے آواز بلند نہ کر سکیں۔ دنیا کے ہر مہذب خطہ میں درسگاہیں اور مدرسے قائم کئے جا رہے تھے مگر یہ سردار ایڑی چوٹی کا زور لگا کر ان کو بند کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اِن تمنداروں کے کتوں کے لئے تو حیوانات کے ڈاکٹر مقرر تھے مگر عوام کے لئے علاج معالجہ کی کوئی صورت نہ تھی۔ راقم الحروف کا ذاتی تجربہ ہے کہ ایک تمندار مویشیوں کے ایک ڈاکٹر سے کہہ رہا تھا کہ وہ اپنے کتے کے علاج پر کثیر رقم خرچ کر چکا ہے اور اسے پانچ سو روپے کے بسکٹ کھلا چکا ہے حالانکہ اِس دور میں (۱۹۴۷ء سے قبل) عوام کے بچوں نے بسکٹ کی صورت تک نہ دیکھی تھی۔

اِس معاشی ناہمواری نے عوام کی اخلاقی قدروں کو ریزہ ریزہ کر دیا مگر تمندار کی حویلی عوام کے گاڑھے پسینے کی کمائی پر جاہ و جلال کا مرکز بن گئی۔ اِسی حالت کو بلوچی شاعر شربت خان شکانی گورچانی نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے:۔

مارگندغ کھسا جند مڑداں گہیناں	ہمیں بڑوں (تمنداروں) نے ذلیل کیا ہے
سوہا کھسا اُش دگاں رضائیناں	جنہوں نے ہمیں خراب راستوں پر لگایا
نیں کیں جسا اُش گھٹھا اڈائیناں	اُنہوں نے ہمیں گہرائیوں (ذلت) میں مارا ہے۔
پھُردں مردں ورنگھاں مزاُئیناں	بلندی سے نیچے گرایا ہے۔
تھورے ناگنداں لاہ چاڑہ بیعنیں	مگر اُنہوں نے اونچ نیچ (قومی نفع و نقصان) نہیں
مازے دلوی شط بلوچ نا ڑ بیعنیں	دیکھا (اب) دانا کہتے ہیں کہ بلوچ کی تباہی ہو چکی

ایک ماہر سیاستدان نے کہا ہے کہ:۔

اگر سراج الدولہ کی سلطنت حاصل کرنا ہو تو میر جعفر پیدا کرو۔ اگر ٹیپو سلطان کو تباہ کرنا ہو تو پورنیا اور میر صادق کی سرپرستی کرو۔ مگر روٹی اپنے ہاتھ میں رکھو۔

اِس مثل کے مطابق انگریز نے بلوچ کو غلام بنانے اور اس کی آزاد فطرت کو مٹانے کے لئے تمنداروں کی سرپرستی

شروع کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمنداروں نے اپنے لالچ میں قوم کے قومی اور اعلیٰ خصائل کو بے حسی کی نیند سلا دیا۔ فارورڈ پالیسی کا بنیادی اصول یہ تھا کہ تمندار کو مالی اور قانونی اختیارات سے اس قدر طاقتور کر دیا جائے کہ وہ عوام پر اپنا رعب اور دھونس قائم کر سکے۔ اس غرض سے انگریزوں نے اُن کے تمام ناجائز کاموں کو شرفِ قبولیت بخشا اور اُن کو سڑکوں، ٹیلوں اور دیگر تعمیراتی کاموں کے ٹھیکے دے۔ تاکہ وہ حرام مال زیادہ سے زیادہ جمع کر سکیں جبکہ عوام سوکھی روٹی کے لئے بھی محتاج ہوں۔

سنڈیمن انگریزی سامراج کا سب سے بڑا پرزہ تھا۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی سورۂ النمل کی آیت 34 کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ "امپیریلزم" اور اس کے اثرات و نتائج پر قرآن مجید میں مکمل تبصرہ کر دیا گیا ہے۔ بادشاہوں کی ملک گیری اور فاتح قوموں کی دوسری قوموں پر دست درازی کبھی اصلاح اور خیر خواہی کے لئے نہیں ہوتی۔ اس کی غرض یہ ہوتی ہے۔ کہ دوسری قوم کو خدا نے جو رزق دیا ہے اور جو وسائل و ذرائع عطا کئے ہیں، ان سے وہ خود متمتع ہوں۔ اور اس قوم کو اتنا بے بس کر دیں کہ وہ کبھی اُن کے مقابلے میں سر اُٹھا کر اپنا حصہ نہ مانگ سکیں۔ اس غرض کے لئے وہ اس کی خوشحالی اور طاقت اور عزت کے تمام ذرائع ختم کر دیتے ہیں۔ اُن کے جن لوگوں میں بھی اپنی خودی کا دم داعیہ ہوتا ہے، انہیں کچل کر رکھ دیتے ہیں۔ ان کے افراد میں غلامی، خوشامد، ایک دوسرے کی کاٹ، ایک دوسرے کی جاسوسی، فاتح کی نقالی، اپنی تہذیب کی تحقیر، فاتح تہذیب کی تعظیم اور ایسے ہی دوسرے کمینہ اوصاف پیدا کر دیتے ہیں اور انہیں بتدریج اس بات کا خوگر بنا دیتے ہیں کہ وہ اپنی کسی مقدس سے مقدس چیز کو بیچ دینے میں تامل نہ کریں اور اجرت پر ہر ذلیل خدمت انجام دینے پر تیار ہو جائیں۔

اسی فارورڈ پالیسی نے ایسے افراد کو عوام پر مسلط کر دیا جنہوں نے اعزازات اور اجرت کے لئے خان قلات کی تمام گفتگو سنڈیمن تک پہنچا دی۔ حالانکہ اس شریف النفس حاکم نے ان کو اپنا سمجھ کر قوم کا درد اُن سے بیان کر کے امداد چاہی۔

اس ذہنیت نے قوم کی بہو بیٹیوں کی عزت لوٹی اور ان کو بھیڑ بکریوں کی مانند نیلام عام کیا حالانکہ یہ لوگ اُن کی عزت و آبرو کے محافظ تھے۔ باشعور اور باعزت لوگ اپنی بیٹیوں کی عزت اس طرح سے کبھی نیلام نہیں ہونے دیتے۔ جب میں اس مکروہ ٹولے کے کرتوت کا موازنہ اس اجڈ، اَن پڑھ اور غریب اوڈ مزدور سے کرتا ہوں جو اپنی برادری کی ایک لڑکی کا محافظ بن گیا تو وہ ان لوگوں کے مقابلے میں بہت باعزت اور قابل تکریم نظر آتا ہے۔ یہ واقعہ یوں ہے۔ کہ

راقم الحروف 1962ء میں زراعتی فارم ملتان کا منیجر تھا۔ ایک اوڈ نوجوان لڑکی نے سرکاری رقبے سے کچھ پھل توڑ لئے اور سرکاری اہلکاروں نے اسے پکڑ کر میرے پیش کیا۔ چونکہ اس نے چوری کی تھی لہٰذا مجھے اُس پر بڑا غصہ آیا اور اسی دوران ایک اوڈ لڑکا بھی آ گیا اور میں نے غصے میں اس سے پوچھا کہ کیا تم بھی اس کے ہمراہ ہو؟ اس نے کہا کہ میں اس لڑکی کو نہیں جانتا اور نہ میں اس کے ہمراہ تھا مگر میں نے اس کے لباس سے پہچان لیا ہے کہ وہ میری برادری کی ہے اور میں اُسے ایسی حالت میں اکیلا چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ میں اس کی دلیری اور اپنی برادری سے محبت سے دل میں بڑا خوش ہوا مگر بظاہر اُسے دھمکی دی۔ کہ وہ یہاں سے فوراً چلا جائے ورنہ جیل بھجوا دیا جائے گا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا اور تمام نتائج بھگتنے کے لئے تیار نظر آنے لگا۔ میں نے اُسے شاباش دی اور لڑکی کو جانے کی اجازت دے دی۔

یہ تھا ایک شریف النفس انسان کا رویہ ۔

یہ تمندار کوئی با اخلاق اور غیور ٹولہ نہ تھا جو اپنی قوم اور قبیلہ کی حفاظت کرتے ۔ بلکہ وہ انگریز کے زرخرید غلام تھے اور وہ سورج مکھی رویہ کے قائل تھے ۔ انگریز ان کا قبلہ تھا ۔ میر گل خان نصیر لکھتے ہیں ۔ کہ

"غالباً یہ فروری 1915ء کا ذکر ہے جب سبی دربار کے موقع پر انگریزی اقتدار کی گرفت مضبوط کرنے اور قبائلی سرداروں سے سرکار انگریزی کی وفاداری کا امتحان لینے کے لئے گورنر جنرل کے نمائندے نے تمام قبائلی سرداروں (تمنداروں) اور شاہی جرگہ کے ممبروں سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ گورنمنٹ جانے کے لئے کل انہیں اسٹیشن پہنچنا ہے ۔ اس کی بگھی کو ریذیڈنسی سے اسٹیشن تک گھوڑوں کی بجائے سردار کھینچیں ۔ اہل دربار میں سے صرف خیر بخش خان مری ہی واحد شخص تھا جس نے لاٹ صاحب کو بر ملا کہا ۔ کہ ہماری ماؤں نے ہمیں آزاد جنم دیا ہے ۔ یہ کام حیوانوں کا ہے ۔ انسانوں سے حیوانوں کا کام نہیں لیا جا سکتا ۔ اگر آپ کے پاس گھوڑوں کی کمی ہے تو ہم آپ کو گھوڑے پیش کر سکتے ہیں ۔"

نواب خیر بخش خان یہ کہہ کر دربار سے چلے آئے ۔ بعد میں پولیٹیکل ایجنٹ اور ای ۔ اے ۔ سی ۔ اے سبی دیوان گنپت رائے نے نواب صاحب کو ملاقات کے لئے طلب کیا لیکن آپ نے ملاقات سے انکار کر دیا ۔ نواب صاحب کے انکار پر پولیٹیکل ایجنٹ آپ کی قیام گاہ پر خود آیا اور آپ سے درخواست کی کہ آپ اے جی ۔ جی کو اسٹیشن پر صرف الوداع کہنے آئیں ۔ آپ سے کسی قسم کا بیگار نہیں لیا جائے گا ۔ مگر نواب صاحب نے یہ درخواست بھی رد کر دی ۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے آپ کو دھمکی دی ۔ کہ اگر آپ اسٹیشن پر تشریف نہ لائے ۔ تو اس کا نتیجہ خراب ہوگا ۔ مگر آپ نے غصے میں اسے ڈانٹ دیا ۔ اور کہا آپ بیشک مجھے پھانسی پر لٹکا دیں ۔ مگر ایک غیور بلوچ ذلت کی زندگی پر عزت کی موت کو ترجیح دے گا ۔

گورنر جنرل کے نمائندے کی بگھی ریذیڈنسی سے اسٹیشن تک قبائلی سردار اور شاہی جرگہ کے ارکان کھینچ کر لے گئے ۔ اس واقعہ سے متأثر ہو کر ملا مزار خان بنگلزئی نے مختلف زبانوں میں ایک طویل نظم کہی جس میں نواب خیر بخش خان کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے ۔ اس نظم کا ترجمہ پیش کیا گیا ہے ۔ امید ہے قارئین محظوظ ہوں گے :-

صبح دم شکرانہ حمد بجا لاتا ہوں	(۲) خداوند قادر و کریم و کردگار کا
خدا نے ہزاروں مخلوقات پیدا کیں	(۲) زمین ، آسمان ، چاند ، سورج اور ستارے بنائے
آسمان کو بغیر ستون کے استوار کیا	(۲) اور اس کے نیچے سات طبق زمین کے تخلیق کئے
جب ستار نے یہ ذوالوان دنیا بنائی	(۲) خدائے کریم کی قدرت کے کرشمے بیشمار ہیں ۔
کبھی روز روشن آجاتا ہے تاکہ روزی کمائیں	(۲) اور کبھی رات آجاتی ہے تاکہ لوگ آرام سے سو جائیں
انسان کبھی تفریحات و مسرتوں سے ہمکنار رہتا ہے	(۲) اور کبھی اندھیری قبر کے اندر سو جاتا ہے ۔

(۱) میر گل خان نصیر ۔ تاریخ بلوچستان جلد دوم ص ۲۹۱

کبھی تو موسم سرما کی شدت پھولوں کو تاراج کر دیتی ہے ۔ اور کبھی موسم بہار میں سبزہ زاروں کا منظر دیدنی ہوتا ہے ۔
(خدا نے) طرح طرح کے میوے دار درخت اُگائے ۔ کسی کا میوہ شیریں یا کسی کا تلخ ہوتا ہے ۔
زمین ایک ہی طرح کی ہے لیکن میوے ہزاروں ہیں ۔ یہ ناچیز بندہ تیری تعریف کا حق بجالانے سے قاصر ہے ۔
دنیا میں سوا لاکھ نبی آئے ۔ (لیکن) محمد صلی اللہ علیہ وسلم سب کے تاجدار ہیں ۔
اُس کے چاروں یار توصیف و ثنا کے لائق ہیں ۔ ابوبکر صدیق ۔ عمر زرہ دار
عثمان غنی اور علی شہسوار ۔ بغداد کے شیر نر غوث محی الدین
سخی لعل شہباز (قلندر) اور اُن کے ملتان کے یار ۔ ان کے ساتھ ہی فتح خان ولی جو کامل اور سچا پیر ہے
یہ سب شاعر کے حامی و مددگار ہیں ۔ (لہذا) دوستو اور ساتھیو ۔ اب میرا بیان غور سے سنو
سراوان کے دانا اور باہوش بلوچو ، ایک ہی نظم کو میں نے چار زبانوں میں رونق بخشی ہے ۔
براہوئی ، بلوچی ، ہندی اور سندھی کو میں نے اس طرح سے یکجا کیا ہے ۔ کہ یہ دل میں پیوست ہوتی اور اس کی ترتیب کو بخوں
کی ڈار معلوم ہوتی ہے ۔
سخن فہم حضرات اس سے بہت محظوظ ہوں گے ؛ خداوند قہار نے بلوچوں کے ملک پر
اُس دن قہر ڈھایا جب وہ کفار کو یہاں لایا ۔ سراوان کے بلوچ اس کے مطیع بن گئے
اور ٹکوں کے عوض اپنا ایمان بیچ ڈالا ۔ ایجنٹ گورنر جنرل جب سبی میں آیا
(تو) اس کافر قہار نے ہر طرف احکام بھجوائے ۔ (کہ) سب امرا جرگہ کے لئے تیار ہو کر آئیں
اور میرے حضور آداب بندگی بجالائیں ۔ سب سے پہلے خیر بخش تیغ دار کو
جو امیروں کا سرتاج اور بلند اقبال ہے ۔ کافر نے پروانہ طلبی بھیجا
(کہ) تو اب جرگہ کے لئے آؤ ۔ مجھے تم سے ضروری کام ہے ۔ شیر نر جیسے بہادر سردار نے حکم دیا ۔
اے نقیب ؛ میری قیمتی گھوڑی کو سجا کر لا ۔ جو نہایت طاقتور شہ زور اور کرتب دکھانے والی ہے ۔
اس خوبصورت سبک رفتار کو خوب سجاؤ ۔ جس کی دُم مور کے پروں جیسی اور کان خنجر کی مانند ہیں ۔
یہ دشمن پر شہباز کی برق رفتاری اور شیر جیسی قوت سے جھپٹتی ہے ۔ چنانچہ یہ قیمتی سوغات ساز کر کے پیش کی گئی ۔
اے ملازم خاص ؛ تو ہتھیار لا ۔ امیرانہ کمر بند معہ تیغ خون آشام
نقرئی دستے والی اور زرہ کو کاٹنے والی شمشیر جوہر دار ۔ ایرانی تفنگچہ توڑا
جب تو (سردار خیر بخش خان) شکار کا ارادہ کرتا ہے ۔ تو تیرے بیٹے ، بھائی اور بھتیجے مل کر
ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ۔ ہزاروں کی تعداد میں تیرے سلام کو آتے ہیں ۔

اور تیری محفل میں اکٹھے بیٹھتے ہیں۔ اے مری ! (خیر بخش خان) پروردگار تیرا نگہبان ہو۔
پیر سہری کی دعائیں ہر صبح تیرے ساتھ ہوں۔ چنانچہ لشکر ندی کے کنارے کنارے روانہ ہوکر کاہاں، بادرہ اور میسر کی وادیاں عبور کرکے آپہنچا۔ الغرض جب سب ایجنٹ گورنر جنرل سے دوچار ہوئے۔ انگریز نے کہا" دوستو اور یارو سنو ! میں وطن جانے کو تیار ہوں۔ میری دلی خواہش ہے کہ تم امیر لوگ جلدی سے میری بگھی کو ریلوے سٹیشن تک کھینچ کرلے جاؤ۔ خیر بخش خان مری ! تجھ پر ہزار آفرین ہے۔ تیری آنکھوں میں حمیت و غیرت بھری ہے۔ تو نے ایجنٹ گورنر جنرل کو برملا جواب دیا۔ (کہ) تو اتنا ظلم اور زیادتی مت کر۔ میں نہ بیل اور گھوڑا ہوں نہ گدھا۔ کہ تیری بگھی کو کھینچوں۔ میں تو میدان جنگ میں دو دستی تلوار چلانے والا ہوں۔ اگر تو چاہے تو میدان جنگ میں آکر میری مردانگی دیکھ۔ تاکہ میں تیری کھوپڑی کو چیر کر دودا خان مری کی داستان کو تازہ کر دکھاؤں۔
(دودا خان مری نے انگریزی افواج کو متعدد بار شکست دیکر کئی انگریزوں کو میدان جنگ میں قتل کیا تھا)
مری قبیلہ ہمیشہ سے تلوار کا دھنی ہے۔ جو بلوچ نام و ناموس پر ہر وقت کٹ مرتا ہے۔
اے عظیم نواب ! بے شک تو نوابی کے لائق ہے۔ تیری عمر پہاڑوں کی مانند طویل ہو۔
اے غریب پرور ! تو سدا سلامت رہے۔ اور حیدر کرار کی طرح فتح و نصرت تیرے قدم چومے۔
انگریز ایجنٹ گورنر جنرل نے کہا تو اب تم خوش رہو۔ اور یہ بات کسی دوسرے سردار کو نہ بتاؤ۔ (کیونکہ) میں امیر لوگوں کا امتحان لینا چاہتا ہوں۔ کہ وہ لوگ مجھے کیا جواب دیتے ہیں۔ (کیونکہ) اگر اس موقع پر وہ میرے دام فریب میں نہ آئے تو پھر کبھی بھی تابع فرمان نہیں بنیں گے۔ (چنانچہ) جب (انگریز) حاکم نے اپنا فرمان سنایا تو سب کرسی نشین حاضر ہوگئے۔ تب انگریز نے کہا "مجھے اسٹیشن تک پہنچانا۔ تم امیر لوگوں کا فرض ہے۔
بزا ہولیں، بلوچوں میں حیاء و شرم نہیں رہی۔ نہ انہیں اپنی عزت و ناموس کا خیال نہ داڑھی اور ناک کا۔ انہوں نے اپنے ہونٹ دانتوں تلے بھینچ لئے۔ اور امیروں نے بگھی کو گھیرے میں لے لیا۔
وڈیرہ آدم خان اور لحیم و شحیم جان محمد نے۔ عجب طرح سے بگھی کو کاندھا دیا۔
کھوسے سردار بڑے شہ زور جوان ہیں۔ پگڑی ان کی گردن میں الجھی ہوئی اور جوتیاں غائب۔
جمالی قبیلے کے سردار لشکر خان ۔ اور نامدار وڈیرہ شیر محمد خان
میر شیر محمد خان نے واضح الفاظ میں کہا، سنئے ! سردار میر لشکر خان
آپ اس طرف سے پکڑیں، میں اس طرف سے پکڑتا ہوں۔ آپ صرف میرے ہمراہ رہیں، بگھی کو میں خود کھینچ لوں گا
چنانچہ دونوں توکل کرکے کمربستہ ہوگئے۔ اور اس طرح انہوں نے اپنا نام و ناموس خاک میں ملا دیا۔ اس دن خان بہادر صحبت خان بھی موجود تھا۔ اس نے عقلمندی سے کام لیتے ہوئے ایجنٹ کے سامنے عذر پیش کیا

کو صاحب میرا پاؤں زخمی ہے۔ اِس لئے اس فرض کی انجام دہی سے معذور ہوں۔
اگر مجھ سے یہ خدمت بہرحال لینا مطلوب ہے۔ تو پھر میں اپنی بجائے ابھی دو مزدور حاضر کرتا ہوں۔
انگریز نے کہا! ازروئے انصاف ۔ یہ کام تم پر معاف ہے۔
میر چاکر خان اور محراب خان بگٹی ۔ کمر باندھ کر بگھی میں جُت گئے ۔
انہوں نے بگھی کو کھینچنے میں کوئی کمی نہیں کی ۔ (گویا) اس دن سب کی عقل ماری گئی
سردار خان اور نواب قیصر خان ۔ یہ دونو عالی نسب اور بلند مرتبہ ہیں ۔
(لیکن) دونوں میں سے ایک بھی کافر کے سامنے انکار کی جرأت نہ کر سکا ۔ حرام ہے تم پہ پلاؤ اور کباب
سردار زند اور نواب قیصر خان مگسی نے ۔ دوسروں کے ہاتھوں سے بگھی کو جھپٹ لیا
اُس وقت اُوپر سے بوندا باندی ہو رہی تھی ۔ پھسل کر گرنے سے اُن کے گھٹنے چھل گئے ۔
وڈیرہ نور محمد حج کے لئے گئے تھے ۔ انہوں نے اِس سال جی بھر کے (حرمین کی) زیارت کی
ان کا سمندری سفر بھی امن و سلامتی سے طے ہوُا ۔ اور وہ خوش و خرّم گھر لوٹ آئے ۔
چونکہ ان کا خدا پر صحیح معنوں میں یقین تھا ۔ اس لئے وہ بگھی کھینچنے کی رسوائی سے محفوظ رہے
شیر نر جیسے امیر عزت بخش خان رئیسانی ۔ اور شاہوانی قبیلے کے ناموَر امیر رشید خان نے
براہوئی زبان میں ایک دوسرے سے کہا " جلدی آؤ " میں اور تم باہم دگر ہم رتبہ اور ایک دوسرے کے مدّمقابل ہیں ۔
تم اِدھر سے پکڑو کہ اِسے ایک جھٹکے سے لے جائیں ۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہمارے مرتبے اور شرف کو بٹہ لگ جائے ۔
اُس دن سب کی عقل چوپٹ ہو گئی ۔ جو انہوں نے بگھی کو یوں بے تحاشا کھینچا ۔
میاں خان اور بہرام خان بھی پیچھے رہنے والے نہیں تھے ۔ (اُن کے ساتھ) سمندر خان بھی کمر باندھ کر تیار ہو گیا ۔
تینوں ایک ساتھ لپکے ۔ اور کہا " بگھی کو پکڑو ۔ اب ہماری باری ہے
سیاہ داڑھیوں والے شہ زور جوانوں نے ۔ بگھی کھینچنے میں سب کو مات کر دیا ۔
ایجنٹ اپنی بیگم کے ساتھ بگھی پر بیٹھا تھا ۔ اس طرح وہ خیریت سے اسٹیشن تک پہنچ گئے ۔
افسوس! حیا ملک سے لدکر رُخصت ہو گئی ۔ امیروں نے اپنی شان اور اپنے نام کا کوئی پاس نہ کیا ۔
تمام لوگوں نے انہیں بگھی کھینچتے ہوئے دیکھا ۔ (اس طرح) انہوں نے اپنی قوم کے منہ پر کالک ملا دی
(کاش) وہ اُس دن جنگ لڑنے کا مشورہ کرتے ۔ اور اپنی آن پر فنا ہو کر سرخرو ہو جاتے ۔
غزا اور جہاد کے نام سے تو وہ دُور بھاگتے ہیں ۔ لیکن غریب کو لوٹنے میں بڑے شیر ہیں ۔
جس دن میدان حشر میں عدالت برپا ہو گی ۔ تو خدا تمام امیروں کو اپنے سے دُور رکھ کر

نصاریٰ کے ساتھ شامل کر دے گا۔ اور اُن کا ٹھکانہ دوزخ میں بنائے گا۔

سرگے میں ہزاروں کی تعداد میں خلقت جمع ہوتی ہے۔ زمین، سیہ کاری اور قتل کے مقدمے پیش ہوتے ہیں۔
بھائی کا بھائی کے ساتھ لڑائی جھگڑا ہے۔ ایسے حرام خور لالچ شرم سے عاری ہیں۔
خام، ناقص اور بیچارہ مزار کہتا ہے۔ خدایا! اگر میں حد سے زیادہ گنہگار ہوں
لیکن اے مالک! میں تیری رحمت کا امیدوار ہوں۔ الٰہی! تو رحمان اور بُردبار ہے۔
پروردگار! میرے گناہ بخش دے۔ محمد نبی صلعم اور اس کے چاروں یاروں کے طفیل"

یہاں یہ یاد رہے کہ مزار خان کو اس نظم کی وجہ سے بلوچستان سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔

چونکہ انگریز کی طرف سے مقرر کردہ تمندار حقیقتاً قبیلوں کے محافظ نہ تھے۔ بلکہ انگریز کے نمائندے تھے۔ لہٰذا انگریز سے اپنے ضمیر اور اپنی قوم کی عزت کی قیمت وصول کرنے والے بن گئے۔ انہوں نے اپنے مربی کی حمایت اور چشم پوشی سے قبائل کو غربت کی طرف دھکیل کر غیر شریفانہ رزق حاصل کرنے کی طرف جبراً مائل کیا۔ یہ تمنداروں کی مکروہ سازش کا نتیجہ تھا۔ کہ قبائلی عورتوں کی فروخت اور قرتی کا گھناؤنا کھیل شروع ہوا کیونکہ جب کسی عورت کا چال چلن ذرہ بھی مشکوک ہوتا (بلکہ اکثر اوقات جلب زر کی خاطر تہمت لگا دی جاتی) تو تمندار کے حکم کے تحت اُسے سردار قبیلہ کی تحویل میں دے دیا جاتا جس کا بظاہر یہ مطلب تھا کہ عورت کی جان بچ جائے۔ مگر درحقیقت اس میں ایک مکروہ سازش کام کر رہی تھی۔ اس کارروائی سے تمنداروں کو نہ صرف عیش و عشرت کا سامان گھر میں ملتا رہا بلکہ عورت فروخت ہونے پر اُسے چوتھائی رقم فروختگی بطور حق ملتی تھی۔ وہ اس رقم کے قانونی حقدار بنے ہوئے تھے۔

اس مد سے زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کرنے کی خاطر قبیلہ کی بہو بیٹیوں کو انہوں نے حصول زر کا ذریعہ بنا لیا۔ اور اُن کو زیادہ تعداد میں فروخت کر کے اپنی تجوریوں کو پُر کرنے کی کوشش کی۔ دولت حاصل کرنے کی غرض سے یا کسی خاندان سے ذاتی رنجش کا بدلہ لینے کے لئے اُن کی عورتوں کو خواہ مخواہ "سیاہ کار" قرار دے دیا جاتا۔ حالانکہ اُن عورتوں کے خاوند اور اہل خاندان بار بار اُن کی پاکدامنی کا اقرار کرتے۔ مگر ان مجرمانہ ذہنیت والے لوگوں کو اپنے مذموم عزائم میں ہمیشہ کامیابی ہوتی۔ کیونکہ اُن کے پاس اختیارات تھے۔ قبائل کے یہ نام نہاد محافظ دراصل بھیڑیے تھے۔ جو اپنی قوم کی بیٹیوں کو نوچ نوچ کر کھا گئے۔

جب کسی سیاہ کار عورت کو تمنداروں کے حوالے کیا جاتا تو اُس کے لئے "بھانڈہ میں داخل کرنا" کی اصطلاح استعمال کی جاتی تھی۔ اس ذومعنی لفظ کا ایک معنی برتن ہے یعنی اس بدنصیب مظلوم عورت کو ایک عام برتن کی طرح سے استعمال کیا جائیگا۔ یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوتا جس طرح سندھ کے بعض نام نہاد پیر اپنی داشتہ کے لئے "پیر دی ڈاچی" کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ جب وہ مظلوم عورت بھانڈہ میں داخل کر دی جاتی۔ تو گویا وہ بھیڑیوں کے کھوہ (بھٹ) میں جا پہنچی۔ اس کی حالت کا

(۱) بلوچی ادب کا مطالعہ ص ۲۶۷ تا ۲۷۵ از [illegible] القادری

اندازہ چشم تصور سے کیا جاسکتا ہے۔ جب وہ سرداروں سے بے کراں کے ادنی نوکر کو انکار کا تصور نہیں کرسکتی تھی گویا

ایک برہنہ لاش کی صورت گھر کو لوٹ کے آئی
دہقانوں کی بیٹی تھی وہ سرداروں کے اندر

(اقبال شاہد)

سرکاری رپورٹ کے مطابق "سرداری نظام" میں انسان کی کوئی وقعت نہ تھی۔ اس میں عورتوں سے جانوروں سے بھی بدتر سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ مسٹر یحییٰ بختیار سابق اٹارنی جنرل پاکستان نے جو علاقہ بلوچستان کے رہنے والے ہیں ۱۷ اپنے ایک ٹیلی وژن انٹرویو میں کہا کہ "وہ کئی سرداروں کو جانتا ہے۔ جو کراچی اور لاہور کے قحبہ گھروں کے بڑے رسیا ہیں۔ اور وہاں عموماً نظر آتے ہیں مگر انہوں نے سینکڑوں عورتوں کو "سیاہ کار" ہونے کا الزام لگا کر ایک قبیلہ سے دوسرے قبیلہ میں دور دراز علاقوں میں فروخت کیا۔ سرداری نظام میں عورتوں اور مردوں سے بنیادی انسانی حقوق بھی سلب کر لیئے گئے تھے یہ جو بدقسمتی سے بلوچستان اور اس کے ملحقہ اضلاع سندھ اور پنجاب میں لاگو تھا۔"

اس سراسر ظلم و ستم کے خلاف دوست محمد خان حجانہ نے قلمی جہاد شروع کیا اور ایوان بالا تک درخواست ہائے روانہ کیں۔ انہوں نے اخبارات میں بھی مضامین لکھے مگر انگریز کے قرب والوں نے انہیں کامیاب نہ ہونے دیا۔ تاہم انہوں نے آخر دم تک اپنے مشن کو جاری رکھا۔ انہوں نے اخبار "الشمس" ملتان کو ایک ٹریکٹ بغرض اشاعت ۱۹۴۱ء میں روانہ کیا۔ یہ اخبار میرے محترم دوست جناب جاوید احسن خان کے پاس موجود ہے۔ اس ٹریکٹ کی نقل بطور مثال پیش کی جاتی ہے:۔

بترس از آہ مظلوماں کہ ہنگام دعا کردن ؎ اجابت از درحق بہر استقبال مے آید

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ

"محب وطن سیریز" ڈیرہ غازیخان نمبر (۷)

جنگ جرمن سے زیادہ خطرناک جنگ انگریزی حکومت کے خلاف آسمان پر بلوچی معصومہ لڑکیوں کی فروخت کی ڈگریاں وقرقیاں قانون کی طاقت سے قراب گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں چیلنج - از دوست محمد حجانہ آنریری ایڈیٹر و پبلشر محب وطن سیریز ڈیرہ غازیخان

ریگیولیشن سرحدی کے نادان دوست

ریگیولیشن جرائم سرحدی نمبر ۳ سنہ ۱۹۰۱ء برائے حدود شمال مغربی سرحدی صوبہ و اضلاع ڈیرہ غازیخان میانوالی منظور و نافذ ہوا تھا مگر سنہ ۳۲-۱۹۳۱ء میں اس کا نفاذ تمام سرحدی صوبہ میں معطل یا متروک ہو گیا ہے۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کہ سرحدی صوبہ جیسے علاقہ میں جو کہ جنگجویانہ روایات کا مرکز ہے تو قانون مذکور منسوخ ہو چکا ہے مگر غریب پر امن و بے زبان ضلع ڈیرہ غازیخان کا کیا قصور

Prime Minister abolishes Sardari system P.41-2 Ministry of Information, Islamabad dated 8th. April, 1976

ہے کہ ابھی تک اس میں یہ قانون منسوخ ہونے میں نہیں آتا۔ واضح ہو کہ قانون نے جن اصولوں کو مدنظر رکھ کر یہ ریگولیشن وضع کیا تھا ان کے مفید ہونے میں کوئی شک نہیں، مگر بدقسمتی سے ایک گروہ ایسا پیدا ہوگیا ہے۔ جو اس قانون کا دشمن ہے۔ اس سے ہماری مراد طبقہ تمنداران و انگریز حکام ڈیرہ غازیخان سے ہے جنہوں نے اس قانون کو بدنام کرنے اور اس کے غلط استعمال میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ہے۔ اور یہ ہماری رائے ہے کہ جب کبھی جلدی یا بدیر اس قانون کے خلاف ایجیٹیشن ہوگا یا منسوخ قانون ہوگی۔ تو اس کی ذمہ داری اُسی گروہ پر ہوگی جو اوپر مذکور ہوا ہے۔ یہ صرف ہماری رائے نہیں بلکہ ہز ایکسیلینسی گورنر جنرل بہادر نے ۱۹۳۱ء میں سرحدی صوبہ میں اس قانون کی منسوخی کے مسئلہ پر ریویو کرتے وقت یہ رائے ظاہر فرمائی تھی کہ یہ قانون اِس قدر خراب نہیں ہے جتنا کہ اس کے استعمال میں خرابیاں ہیں" مگر افسوس کہ جہاں اس قانون کا عملدرآمد سرحدی صُوبہ میں یکقلم منسُوخ کر دیا گیا ہے۔ وہاں ضلع ڈیرہ غازیخان میں کم از کم اس کے استعمال کی تعدیل کی طرف بھی کوئی توجہ نہیں کی گئی۔

بلوچ لڑکیوں کی عام فروخت قانون کی طاقت سے

سب سے بڑی شکایت جو ریگولیشن سرحدی کی ناجائز استعمال کی ہے۔ یہ ہے کہ اس انسانی آزادی کا جو انگریزی حکومت کا طرۂ امتیاز ہے اِس قانون کی طاقت سے خون کیا جاتا ہے اور بلوچ لڑکیوں کی بیع و فروخت کے نفاذ میں ہر سال لاکھوں روپے کی ڈگریاں زیر دفعہ ۸ قانون سرحدی بابت بلوچی عورتوں کی قیمتوں کے صادر کی جاتی ہیں۔ ان سے ۸۰ فیصدی موجودہ قانون سرحدی کے منشا کے بھی خلاف و ناجائز ہیں۔ ایسی ڈگریوں کے اقسام ذیل میں ملاحظہ ہوں۔

زیر دفعہ ۸ بلوچی عورتوں کے متعلق ڈگریوں کی اقسام

(۱) بیوہ عورتوں کی قیمت کی ڈگریاں جو بیوہ عورتوں کے ساتھ عقد ثانی کرنے والے مرد کے خلاف عورت کے سابقہ شوہر یا پدری ورثاء کے حق میں۔

(۲) لڑکیوں کی پیدائش سے پہلے بلکہ اُن کے نا کتخداؤں کے شکم سے آئندہ پیدا ہونے والی لڑکی (جسے بلوچی اصطلاح میں لافی بازو کہا جاتا ہے) کی فروخت کے سودے ہوجاتے ہیں۔ ایسے سودے کے نفاذ کی ڈگریاں۔

(۳) جن مطلقہ عورتوں نے بعد طلاق اپنی فروختگی کو نامنظور کر کے اپنے مشتری کے ساتھ نکاح ثانی منظور نہ کیا اور دیگر جگہ برضی خود شادی کر لی تو ان کے ناکح کے خلاف ڈگریاں ان کے ناکام مشتریوں کے حق میں۔

(۴) جن معصُومہ لڑکیوں نے بالغ ہوکر باستعمال حق شرعی خیار البلوغ ویرانی عدالت سے اپنے زمانہ نابالغی کے نکاح کی تنسیخ کی ڈگریاں حاصل کیں۔ اُن کے ناجائز خاوند ثابت ہونے والے شخص کے حق میں معاوضہ بازور کی ڈگریاں ان اشخاص کے خلاف جن کے ساتھ ایسی لڑکیوں نے بعد میں جائز نکاح کیا۔

(۵) ہرجانہ عہد شکنی نکاح و منگنی کی ڈگریاں

(۶) ڈگری معاوضہ سیاہکاری (بلوچی اصطلاح میں زناکاری کو سیاہکاری اور زانی عورت کو سیاہکارہ کہتے ہیں۔)

واضح رہے کہ اوّل الذکر چار قسم کی ڈگریوں کے جواز کا کوئی دفعہ موجودہ ریگیولیشن سرحدی میں نہیں ہے۔ ان ڈگریوں کی بنیاد اس ناپاک بلوچی سپرٹ پر مبنی ہے کہ بلوچی قوم کے نزدیک عورت کا وجود جانوروں کی طرح ایک قابل انتقال جائیداد ہے بلکہ اس سے بھی بدتر ہے۔ کیونکہ دنیا میں کسی ایسے جانور کا سودا نہیں کیا جاتا جو ابھی عالم نیست سے ہست میں نہ آیا ہو اور نہ ہی دنیا کی کوئی عدالت ایسے سودے کے نفاذ میں ڈگری دیتی ہے مگر بلوچی لڑکی کے سودے ان کے عالم وجود میں آنے سے پہلے ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی خلاف ورزی پر پولیٹیکل عدالتیں ڈگریاں دیتی ہیں۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ الف نے ب سے ایک لانی بازہ (یعنی آئندہ شکم مادر میں پڑنے والی لڑکی لینا ہے۔ ب کے پسر نے کوئی بدمعاشی کی اور اس کو کوئی جرمانہ ادا کرنا پڑ گیا تو ب نے اس کے معاوضے میں وہ لانی بازہ جرمانہ گیرندہ کے پاس منتقل کر دیا۔

کچھ عرصہ بعد اس جرمانہ گیرندہ پر کوئی ابتلا آیا۔ تو اس نے اس لانی بازہ کو کسی اور کے پاس ابتلا کا بناکر بیچ دیا۔ بدیں طور اکثر بلوچ لڑکیوں کے پیدا ہونے سے پہلے ان کے کئی انتقال ہو جاتے ہیں۔ اور ایسے ناجائز انتقالات بلوچ لوگ پولیٹیکل قانون کی طاقت سے ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ ریگیولیشن سرحدی میں صاف مرقوم ہے کہ اس ریگیولیشن کے مطابق کوئی ایسا فیصلہ صادر نہ کیا جائے۔ جو دیگر مروجہ قانون کے صراحتاً یا کنایتاً نقیض ہو۔ اور ظاہر ہے کہ ایسی ڈگریاں ایکٹ معاہدہ نیز مصلحت عامہ کے سراسر خلاف ہیں۔ اور قانوناً عورت ذات ماسوائے ازدواجی پابندی کے ویسی ہی آزاد ہے جیسے کہ مردوں کا طبقہ۔

بلوچی رواج کی قانوناً کوئی حدبندی ہونی چاہیئے

بلوچی رواج کی آڑ بھی ایسی ڈگریوں کو جائز قرار نہیں دے سکتی۔ دفعہ ۸ میں کوئی لفظ رواج نہیں ہے۔ اگر ہو بھی تو بھی رواج کی کوئی تعریف کرنی پڑے گی۔

نواب محمد جمال خان پریذیڈنٹ چیف جرگہ اپنے تمن کی سیاہ کار عورتوں کو اُن کے خاوندوں کی طلاق کے بعد جبراً فروخت نہیں کرتے۔ ان کی رضامندی سے ان کا عقد ثانی کراتے ہیں۔ پھر نہ تو ان کے اس طریق کو کبھی خلاف رواج قرار دیا گیا اور نہ ہی اس کے خلاف قوم میں کوئی ایجی ٹیشن ہوا مگر دوسرے تمنات میں سیاہکارہ لڑکیوں کو جبراً فروخت کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ذیل کی ایک عبرتناک نظیر قابل غور ہے۔

ہائیکورٹ کی ممانعت کے باوجود ایک بلوچ لڑکی جبری فروخت ایک انگریز افسر کے حکم سے

ایک بلوچ مسمی کریم بخش گلفاد کی لڑکی کو تمندار علاقہ نے سیاہ کارہ قرار دے کر اسے جبراً فروخت کر دیا۔ لڑکی کے باپ نے

ریگولیشن سرحدی کے ماتحت دادرسی سے مایوس ہوکر زیر دفعہ ۵۵۲ ضابطہ فوجداری عدالت ڈپٹی کمشنر ڈیرہ غازیخان درخواست گذاری اور استدعا کی کہ اس کی لڑکی اپنے مشنریوں کے پاس جانا نہیں چاہتی اُسے آزاد کر دیا جائے۔ کریم بخش کی کوئی اولاد بجز اس لڑکی کے نہیں ہے۔ لڑکی بھی اپنے باپ کو چھوڑنا نہیں چاہتی مگر ڈپٹی کمشنر نے بغیر تحقیقات استغاثہ خارج کر دیا۔ بدنصیب کریم بخش نے ہائی کورٹ میں اس حکم کے خلاف نگرانی کی۔ ہائی کورٹ نے نگرانی منظور کر کے حکم دیا کہ کارروائی آزاد کرائے جائے لڑکی کے حسب ضابطہ کی جائے۔ مگر سی ایل کولٹس ڈپٹی کمشنر نے ۱۱ اپریل ۱۹۰۹ء کو لڑکی کا وارنٹ تلاش جاری کئے بغیر درخواست مکرر خارج کر دی۔ اور لڑکی مسماۃ شرم ابھی تک اپنے مشنریوں کے قبضہ میں محبوس کی جاتی ہے۔ اس فیصلہ سے ثابت ہوتا ہے کہ انگریز حکام کی ذہنیت بھی بلوچی ماحول میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اور جوڈیشل عدالت کی کرسی پر بیٹھے ہوئے بھی ایسے احکام صادر کرتے ہیں جو وہ ریگولیشن سرحدی کے رنگ میں صادر کرنے کے عادی ہیں۔

معصومہ لڑکیوں کی قرقی اجراء وصولی جرمانہ میں

اسی پر بس نہیں بلکہ اجراء ڈگری پولیٹیکل دیوانی میں کنواری معصومہ لڑکیوں کو قرق کیا جاتا ہے۔ مثلاً بمقدمہ خیر محمد گورچانی ڈگریدار بنام تگیہ گورچانی مدیون بصیغۂ اجراء وصولی جرمانہ ایک ہزار روپیہ تگیہ مدیون کی ایک گائے بزنگ سفید اور دو کنواری ہمشیرگان مسماۃ چنن و مسماۃ جیول کو بحکم عدالت قرق کیا گیا۔ اور بذریعہ حکم امتناعی ان لڑکیوں کی شادی و نکاح کی ممانعت باعتبار ضمانت پانچ پانچ سو روپے نامے باقی زر ڈگری کی گئی۔

ایک اور مقدمہ اجراء دیوانی نمبر مقدمہ ۱۱/۱۷ مرجوعہ ۱۷ مئی ۱۹۳۳ء عدالت ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ میں فرد قرقی مرتبہ ۷ اگست ۱۹۳۳ء ملاحظہ طلب ہے جس میں مدیوں کی ایک گائے ایک بکری ایک گدھا اور ایک کنواری لڑکی قرق کی گئی ہے۔ اور اس نابالغہ معصومہ کو پانچ سو روپیہ میں فروخت کر کے حقرسی ڈگری وار کی گئی ہے۔ اور انگریز ڈپٹی کمشنر اپنے فیصلوں میں بلوچی لڑکیوں کی فروختگی کے احکام لکھتے ہوئے صاف طور پر لفظ "sold" استعمال کرتے تھے۔ ملاحظہ ہو مثل جرگہ دیوانی نمبر ۱۵ تاریخ فیصلہ ۲۲ فروری ۱۹۳۴ء بمقدمہ نواب بنام پاندھی جس میں ایک بیوہ عورت کی فروخت کا حکم دیا گیا۔

کنواری لڑکیوں کی جلاوطنی کے احکام

غضب یہ کہ بھاگ جانے والی عورتوں کا معاوضہ ہتک عزت عام طور پر چار پانچ سو روپیہ تک ڈگری ہوتا ہے۔ مگر جو معصومہ لڑکی اپنی نابالغی کے زمانہ نکاح جائز طور پر دیوانی عدالت سے منسوخ کراتی ہے، کسی بدمعاش کے ساتھ بھاگ کر نہیں بلکہ اپنے والدین کے گھر بیٹھے ہوئے تو اس کے ساتھ جو سلوک کیا جاتا ہے اس کے لئے ذیل کی نظیر ملاحظہ ہو۔

مقدمہ نمبر ۱۶۶/۳۸ تاریخ فیصلہ ۹ ستمبر ۱۹۳۹ء بمقدمہ بہرام بنام بہادر چانڈیہ۔ جس میں اس قسم کی ایک لڑکی کو معہ اُس کے باپ کے علاوہ ایک ہزار روپیہ جُرمانہ کے پانچ سال کے لئے زیر دفعہ ۳۶ قانون سرحدی جلاوطن کیا گیا۔

بصورت راضی نامہ جرم ۸۹۸ سیاہکار مرد کا گناہ معاف ہوجاتا ہے مگر سیاہکار عورت کا گناہ معاف نہیں ہوتا۔

اس عنوان کے ماتحت ایک سیاہکار عورت کی حسب ذیل دردناک درخواست قابل غور ہے۔ بمقدمہ اللہ دتہ بنام عبدالمجید لُنڈ سکنہ نعان پور حد تمن لغاری۔

جناب عالی!

سائلہ اظہار مدعا سے قبل ایک اصولی سوال حضور کے آگے رکھتی ہے۔ زناکاری انگریزی حکومت میں مرد کے لئے جرم ہے، عورت کے لئے نہیں اور ایک بلوچ مرد مجرم زناکاری کا گناہ بصورت راضی نامہ معاف ہوجاتا ہے۔ ایسا مجرم بعد راضی نامہ مدعی کے پڑوس میں آمدورفت رکھتا ہے، تو پھر نہ تو کوئی خونریزی ہوتی ہے اور نہ ہی کوئی رواج بلوچیا اس کے مانع ہوتا ہے۔ مگر کیا سیاہکارہ عورت جس کا فعل قانوناً جرم نہیں، راضی نامہ کے بعد بھی اپنے وطن میں رہنے کی مجاز نہیں؟ یہ ایک سوال ہے جو میرے لئے غور طلب ہے۔ میرے خاوند نے بذریعہ راضی نامہ مورخہ ۱۲ ستمبر ۱۹۳۹ء ملزم کے ساتھ مصالحت کر لی ہے۔ اور وہ دونوں جو ایک جگہ کے رہنے والے ہیں، باہم شیر وشکر ہوچکے ہیں۔ سائلہ حسب رواج بلوچیا اپنے خاوند سے رد ہوکر اپنے والدین کے گھر تین سال سے مقیم ہے۔ سائلہ ادھیڑ عمر کی عورت ہے اور پانچ بچوں کی ماں ہے۔ جب خاوند سائلہ ملزم کا بصورت راضی نامہ گناہ معاف کر چکا ہے تو سائلہ جس کا فعل زناکاری قانوناً جرم نہیں، اُس سے زیادہ مستحق معافی ہے۔ خاوند سائلہ نے مجھے جلاوطن کر کے دور کے علاقہ میں جبراً فروخت و نکاح کئے جانے کی درخواست دی ہے جس کے لئے تمندار نے سائلہ کو باعتبار ضمانت طلب فرمایا ہے۔ استدعا ہے کہ سائلہ کو جبراً وطن سے نہ نکالا جائے، مجھے میرے بچوں سے جُدا نہ کیا جائے۔ اور مجھے میرے حال پر چھوڑا جائے۔

مسماۃ جنت سائلہ

مورخہ ۶ جولائی ۱۹۴۰ء

یہ درخواست سائلہ مذکور نے بعدالت جناب مسٹر ایبل صاحب بہادر ڈپٹی کمشنر گذاری جو تمندار علاقہ کے پاس بھیجی گئی۔ تمندار نے اس سائلہ کو باعتبار ضمانت پانصد روپیہ اپنے خاندان و وطن میں نکاح ثانی کی ممانعت کا پابند کیا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف اور قانون ہے؛ کہ سیاہکار مرد تو مدعی کے ساتھ ایک ہی گاؤں میں آباد رہے مگر سیاہکارہ عورت کو حکماً گھر سے نکالا جائے۔

خلاصہ یہ کہ بلوچی قوم کا بے زبان طبقہ اناث انگریزی حکومت میں قیدیوں اور جانوروں سے بھی بدتر زندگی بسر کر رہا ہے، کوئی ان کا پرسانِ حال نہیں اور بلوچی عورت پر تاحال انگریزی سلطنت کا آفتاب طلوع نہیں ہوا ہے۔ بلوچی عورت تاحال زمانہ جاہلیت کو عبور کر رہی ہے۔

راجپوت قوم میں ستی ایک رواج تھا جو قانون کی طاقت سے ممنوع کر دیا گیا مگر بلوچی علاقہ میں انگریز حکام قانون کو غلط طور پر لاحدود اور وحشیانہ رواج کے تابع استعمال میں لا رہے ہیں اور پولیٹیکل عدالتوں کا ریکارڈ اس قسم کی خلاف قانون کار روائیوں سے بھرا پڑا ہے۔ چونکہ پولیٹیکل مقدمات میں نہ وکیل پیش کرنے کی اجازت ہے، نہ اپیل کی۔ اس لئے ریگولیشن سرحدی کی طاقت سے کٹے ہوئے مظالم کو لاعلاج تصور کرتے ہوئے مظلوم بلوچ لڑکیوں کی سرد آہیں آسمان پر انگریزی حکومت کے خلاف گولہ باری کر رہی ہیں۔ جنگ جرمن انگریزی حکومت کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی مگر اندیشہ ہے کہ یہ جنگ ایک وقت تعجب انگیز آسمان پر انگریزی حکومت کے زوال پر منتج ہو۔ صرف روحانی آدمی ہی اس جنگ کو دیکھ سکتے ہیں۔

ہم ۱۹۳۰ء سے متواتر ریگولیشن سرحدی کی غلط استعمال کے خلاف صدائے احتجاج بلند کر رہے ہیں۔ کئی میموریل اور پمفلٹ ذمہ دار حکام اور گورنمنٹ کے پاس بھیجے۔ سر سکندر حیات خان کی خدمت میں بمقام ڈیرہ غازیخان بماہ فروری ۱۹۳۹ء ایک معتبر وفد نے پیش ہو کر اس بارے میں میموریل پیش کیا۔ مگر ابھی تک کوئی اصلاح ان خرابیوں کی ظہور میں نہیں آئی۔ چونکہ ریگولیشن سرحدی کے حلقۂ نفاذ کا کچھ رقبہ آئینی گورنمنٹ کے حلقۂ اختیارات سے باہر اور براہِ راست ماتحت نواب گورنر جنرل بہادر ہے، اس لئے ہم لاکھوں معصوم مظلوم بلوچی لڑکیوں کی طرف سے نواب گورنر جنرل بہادر کی خدمت میں مؤدبانہ چیلنج کرتے ہیں کہ وہ براہ مہربانی مندرجہ بالا قسم کے واقعات و فیصلہ جات کا قانونی جواز ریگولیشن جرائم سرحدی کے صحیح مفہوم کی روشنی میں ثابت کریں۔ دیگر نہ ریگولیشن سرحدی کی ایسی تنسیخ یا ترمیم و توضیح عمل میں لائیں جس سے آئندہ کے لئے مذکورہ بالا خرابیوں کا قطعی سدباب ہو جائے۔ بالخصوص نمبر ۲ تا نمبر ۹ قسم کی ڈگریاں اور ان کا اجراء منسوخ و ممنوع قرار دیا جائے۔

توضیح

واضح رہے کہ ملک میں ریگولیشن جرائم سرحدی کا فوجداری قانون زیر دفعہ ۱۱ کے ناجائز استعمال کی کوئی شکایت نہیں ہے بلکہ راقم کا نظریہ یہ ہے کہ قانون جوڈیشنل ملک کی کثرت واردات چوری وغیرہ کی سزادہی میں ناکام اور ناقص ہے۔ اس لئے جوڈیشنل قانون کی یہ حامی جب تک دور نہ ہو تب تک کم از کم ریگولیشن سرحدی کے حلقہ نفاذ (حدود ڈیرہ غازیخان) میں ہر مقدمہ چوری کا دعویٰ کا فیصلہ بذریعہ جرگہ زیر دفعہ ۱۱ کیا جائے۔ مگر افسوس! کہ جس جگہ اس ریگولیشن کا استعمال ضروری ہے وہاں تو اس کا استعمال نہیں کیا جاتا۔ الّا ریگولیشن سرحدی کی بیشتر طاقت آزمائی صرف بے زبان بلوچی عورت پر غلط طور پر کی جاتی ہے۔ ہمارے مذکورہ بالا چیلنج کا مدعا فقط یہ ثابت کرنا ہے کہ ریگولیشن جرائم سرحدی کا کوئی دفعہ ایسا نہیں ہے جس کا منشا بلوچی

عورت کی سول لبرٹی کا حق زائل کرنا اور بجز ازدواجی پابندیوں کے کوئی اور پابندی اُن پر عائد کرنا ہو۔ بلوچ عورت سول لبرٹی کی ویسی ہی مستحق ہے جیسی کہ دیگر برٹش رعایا۔ جب تک ریگولیشن سرحدی بحال ہے اس کے دفعہ ۸۔ کی ایسی ترمیم یا ترمیم فوراً عمل میں لائی جائے جس سے دعاوی نسبت بلوچی لڑکیوں کے ہمچو سول قانون کے ممنوع السماعت قرار دیئے جائیں۔

آخری خطاب بہ حضور والیسرائے بہادر

نمودشت مظلوم زاہش بترس
زوددل صبح گاہش بترس

پنہ اردلہا بداغ توریش
کہ روز پسین آیدت غیر پیش

حقت گفتم اے خسرو نیک را
تواں گفت حق پیش مرد خدا

ترا عادت اے پادشاہ حق رلیت
دل مردحق گوازیں ہا قولیست

عجب نیست گر ظالم از من برجان
بہ رنجیدکہ دزد من پاسبان

توہم پاسبانی بانصاف وداد
کہ حفظ خدا پاسبان تو باد

دوست محمد حجبانہ۔ مرقومہ فروری ۱۹۴۱ء شائع کردہ۔

دسمبر ۱۹۵۱ء میں خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل پاکستان ڈیرہ غازیخان دورہ پر آئے تو دوست محمد خان بلوچ عورتوں کے ایماء پر عورتوں کا وفد بلوچ عورتوں کے انسانی حقوق کی بحالی کے سلسلے میں ملاقات کے لیئے گیا۔ اس وفد میں فاطمہ بیگم (زوجہ مُصنّف)، عائشہ بیگم بزدار اور دیگر خواتین شامل تھیں۔ خواجہ صاحب نے اس وفد کی معروضات کو بڑے غور سے سُنا اور مُناسب احکامات جاری کرنے کا وعدہ فرمایا۔ شاید اسی سبب سے بہت جلد تمنداری نظام اور اسکے ثمرات خبیثہ کا خاتمہ ہو گیا۔

قبائل کی آزادی کے دور میں سردار قبیلہ لوقت جنگ سپہ سالار ہوتا تھا اور بصورت امن و آشتی وہ قبیلے کی زندگی میں نہ صرف قوم کا امین، مُفتی اور جج تھا بلکہ اُسکی ذات قبائلی زندگی کی ہر رَشتہ پر حاوی تھی۔ لہٰذا قبیلہ کے زیر تصرف زمین اور چراگاہیں تمندار کے ذریعے سے تقسیم ہوتی تھیں۔ البتہ وہ زمین جو تنا سلات دیہہ اور ملکیت "سرکار" تھیں، اُن پر ہر فرد قبیلہ کو...

درملک خانی محرر سمان حجت تونسوی

یکساں حقوق حاصل تھے۔ یہ رقبہ جات سردار کی سپردگی میں رہتے تھے تاکہ قبیلہ کی ضروریات کے مطابق کام میں لائے جاسکیں۔ ان اراضیات کو آج کی زبان میں کراؤن لینڈ یا نزول رقبہ کہا جاسکتا ہے۔ غیر ملکی سیادت میں جب 1876ء میں پہلا بندوبست اراضی ہوا تو تمنداروں نے قبائلی چراگاہوں کو اپنی ملکیت درج کرا دیا حالانکہ وہ رقبہ جات اُن کے پاس قومی امانت تھے جو اُن کی تحویل میں تھے۔ عوام چونکہ لاعلم تھے سیدھے سادہ اور اپنے سردار پر مکمل اعتماد رکھنے والے تھے لہذا تمنداروں نے خیانت کا ارتکاب کرکے ایسی تمام زمینوں پر قبضہ کرکے قبائل کو اُن کے حقوق سے محروم کردیا۔ اس طرح سے یہ لوگ قبیلہ کی اکثر وبیشتر اراضی پر قابض ہو گئے۔ یہ محرومی صرف ڈیرہ غازیخان میں نہیں ہوئی بلکہ پاکستان کے اکثر وبیشتر حصوں میں اس ڈرامے کو رچایا گیا البتہ طریقہ واردات بعض اوقات مختلف ہوتا۔

ٹرودسکی کے الفاظ میں "ان میں سے بعض بڑے زمیندار اُن قبائل کی اولاد تھے جو مویشی چرانے اس وقت داخل ہوئے جب اُس علاقہ کو اجاڑ دیا گیا تھا اور لوگ جان بچا کر بھاگ گئے تھے۔ بعض سابقہ حکومتوں کے مالیہ وصول کرنے والے ناظم یا اہلکار کی اولاد تھے جن کی سابقہ حیثیت تو نہ رہی تاہم وہ اس علاقہ پر غلہ کی مخصوص مقدار وصول کرنے کے حقدار رہے۔"[1] اس کے علاوہ گونکودسکی نے صحیح رائے دی ہے۔ کہ "چونکہ تمنداروں کے پاس عدالتی اور انتظامی اختیارات تھے جن سے پورا پورا ناجائز فائدہ اٹھایا گیا اور ان کی ملکیت اراضی بے حد وسیع وعریض ہو گئی۔"[2]

اس کے علاوہ جب انگریزوں نے دریائے سندھ سے مغرب کے علاقہ پر قبضہ کیا تو دیگر برٹش ہند کی مانند جاگیردار طبقہ کو اپنا حامی بنانے کی خاطر انگریز انتظامیہ نے اُن کو عوام کی زمینوں پر زیادہ سے زیادہ قبضہ کرنے کی اجازت دے دی۔ اس کے علاوہ اِن کو وسیع جاگیریں دیں جو بہت جلد ذاتی ملکیت بن گئیں۔" یہ جاگیریں زیادہ تر پنجاب کی نہری آبادیوں میں دی گئی۔ ضلع ڈیرہ غازیخان میں تمنداروں کو صرف درخواست دینے پر وسیع علاقے سونپ دیئے گئے۔ درخواست جمال خان (لغاری) اور درخواست میرن خان اس کی چند مثالیں ہیں۔

عوام کی زرعی اراضی پر قبضہ کرنے کے لئے کئی قسم کے مکروفریب سے کام لیا گیا۔ ان کا سب سے بڑا حربہ یہ تھا کہ جب بندوبست اراضی کا عملہ سروے کرنے کی غرض سے گیا تو تمنداروں نے عوام کو بتایا کہ حکومت تم پر ٹیکس عائد کرنے کی غرض سے تمہاری اراضی کا جائزہ لے رہی ہے لہذا اگر تم سے جب زمین کی ملکیت دریافت کی جائے تو ہماری ملکیت ظاہر کرنا۔ چونکہ سرکار ہم پر نہایت مہربان ہے لہذا کوئی ٹیکس اس رقبہ پر عائد نہیں کیا جائے گا۔

جب عوام کو اس دھوکہ کا علم ہوا تو انہوں نے قانونی چارہ جوئی کی کوشش کی مگر اُن کی سرپرستی کرنے والا کوئی نہ تھا اور صاحب اقتدار اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ عوام کے اظہار ناپسندیدگی سے بچنے کی غرض سے انہوں نے اپنی زندگی میں ان زمینوں کی بٹائی کا تقاضا نہ کیا۔ مزید زرعی زمین کے حصول کی غرض سے انہوں نے ہر قسم کے دھوکہ، دھمکی، دھونس اور ناجائز کارروائی کو جاری رکھا۔ جس کے نتیجہ میں قبائلی حدود کے اندر تمندار اکثر وبیشتر اراضی کا مالک بن گیا۔ بعض زرخیز اراضیات کے مالکوں سے جبر دھمکی اور دھوکہ

(1) The Land of Five Rivers P. 249 H.C. Trovisky
(2) The Peoples of Pakistan Yu. V. Gankovisky

سے کام نہ نکل سکا تو اپنے مجسٹریٹی اختیارات کا ناجائز فائدہ اٹھا کر جعلی بیعنامے تیار کروائے۔ سادہ لوح لوگوں کو بھی غریب سبز باغ دکھا کر انہیں اراضی سے محروم کیا گیا۔ ایک عورت جو اپنی قوم میں معزز اور با اثر تھی، ایک تمندار کی منہ بولی بہن بن گئی تمندار اس خاندان کی اراضی ہڑپ کرنے کی غرض سے اس کو ایسے ڈھب پر لے آیا جس سے اس نے یقین کر لیا کہ ایسے صاحب جائیداد اور مخلص بھائی کی موجودگی میں بہن اور اس کے خاندان کو زرعی جائیداد کی ضرورت نہیں ہو سکتی لہذا اس نے تمام جائیداد اپنے منہ بولے بھائی کے نام کر دی۔ جب اس کا خاندان بھوکا مرنے لگا۔ تو تمندار بھائی کو اپنی بہن پر ذرہ بھر رحم نہ آیا۔

ایک اور سردار نے علاقہ پہاڑ کی زرعی زمین حاصل کرنے کی غرض سے ڈھونگ رچایا۔ چونکہ یہ بااختیار تھے اور ان کے ساتھ واقفیت اور یارانہ عوام میں عزت کا باعث ہو سکتا تھا لہذا اس نے ایک سادہ لوح زمیندار سے وعدہ کیا کہ ہر قبائلی مجلس اور ملاقات میں اسے پانچ چھ منٹ کے لئے "درکش" یعنی خلوت کا موقع دے گا۔ اس طرح سے لوگوں میں اس کا اثر و رسوخ پیدا ہو جائے گا کیونکہ عوام کی نظر میں تمندار کا مجلس سے اٹھ کر تم سے تنہائی میں بات چیت کرنا شرف ہوگا، اس طرح سے تمہارا وقار دوبالا ہو جائے گا مگر اس کے بدلے میں تمہیں اپنی اراضی دینا ہوگی۔

جو لوگ تمندار کو اپنی جائیداد کسی صورت میں دینے پر آمادہ نہ ہوئے تو ان کے خلاف کئی قسم کے جھوٹے مقدمات تمندار کی عدالت میں دائر ہو گئے۔ جہاں وہ خود ہی منصف بن بیٹھے۔ ان حالات میں انصاف کی جو مٹی پلید ہوئی وہ عیاں ہے۔ ایسے لوگوں کو حبس بیجا میں رکھ کر سیدھا کیا گیا۔

پہاڑی علاقہ کے لئے سرکاری طور پر بارڈر ملٹری پولیس کی بھرتی ہوتی تھی۔ اس کے لئے ہر قبیلہ سے تعداد مقرر تھی اور سرکاری منظوری سے پہلے تمندار قبیلہ ان کا انتخاب کرتا تھا۔ تمنداروں نے حصول زر کی ایک اور صورت پالی۔ ان ملازمین سے باقاعدہ حصہ تنخواہ ہر ماہ وصول کرنے لگے اور اس طرح سے جلدار (تمندار) بی۔ ایم۔ پی کی ملازمت کو باقاعدہ بولی دے کر بانٹنے لگے۔ اس بولی میں بعض اوقات اہلکار کو اپنی نصف تنخواہ ہر ماہ تمندار کی بھینٹ چڑھانا پڑتی۔

جس قدر مقدمات جرگہ میں پیش ہوتے ان کا فیصلہ تمندار کرتا تھا جس کی امداد کے لئے قبیلہ کی مختلف شاخوں کے سردار (مقدم) مقرر تھے۔ یہ مقدم عام طور پر زیور تعلیم سے محروم ہوتے تھے۔ لہذا تمندار ان لوگوں کے انگوٹھے یا مہریں لگوا لیتا اور پھر ان سے مشورہ کئے بغیر فیصلہ کرتا۔ یہ تمندار بھی جن کو مجسٹریٹی اختیارات حاصل تھے، اکثر و بیشتر ان پڑھ ہوتے تھے جن کو قانون کی ابجد سے بھی ناواقفیت ہوتی تھی۔ ان کے کلرک سارا کام کرتے تھے۔ اگر تمندار فرض شناس ہوتا تو عوام آسان اور سہل انصاف حاصل کر سکتے تھے کیونکہ مقدمان اپنے علاقہ سے پوری طرح واقف اور مقدمہ کے صحیح کوائف سے باخبر ہوتے تھے۔ ورنہ بصورت دیگر انصاف تمندار کے رحم و کرم پر ہوتا تھا۔ چونکہ یہ تمندار ان پڑھ ہوتے تھے۔ لہذا ان کے ہاتھوں قانون کی جو مٹی پلید ہوتی تھی، اس کا اندازہ سابق ڈپٹی کمشنر ڈیرہ غازیخان مسٹر کریکوئیل کی چٹھی سے لگایا جا سکتا ہے جو اس نے افسران بالا کو تمنداروں کے متعلق بھیجی تھی۔

تمنداروں نے عوام کو کچلنے کی غرض سے قتل و خونریزی سے بھی گریز نہیں کیا۔ جب کوئی ان کے ظلم و ستم، جبر و کراہ اور طاقت کے سامنے مدِ مقابل ہوا تو اُسے ٹھکانے لگا دیا جاتا۔ شیر محمد خان مشوری ایک معزز اور نیک نفس مردِ خدا تھا جس کا عوام نہایت ادب و احترام کرتے تھے۔ اس کی ہر دلعزیزی کا یہ عالم دیکھ کر تمندار کو اپنا اقتدار خطرے میں نظر آیا۔ لہٰذا اس نے شیر محمد خان کو ختم کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اِس واقعہ کو ایک بلوچی شاعر نے منظوم کیا جس کو غوث بخش خان گودچانی سے سن کر لکھا گیا:-

بلوچی	اردو
شیر محمد خان لائق بیسا	شیر محمد خان لائق مرد تھا
چھوں لاتو گلا ھبانوئیں	جو غریب لوگوں کی نظروں میں ناپسندیدہ تھا
چیھٹی کھایاں سیاہ آنا	سیاہ آف سے (تمندار نے) چیھٹی لکھی
میہاں خاں تھئی ناویں	میہاں خان کے نام
تھرا شیر محمد کھشنغی این میہاں خان رو ازانی	کہ تم شیر محمد کا کام تمام کردو۔
گیھتئے گوبرے والغاں بلوکھاں اڑ تھبنش مہانی	(لہٰذا) اچھے جوان کی گھوڑی کی لگام روک کر اپنی مہمانی پر لائے
پلنگ پھڑیں تھغاں شیرا	رات کو سونے کے لئے پلنگ دیا۔
گرانڈ ے کھشتنش مہمانی	اور ضیافت کے لئے دنبہ ذبح کیا
وقتا جھترانیاں ہیں یاٹ گلیٹیں	چکی پیستے وقت (پچھلی رات کے حصہ میں) فائر کئے گئے
نیاھتئی بھرڑی دستا چیھنہ ہول لوشیں	مگر (افسوس کہ شیر محمد) اس کے ہاتھ پستول نہ آیا
ناں تاں شاخو بکھوآں	ورنہ تم اور بکھو (قاتل)
نواڑ ھتھاں بوڑ مریانیں	مری قبیلہ کے پاس ضیافت کھانے کے لئے زندہ رہتے
سری مہران مسوریا جسائی گوانجھ نہکائے نامی	سب سے پہلے مہران نامی نے نوبک مشوری کے نام آواز دے کر بتایا۔
شیر محمد خان کھشائے تھیں سیھے موندھائیں زرکانی	کہ شیر محمد خان کو زرکانیوں نے قتل کر دیا ہے
دلدی داسا جلادا کاریاں سبیانی	(شیر محمد خان کے بھائی) جلب نے جواب دیا کہ یہ کام قدرت کے ہیں۔
یا تو نکے کھسوا تشتائی ئیں لشکر بیایان نانی	ایک بات یہ بھی ہے کہ میرا لشکر نہیں (عزیز و اقارب)

جلب خان نے اپنے بھائی شیر محمد خان کا خوب انتقام لیا اور اس کا خونِ ناحق رائیگاں نہ گیا۔

رابرٹ سنڈیمن سکاٹ لینڈ کے شہر پرتھ میں 1835ء میں پیدا ہوا۔ اُس کا باپ فوج میں جرنیل تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کا ملازم تھا۔ سنڈیمن کو 1856ء میں فوج میں کمیشن ملا اور وہ ہندوستان آگیا۔ تحریک آزادی ہند 1858ء کے

دوران وہ تھوڑے عرصہ کے لئے جنگ میں شامل رہا۔ پھر 1859ء میں اُسے انتظامیہ میں بھیج دیا گیا اور 1866ء میں ڈیرہ غازیخان بطور ڈپٹی کمشنر تعیناتی ہوا۔ پھر وہ بلوچستان میں تعینات ہوا۔ جب وہ لس بیلہ کے دورہ پر تھا تو 29 جنوری 1892ء میں انفلوئنزا کے مرض میں مبتلا ہو کر فوت ہوا۔ اور لس بیلہ کے گرجا کے احاطہ میں دفن ہوا۔

سنڈیمن کی ڈیرہ غازیخان میں تعیناتی سے قبل انگریز حکومت اپنے ہمسایہ علاقوں سے عدم مداخلت کے اصول پر کام کر رہی تھی۔ اس اصول کے تحت انگریز اپنے مقبوضہ علاقوں سے باہر کسی قسم کا رابطہ اور واسطہ نہ رکھتے تھے اور ان کے معاملات میں کوئی دخل نہ دیا جاتا تھا۔ سنڈیمن نے چارج سنبھالتے ہی فارورڈ پالیسی پر عمل شروع کر دیا جس کا مطلب تھا کہ اردگرد کے علاقوں سے نہ صرف رابطہ قائم کیا جائے۔ بلکہ اُن کے ساتھ پورا پورا واسطہ رکھا جائے۔ سنڈیمن کی سکیم کا بنیادی اصول ... تمندار کو پوری طرح سے با اختیار اور صاحب حیثیت بنا کر واسطہ اور رابطہ کا ذریعہ بنانا تھا مگر عوام کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس رابطہ کے لئے اُسے امام بخش خان مزاری مل گیا۔ وہ اس سے قبل دیسی کیپٹنڈ افسر کے طور پر 3۔ کیولری میں خدمات سرانجام دے چکا تھا۔ سنڈیمن نے تمنداروں کو مالی لحاظ سے طاقتور بنانے کے لئے انہیں نہروں اور سڑکوں کی تعمیر کے ٹھیکے دیئے اور ان کے ذریعہ قبیلے کے لوگوں کو بھرتی کیا۔

فارورڈ پالیسی کے معنی مختلف اشخاص نے مختلف کئے ہیں۔ اس کی ایک عمومی تعریف یوں کی گئی ہے۔

"اس کا مقصد ایک آزاد قبیلے کو علاقائی، سیاسی، فوجی اور اقتصادی طور پر بغیر جنگ و جدل قابو کرنا اور قبیلے کو ناراض کئے بغیر اُسے فتح کر لینا۔ یہ دوستانہ روابط اور اعتماد کی بناء پر حاصل کیا جاتا ہے۔ بعض حالات میں کسی فریق کی سرپرستی بھی کی جاتی۔ عملی طور پر خاص اور اہم مقامات پر کافی جمعیت کے ساتھ تسلیم شدہ سرحد سے آگے قبضہ کیا جاتا۔ پھر ان مقامات کو سڑکوں اور چوکیوں سے منسلک کر دیا جاتا۔ البتہ قبیلے کو اپنے معاملات طے کرنے میں آزاد رکھا جاتا[1] اور وہ اپنے رسم و رواج کے مطابق اپنے معاملات اپنے سرداروں کے ذریعے نپٹاتے تھے۔ قبائلی سرداروں سے توقع کی جاتی تھی کہ لیوی کے لئے جوان بھرتی کریں گے جن کی تنخواہ حکومت ادا کرے گی۔ تاہم وہ قبیلہ کے ملازم تصور کئے جاتے تھے . . . . اس نظام کا مرکزی مقام سردار کو حاصل تھا۔ جس کے اختیارات کو ہر صورت میں قائم رکھنا تھا۔ خواہ اس کے لئے طاقت کا استعمال ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔"

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے انگریز ڈپٹی کمشنروں کو وسیع اختیارات کا حامل بنا دیا گیا۔ مسٹر اعوان کے مطابق

1. A.B. Awan — Baluchistan – Historical & Political Process P. 151-2, 1985

"اُن کو جو اختیارات حاصل تھے اس کی بناء پر انہوں نے کسی فرد یا قبیلہ کو کسی وقت اور کسی شرط پر اراضی دی۔ اس کے ذریعہ انہوں نے بعض اوقات مکمل قبیلہ کو دوسری جگہ پر لا بسایا۔ انہوں نے قبائلی سرداروں کو مقرر کیا اور بعض جگہ انہیں اس اعزاز سے محروم کیا۔ وہ بھتہ (الاؤنس) وغیرہ روک بھی سکتا تھا اور منظور بھی کر سکتا تھا۔ وہ ٹھیکہ جات اور اعزازات بھی دے سکتا تھا۔ وہ تمام قبیلے کے لئے روزگار کے مواقع روک بھی سکتا تھا۔ اور وہ فراہم بھی کر سکتا تھا۔ وہ جس سے خوش ہوتا تو اُسے انعامات اور خطابات سے نوازتا۔ جب وہ کسی کی سفارش کرتا تو وہ شاذ و نادر ہی نامنظور ہوتی۔ اُن کی سفارش سے خطابات منظور ہوئے۔ اور جب ایک شہزادے سے ناراض ہوئے تو اُسے اپنی گدی چھوڑنا پڑی۔ ان کا عہدہ طاقت اور اعتماد کا سرچشمہ تھا جس کی بدولت کارگزاری سہل تھی۔ ابتدائی انگریز افسروں کی کامیابی کا یہی راز تھا" [1]

سرداری نظام فی الحقیقت جاگیردارانہ استحصال تھا جو انسانی شرف اور حریت کے منافی تھا۔ بہ حالت جمہوری نظام اور اسلامی مساوات کے منافی بھی جس کا پاکستان کے آئین میں ہر باشندے سے وعدہ کیا گیا تھا۔ یہ نظام لوگوں کی اقتصادی ترقی میں بھی سدِ راہ تھا۔ اس نظام میں سردار چونکہ من مانی کر رہے تھے لہٰذا حکومت نے اس نظام کے خاتمہ کے لئے حکم دیا "تاکہ ظلم و ستم اور لوٹ کھسوٹ کی سب راہیں بند ہو جائیں جو اب تک لوگوں پر عذاب کی صورت میں مسلط تھیں۔

خوش قسمتی سے تمنداری نظام قیام پاکستان کے بعد ڈیرہ غازیخان میں ختم کر دیا گیا۔ مگر یہ مکروہ نظام بلوچستان میں اپریل 1976ء تک جاری رہا۔ آخر سرکاری اعلان جاری ہوا جس کی رو سے سرداری نظام جو کسی صورت میں بلوچستان میں مروج تھا اس کو اس اعلان کے بعد فوراً ختم کر دیا گیا۔ اس منسوخی کی بدولت:۔

(۱) کوئی شخص کسی قسم کے جوڈیشنل اختیارات استعمال نہیں کر سکے گا جب تک اُسے حکومت پاکستان نے یہ اختیارات بالخصوص نہ دیئے ہوں۔

(2) کوئی شخص ذاتی جیل خانہ قائم نہ کرے گا۔

(3) کسی شخص کو اختیار نہ ہوگا کہ سرکاری اختیارات کے حصول کے بغیر کسی کو گرفتار کر سکے۔

(4) کسی سے بیگار نہ لے اور نہ ہی کسی شخص کو اس کی مرضی کے خلاف کام کرنے پر مجبور کرے گا۔

(۵) سردار ہونے کی حیثیت سے کوئی نذرانہ یا خراج نقد یا جنس کی صورت میں وصول نہ کرے گا اور نہ ہی طلب کرے گا۔ [2]

---

(1) Baluchistan — Historical & Political Process P. 155 ed. 1985 A.B. Awan

(2) Prime Minister Abolishes Sardari system Information Ministry Islamabad dated 8.4.1976

باب 6

غلام حسین خان مشوری بگٹی

(تمندار انگریز گٹھ جوڑ کے خلاف جہاد)

فارورڈ پالیسی اور نظام تمنداری کے خلاف ایک مرد مجاہد نے ایک محاذ قائم کیا تاکہ انگریز کو مزید قبائل پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کا موقع نہ ملے۔ وہ مردِ مجاہد غلام حسین خان مشوری بگٹی تھا جس نے اپنی جان کا نذرانہ دے کر انگریز کی ہوس ملک گیری کو روکنے کی کوشش کی۔

سکھوں کی حکومت کے انتہائی عروج کے زمانہ میں ضلع ڈیرہ غازیخان کا میدانی علاقہ ماسوائے پچادھ اُن کے قبضہ میں تھا۔ پچادھ سے مراد وہ علاقہ ہے جو رودکوہی (پہاڑی نالوں) سے سیراب ہوتا ہے۔ اس طرح سے پچادھ اور پہاڑی علاقہ آزاد رہا۔ البتہ میدانی علاقے کا انتہائی شمالی اور جنوبی حصے بلوچ قبائل نتکانی، بزدار اور مزاری کی جوانمردی کی بدولت سکھوں کے اثر ورسوخ سے آزاد رہے۔ اگرچہ سکھوں نے علاقہ بزدار اور نتکانی پر قبضہ کرنے کی سرتوڑ کوشش کی مگر نتکانی سردار نواب اسد خان نے سکھوں کو کئی دفعہ خوفناک شکست دی۔ بزدار قبیلہ نے سکھوں کا مقابلہ "خان بند" پر کیا جہاں سے سکھوں کو نقصانِ عظیم برداشت کرنے کے بعد پسپا ہونا پڑا۔ جن علاقے پر سکھوں کا قبضہ تھا ان کی حالت بھی مخدوش تھی اور بغیر اجازت قلعہ دار کوئی شخص شہروں میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔

کوہ سلیمان کا علاقہ قبائل کا ابتدائی کیمپ بن گیا جہاں سے بلوچ قبائل غیر ملکی غاصبوں پر چھاپے مارتے اور بوقت پسپائی پہاڑی سلسلوں میں داخل ہوکر محفوظ ہوجاتے۔ جب انگریزوں نے ڈیرہ غازیخان پر قبضہ جمایا تو بلوچ قبائل آزاد زندگی بسر کررہے تھے اور بہ حالت 1865ء تک برقرار رہی۔ 1866ء میں جب میجر مینجن ڈپٹی کمشنر ڈیرہ غازیخان سے کیپٹن سنڈیمن نے چارج لیا تو اس نے فیصلہ کیا کہ وہ انگریزی سیادت کو آزاد قبائل تک وسیع کرے گا۔

اس مقصد کے حصول کے لئے اس نے بعض قبائلی سرداروں کو اپنا آلہ کار بنایا۔ اُن کے ذریعہ سے وہ کام سرانجام دیئے جو انگریزوں کی عظیم فوجی طاقت کئی سالوں تک پورا نہ کرسکتی تھی۔ سنڈیمن نے مزاری سردار امام بخش خان کو اپنے مقصد کے لئے سب سے زیادہ موزوں پایا۔ لہٰذا اس کو رام کرنے کی غرض سے اُسے خطابات اور جاگیر سے نوازا۔ امام بخش خان کے منشا کے مطابق اُس کے قبیلہ کے جوانوں کو ملیشیا میں بھرتی کیا گیا اور اس طرح سے انگریز کی نوازش سے

سے امام بخش خان بااثر سردار بن گیا۔ دنیاوی جاہ و جلال کی خاطر امام بخش خان دیگر قبائلی سرداروں کو بھی انگریز کی غلامی قبول کرنے پر رضامند کرنے میں کامیاب ہوگیا۔ سنڈیمن کی بدولت تمنداری نظام اس بھیانک اور مکروہ صورت میں نمودار ہوا جس کی ایک جھلک دکھائی جا چکی ہے۔ اس سے قبل تمندار اگرچہ کافی اثر و رسوخ کے مالک ہوتے تھے مگر وہ اپنے قبیلہ کے لوگوں سے کسی منفرد جائیداد یا حیثیت کے مالک نہ تھے جیسا کہ موہن لعل سردار بہرام خان مزاری کے متعلق تحریر کرتے ہیں۔ سردار قبیلہ موروثی ہونے کے ساتھ ساتھ قابلیت کی بنا پر چنا جاتا تھا اور جب وہ سردار عوام کی فلاح و بہبود کے منافی ہوتا تو اُسے منصب سے علیحدہ کر دیا جاتا۔ سنڈیمن نے غیر معروف اور قوم کے ٹھکرائے ہوئے آدمیوں کو جاگیر، خلعت اور خطابات سے آراستہ کرکے اس رتبہ پر پہنچایا جہاں سے وہ انگریز کی منشا کے مطابق کام دے سکیں۔

بروس لکھتا ہے کہ

"سر ہنری گرین جو بلوچوں کو اچھی طرح سے جانتا تھا، اس بات پر ہنستا تھا کہ بلوچ سرداروں کو اپنے قبیلہ پر کوئی اختیار حاصل نہیں"[1]

سنڈیمن اور امام بخش خان کی کوششوں سے اکثر تمندار انگریز کے حامی بن گئے اور قبائل کی باگ ڈور بغیر کسی جدوجہد کے انگریزوں کے ہاتھ آگئی۔ البتہ بگٹی قبیلہ کا سردار غلام مرتضیٰ خان جو نہایت دلیر اور نڈر آدمی تھا، امام بخش خان اور سنڈیمن کے دام فریب میں جلد نہ آیا بلکہ اس کو شیشہ میں اتارنے کے لیے کافی تگ و دو کرنا پڑی۔ انگریز کی چالاکی اور روباہی سے یہ سردار بھی امام بخش خان کے ذریعہ پھنس گیا۔ اور اس کو حلیف بنانے کی خاطر سیم و زر کے دروازے کھول دیئے گئے۔ غلام مرتضیٰ خان نے جب اغیار کے طوقِ غلامی کو قبول کر لیا تو آزاد منش بگٹی اس کے خلاف ہوگئے۔ ان مجاہدین کا سردار غلام حسین خان مشوری تھا۔ غلام حسین خان نے غلام مرتضیٰ خان کو ہر ممکن طریقے سے انگریز کی جھولی میں گرنے سے بچانے کی کوشش کی مگر سیم و زر کی چمک چونکہ اسے غلامی اور آزادی کی تفریق سے بے نیاز کر دیا۔ ان حالات میں غلام حسین خان نے سردار کی اطاعت اور احکام ماننے سے انکار کر دیا۔

انگریزوں کو امید تھی کہ وہ غلام مرتضیٰ خان کو راضی کرکے تمام بگٹی قبیلہ کو اپنی مٹھی میں کرلیں گے مگر غلام حسین خان کی بغاوت ان کے لیے سردرد بن گئی۔ ایک دفعہ ایک انگریز نے غلام مرتضیٰ خان بگٹی سردار سے کہا کہ:-

"اگر تم میں کچھ طاقت ہوتی تو غلام حسین کو تم اس کی بری کارگزاریوں سے روک سکتے"

اس پر غلام مرتضیٰ خان نے جواب دیا:-

"نہیں! کیونکہ سرکار ہماری امداد نہیں کرتی۔ اگر تم میری امداد کرو تو میں اُن

---

1) Forward policy & its result p. 18 R.I. Bruce.

روک سکتا ہوں۔"

اس نظریہ کے ماتحت سنڈیمن نے اپنی فارورڈ پالیسی میں یہ تبدیلی کی کہ:۔

موروثی سرداروں اور ملکوں کو جو بلوچوں اور افغانوں کے قبائلی سردار ہوں، اپنے پاؤں پر کھڑا کر دیا جائے تاکہ اُن سے سرحدی معاملات میں کام لیا جائے۔ اس کے علاوہ اُن کے رجحانات اور کارگذاریوں پر کڑی نگرانی کی جائے چونکہ ان کا موجودہ اقتدار اسی پالیسی کا نتیجہ تھا لہٰذا اگر ہم نے اب اُن کی پشت پناہی چھوڑ دی تو اُن کا اقتدار پھر خاک میں مل جائے گا۔"

سنڈیمن نے قبائلی سرداروں کے اثر و رسوخ کو سیم و زر سے بڑھا دیا۔ اس وقت جمال خان لغاری پہاڑی بلوچوں اور انگریزوں کے درمیان واسطہ بنا ہوا تھا۔ انگریز اگرچہ اُس کے مخالف تھے مگر انہوں نے اپنی مصلحت کی بناء پر اُسے اپنا بنائے رکھا۔ اور اس وقت کے منتظر تھے جب وہ اپنی مطلب براری کے بعد اُسے فالتو پرزہ سمجھ کر نکال دینا چاہتے تھے۔ ایک خط میں سنڈیمن اپنے دست راس بروس کو لکھتا ہے:۔

"میرے عزیز! جمال خان کو اُس وقت تک تھپکتے رہو جب تک ہم اُس کو اور اس کے کھیل کو ختم کر کے نہ رہیں کیونکہ اُس کے بغیر نہ تو ہم ضلع میں کوئی کام کر سکتے ہیں اور نہ ہی سرحدی قبائل میں۔"

اس طرح سے بلوچی سرداروں کو ساتھ ملا کر سنڈیمن فارورڈ پالیسی پر کاربند ہو گیا تاکہ افغانستان اور بلوچستان پر انگریزی سیادت کے لئے راہ کھل جائے مگر ان عزائم کو کوہستان مگسی کے ایک ولیر نے فوراً بھانپ لیا۔ اس نے بلوچوں کو انگریزی کی سیادت کے مضمرات سے آگاہ کیا۔ غلام حسین خان کی مجاہدانہ للکار کو تمنداروں نے درخور اعتنا نہ سمجھا مگر دلیر اور آزادی پسند عوام نے اس کی آواز پر لبیک کہا۔

قبائلی عصبیت کو ہوا دے کر گورچانی، لنڈ، مزاری اور دیگر تمنداروں نے غلام حسین خان اور اس کے آزادی پسند رفقاء کے خلاف محاذ قائم کیا۔ انگریز مؤرخین نے غلام حسین خان کو ڈاکو اور راہزن کا نام دیا ہے جو استعماری قوموں کا مخصوص طریق کار رہا ہے جس سے وہ اپنے مخالفین اور وطن پرست عناصر کو بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سامراجی اقوام اُن افراد کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں جو اپنے وطن سے غداری

---

(۱۰۱) The forward policy & its results p.16 R.I. Bruce

(۱۰۲) " " " " " p.19 " "

(۱۰۳) The forward Policy & its results R.I. Bruce

کریں یا انہیں دنیاوی فائدے دے جائیں۔ البتہ ان افراد پر پوری گرفت کرتے ہیں جو اُن کے مفاد کے خلاف ہوں یا اپنی عزتِ نفس کو برقرار رکھتے ہوئے اپنے حقوق اور وطن کے لئے سینہ سپر ہو جائیں۔ اس نظریے کی تشریح کرنے کے لئے ایک مثال کافی ہوگی۔

جب کوئی یورپ کا باشندہ رنجیت سنگھ کی ملازمت میں داخل ہوتا تھا تو اُسے داڑھی مونڈنے اور گائے کا گوشت کھانے سے اجتناب کا پابند ہونا پڑتا تھا اور حلف وفاداری کے علاوہ اُسے کسی پنجابی لڑکی سے بیاہ بھی کرنا پڑتا تھا تاکہ وہ حقیقی معنوں میں اُن کا وفادار بنا رہے۔ وان کورٹ لینڈ جو ڈیرہ غازی خان کا انگریزی حکومت کا پہلا ڈپٹی کمشنر تھا، مدت تک حکومت لاہور سے اعلیٰ تنخواہ لیتا رہا مگر جب وقت آیا تو وہ اپنے حلف سے فرار ہو کر نمک حرام بن گیا۔ اس نے اپنی ماتحت فوج کو انگریزوں کے ساتھ شامل کر کے حکومت لاہور کے خلاف جنگ میں حصہ لیا۔ ایسے غدار کی ایک انگریز میجر لارنس اپنی کتاب میں یوں تعریف کرتا ہے:۔

"کورٹ لینڈ نے ہمیشہ فوج میں ملازمت کی ہے جس کے ماتحت ایک بریگیڈ یا ڈویژن فوج ہوتی تھی۔ وہ شریف النفس، صابر اور باعزت آدمی ہے۔"

اب ایک اور یورپین کے متعلق[2] اُس کے الفاظ دیکھئے جو اس کی قوم کو کوئی فیض نہ پہنچا سکا اور انگریز قوم کے دل میں نپولین کی جنگوں کی تلخی ابھی تک برقرار تھی۔ ادی ٹیبل (ابوطویلہ) جو فرانسیسی تھا، اس کے متعلق دوسرے رنگ میں تحریر کرتا ہے۔ اُس کے مطابق "اس کو کسی مہذب قوم پر حاکم مقرر نہیں کیا گیا تھا بلا اس کی تعیناتی کا مقصد کوئی با اصول حکومت کا نظام چلانا نہیں بلکہ ایک ایسی قوم کو بیبس ڈالنا ہے جو غلامی کا جوا اسی طرح سے قبول کرتی ہے جیسے ایک جنگلی بیل جال میں پھنسنے کے بعد کرتا ہے۔ اگر اُن کو ایک لمحہ ایسا میسر آ جائے جب اُن کا حاکم بے خبر ہو تو وہ حکومت کی گرفت سے آزاد ہو جائیں۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے۔ کہ وہ درندوں کے درمیان رہ کر درندوں کی طرح عمل کرتا ہے۔"

انگریز کے طرفدار قبائل نے ان کی شہ پر غلام حسین خان اور اس کے رفقاء پر متعدد بار چھاپے مارے تاکہ انگریز کا حق نمک ادا کر سکیں۔ انگریز کی حمایت میں سب سے زیادہ سرگرم مزار خان لنڈ اور غلام حیدر خان گورچانی تھے۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ غلام حیدر خان صرف سنڈیمن کی کرم نوازی سے سردار بن گیا تھا ورنہ وہ جمعداری کی ملازمت پر گزارہ کرتا تھا۔ غلام حیدر خان سنڈیمن کی عنایات کا شکرانہ اس طرح بجا لایا

---

(1) The court and camp of Ranjeet Singh P.151 ed. 1973 W. G. Osborne
(پہلی مرتبہ یہ کتاب ۱۸۴۰ء میں شائع ہوئی)

(2) (3) Adventures of an Officer in the Service of Ranjeet Singh P.43 1975 Major H. M. L. Lawrence.

کہ اُس نے سنڈیمن کے مشن کی تکمیل میں سدِ سکندری بننے والے غلام حسین خان کو اپنا ذاتی دشمن سمجھا اور اُس کی پامالی کے لئے سنڈیمن سے بھی بڑھ چڑھ کر کوشش کرنے لگا۔ محاذِ آزادی کے رہنما غلام حسین خان نے بھی جوابی حملے کئے اور انگریز کے حامیوں کو نقصان عظیم پہنچایا۔ ایک حملہ میں غلام حیدر خان گورچانی بمعہ رفقا مجاہدین کے ہاتھوں مارا گیا۔ سنڈیمن کو اپنے پروردہ کی ہلاکت کا سخت افسوس ہوا اور اس کے بھائی مزار خان کو ان خدمات کے صلہ میں محمد پور میں جاگیر دی۔

چونکہ جمال خان لغاری اندرونی طور پر غلام حسین خان کا طرفدار تھا اور اُس نے محاذ آزادی کی خاطر حدیانی (لغاری) اور کھتران علاقوں میں پناہ گاہیں بنا رکھی تھیں لہٰذا جمال خان کو بے اثر کرنے کی خاطر اُس پر غبن کا مقدمہ قائم کیا گیا۔ یہ رقم اُسے نہر مانکہ وغیرہ کی توسیع کے سلسلہ میں ملی ہوئی تھی۔ سنڈیمن نے بروس کو راجن پور سے خفیہ طور پر بھیجا جس نے جمال خان لغاری کے کاردار کی کتابوں اور رجسٹر کی پڑتال کی۔ جمال خان پر مقدمہ چلا جس میں وہ بری ہوگیا۔ کیونکہ اس کا کاردار ہری رام اپنے بیان سے منحرف ہوگیا تھا۔ تاہم سنڈیمن نے ہری رام کو سات سال قید اور ایک ہزار روپے جرمانہ کی سزا دی کیونکہ اُس نے سنڈیمن کے حسب منشاء بیان نہ دیا تھا۔

جمال خان کی امداد سے محروم ہو کر بھی تمندار انگریز گٹھ جوڑ کے مقابلہ میں مجاہدین نے حوصلہ نہ ہارا۔ انہوں نے کئی بار انگریزی علاقے پر حملے کئے اور اُن قبائل کو سخت سزا دی جو غیر ملکی حکمرانوں سے تعاون کر رہے تھے۔ غلام حسین خان نہایت دلیر اور شجاع قائد تھا اور غلام مرتضےٰ خان کا ساتھ چھوڑنے سے پہلے اُس کے پہلو بہ پہلو کئی لڑائیوں میں دادِ شجاعت دے چکا تھا۔ اس کی بہادری اور دلیری کی داد بلوچی شعرا نے خوب دی ہے۔ جنگ چھبنڑی کا شاعر غلام حسین خان کو ان الفاظ میں خراجِ عقیدت پیش کرتا ہے :۔

چاکری نقشئے جنگاں باطلا پالزا

گڈ تر بالاچھا غلام حسینا نوخ کھنزا

یعنی میر چاکر خان اعظم کے جنگی کارناموں کی تجدید باطل خان اور بالاچ خان گورگیج کے بعد غلام حسین خان نے کی۔ سنڈیمن کے چیلے جب غلام حسین خان کو فوجی طاقت سے نہ کچل سکے تو اُس نے مشوری و شنبانی (بگٹی قبیلے کی شاخیں) قبائل کو دھمکیوں سے مرعوب کرنے کی کوشش کی۔ سنڈیمن نے دھمکی دی کہ اگر انہوں نے اطاعت قبول نہ کی تو اُن کو بہت جلد دنیا کے گھاٹ اتار دیا جائے گا مگر یہ فسوں بھی آزادی کے متوالوں پر بے اثر ثابت ہوا۔ اب سنڈیمن نے پینترا بدلا اور غلام حسین خان سے صلح اور صفائی سے رہنے کی خواہش کا اظہار کیا اور باہمی اختلافات کو طے کرنے کی غرض سے بلوچ سرداروں کا اجلاس طلب کیا تاکہ انگریزوں اور بلوچ قبائل کے درمیان متنازعہ امور کا پُرامن طریقہ سے تصفیہ ہو سکے۔ غلام حسین خان بھی سنڈیمن کی دعوت پر مجاہدین کا نمائندہ بن کر آیا مگر سنڈیمن اس کی جانبازی، دلیری اور حب الوطنی کی

کی قدر نہ کرسکا ۔ اور بھری محفل میں آداب سفارت کے خلاف غلام حسین خان کو ڈاکو کے نام سے خطاب کیا ۔ غلام حسین خان اس جرگہ سے اُٹھ کر چلا گیا ۔ اُس نے سنڈیمن کے چیلنج کو قبول کر لیا اور اپنی جان آفرین قربان کر کے ثابت کیا کہ وہ ڈاکو نہ تھا بلکہ آزادی پسند لوگوں کی تمنا کا مرکز تھا ۔ اس نے عملی طور پر سنڈیمن کو درس دیا کہ مجاہد اپنے حق اور وطن کی خاطر جان دے کر بھی گھاٹے میں نہیں رہتا ۔ بلکہ اُس کو شہادت کا درجہ نصیب ہوتا ہے جس سے ہزاروں دلیر اور شجاع درس آزادی لیتے ہیں ۔

غلام حسین خان نے مدافعانہ پالیسی پہ کاربند رہنے کی بجائے جارحانہ طریق کار پر عمل کرنا شروع کر دیا کیونکہ اب اس کا کام کٹھن اور مشکل ہو چکا تھا ۔ تمنداروں نے اپنی خود غرضی کے تحت انگریز کی فوج کے لئے مخبری کا کام سنبھال لیا جس کی وجہ سے اُن کے ایجنٹ غلام حسین خان کی نقل و حرکت کی اطلاع سنڈیمن اور اُس کے دست راست بروس کو بھیجتے رہتے تھے ۔ دشمن کی بھاری تعداد کے پیش نظر اُس نے گورچانی قبیلہ پر حملہ کیا ۔ وہ 26 جنوری 1867ء کو ڈیڑھ ہزار مجاہدین کے ہمراہ ہڑند کے قریب تھل علی محمد اور ملحقہ علاقہ پر حملہ آور ہوا ۔ اگر انگریز کی نظر سے دیکھا جائے تو غلام حسین خان ڈاکو تھا مگر ڈیڑھ ہزار کا لشکر غلام حسین خان کی ہر دلعزیزی اور اہم مقصد کی غمازی کرتا ہے ۔ اُس کے لشکر میں مری، بگٹی اور کھتران قبائل کا عنصر بھاری تھا ۔

ان قبائل کی آبادی 1867ء میں اندازاً چالیس ہزار کے لگ بھگ ہوگی ۔ گویا ان قبائل کے بچے، عورتیں اور بوڑھے مردوں کے علاوہ ہتھیار بند مردوں کا تقریباً دسواں حصہ میدان جنگ میں لا کھڑا کیا جو آبادی کا بہت بڑا حصہ ہے ۔ اس سے عیاں ہوتا ہے ۔ کہ اس جنگ کا مقصد ڈاکہ زنی نہ تھا ۔ بلکہ نہایت عظیم اور مقدس مقصد تھا جس کے لئے ان دلیروں نے اپنی خدمات پیش کیں ۔

> مورلینڈ[1] کے مطابق : " بوقت ضرورت ایک اچھی حکومت زیادہ سے زیادہ کل آبادی کا چھٹا حصہ میدان جنگ میں لا سکتی ہے مگر اس کے لئے بتدریج تنظیم کی ضرورت ہے جو کئی سال تک جاری رہے ۔ عملی طور پر یہ ناممکن ہے کہ اچانک کسی مہم پر اس قدر حصہ آبادی کو میدان جنگ میں لایا جا سکے ..... ۔ پہلی جنگ عظیم میں فرانس نے 1/3 اور جرمنی نے 1/3.2 حصہ آبادی کو فوج میں لا کھڑا کیا ۔"

23 جنوری کو راجن پور میں مخبروں نے بروس کو غلام حسین خان کی نقل و حرکت کی اطلاع دی جس نے اپنے حلیف تمنداروں کی امداد سے تمام اہم مقامات کی ناکہ بندی کر دی ۔ امام بخش خان مزاری نے سات سو سوار روانہ کئے ۔ غلام حسین خان درہ کھوسڑا سے میدانی علاقہ میں داخل ہوا ۔ اور وہاں سے تھل علی محمد پر حملہ آور ہوا جہاں کے باشندے اُن کی آمد سے قبل قلعہ بند ہو گئے تھے ۔ معمولی جھڑپوں کے سوا کوئی خاص لڑائی نہ ہوئی ۔ گورچانیوں کو درس عبرت دینے کے لئے اُن کے مال مویشی چھین لئے گئے ۔ جب مجاہدین کی واپسی ہوئی ۔ تو درہ کھمبی پر گورچانی، نبی لنڈ اور انگریزی رسالہ مقیم قلعہ ہڑند سے اُن کا مقابلہ ہوا ۔ اگرچہ

1. India at the death of Akbar P. 19 W.H. Moreland

مجاہدین نے ڈٹ کر تلوار سے مقابلہ کیا مگر رسالہ کی رائفل فائرنگ سے اُن کو شدید جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس جنگ میں نوے بگٹی، ستر مری اور پچانوے کھتران دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہوئے۔ انگریزوں کی طرف سے ترپن افراد مارے گئے۔ لشکر کی پسپائی کے بعد غلام حسین خان نے اپنے چار رفقاء کے ہمراہ آخیر دم تک مقابلہ کیا۔ 28 جنوری کو سنڈیمن جائے وقوعہ پر پہنچا جہاں غدارانِ وطن نے شہید کا سر پیش کیا۔ سنڈیمن اس سر کو اپنی فتح کا تمغہ جان کر جام پور لایا جہاں تحصیلدار جام پور کے حکم سے اس کو دفن کر دیا گیا۔ کچھ عرصہ بعد غلام حسین خان کے رشتہ داروں کو جام پور سے سر کو جا سے دفن سے نکالنے کی اجازت مل گئی اور انہوں نے اپنے وطن میں اُسے دھڑ کے ہمراہ دفن کیا۔

اگرچہ انگریز نے غلام حسین خان کو بار بار چور اور ڈاکو کے نام سے یاد کیا ہے مگر اصلیت پھر بھی اُن کے قلم سے نہیں چھپ سکی اور دل کی بات آخر صفحہ قرطاس پر آ گئی۔ بروس اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ:-

"غلام حسین خان کا حملہ ہر چند دراصل سنڈیمن کی فارورڈ پالیسی کو ناکام کرنا تھا مگر غلام حسین خان کی موت سے یہ تمام منصوبے پاش پاش ہو گئے۔"

گویا غلام حسین خان کی موت بلوچستان اور ڈیرہ غازیخان کے قبائل کی آزادی کی موت اور انگریز حکومت کی فارورڈ پالیسی کی فتح تھی۔

میجر اوٹرام سندھ کے قانون کا حوالہ دیتے ہوئے غلام حسین خان کے متعلق اپنے خط میں لکھتا ہے:

"پہلے نظام میں سردار کے ساتھ بلوچ تعاون کرتے تھے اور اس طرح سے ہر غیر ملکی کے خلاف دفاع کرتے تھے کیونکہ اُن میں سے ہر ایک اپنے مال و متاع کو محفوظ رکھنا چاہتا تھا۔ ان سرداروں کے پاس صرف بلوچ قبیلہ کے لوگ ہی واحد سپاہ ہوتی تھی۔ وہ ایک دوسرے کے ساتھ خواہ کتنی ہی خانہ جنگی کریں مگر ایسا کبھی دیکھنے میں نہیں آیا اور نہ ہونا چاہیئے کہ وہ اپنے مشترکہ دشمن کے خلاف سینہ سپر نہ ہو گئے ہوں۔ وہ کسی طاقتور متحدہ طاقت سے مغلوب ہو جائیں تو پھر علاقہ کی واقفیت اور عوام کی ہمدردی کی بدولت وہ بہت بڑی مصیبت کا پیش خیمہ بن سکتے ہیں۔ ویسے اگر حالات ٹھیک ہوں تو کوئی شخص بھی بے گھر ہو کر اپنے علاقہ میں لوٹ مار کرنے کا روادار نہیں ہو سکتا"[1]

غلام حسین خان اگرچہ ان پڑھ تھا مگر کوہستان کی آزاد فضا نے اُسے نڈر دلیر اور بلند حوصلہ بنا دیا۔ اُس نے اپنی خداداد بصیرت سے انگریز کے بلوچستان پر عزائم کو تاڑ لیا تھا اور ان کے راستہ کو مسدود کرنے کی خاطر زبردست طاقت سے ٹکرا گیا۔ اگرچہ غلام حسین خان اپنے مقصد میں دیگر قبائل کی تنگ نظری اور سیم و زر کے لالچ کے باعث کامیاب نہ ہو سکا مگر اس ظاہری شکست کے باوجود وہ اپنے مقصد میں کامیاب رہا۔ مومن انجام اللہ کے ہاتھ میں سونپتا ہے۔

غلام حسین خان کی شہادت کے بعد کچھ عرصہ تک کلو خان، باطل خان، اور حیدر خان نے جنگی کارروائیاں جاری رکھیں۔

1) Conquest of Sinde P. 479 Major. J. Outram

مگر اُن میں غلام حسین خان کا ولولہ اور جانبازی مفقود تھی ۔ چونکہ کھتران قبیلہ نے انگریزی حکومت کے ساتھ دوستانہ تعلقات جوڑ لیئے تھے اور دو ہزار روپے بطور جرمانہ بھی ادا کر دیا تھا لہذا مجاہدین نے کھتران علاقہ سے نکل کر بجرانی مری قبیلہ میں اپنا مستقر قائم کیا ۔ اور وہاں سے چھوٹے چھوٹے گوریلا دستے مصروف عمل رہے ۔ اِن چھاپہ مار دستوں کو گورچانی ، لنڈ اور دیگر قبائل کی مخبریوں کی وجہ سے چنداں کامیابی نہ ہوئی اور ایک سال کی جد و جہد کے بعد یہ دستے منتشر ہو گئے ۔

غلام حسین خان کوہ سلیمان کے آسمان کا آزاد شاہین تھا جس کی موت پر آزاد قبائل کی غلامی کے لیئے دروازے کھُل گئے ۔ مری اور کھتران قبائل نے 1867ء میں انگریزوں سے طوق غلامی قبول کیا ۔ 1876ء میں خان قلات اور انگریزوں کے درمیان عہد نامہ ہُوا جس سے انگریز پوری طرح سے اِن علاقوں میں دخل انداز ہو گئے ۔

باب 7

میر یوسف علی خان مگسی

انگریزی دور کے تمنداروں کی تصویر وہی ہے جس کا اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ تاہم یہ خیال کرنا بھی غلط ہوگا کہ تمام تمندار اسی قبیل کے تھے۔ اللہ نے انہی لوگوں میں ایک مردِ غیور اور قوم کا درد رکھنے والا بھی پیدا کیا جس کا نام میر یوسف علی خان مگسی تھا۔ یہ وہ دور تھا جب انگریز بلوچوں کی سرزمین پر قابض ہو چکا تھا جس کی وجہ سے بلوچوں کے قومی انحطاط کا تاریک ترین دور شروع ہو چکا تھا جس میں بلوچی تمندار اور انگریز بلوچ نوجوانوں کے تمام اوصاف حمیدہ کو کچلنے کی پوری کوشش کر رہے تھے اور ان کی ترقی کی تمام راہیں مسدود کرنے کے در پے ہو گئے۔ ایسے حالات میں وہی ہوا جیسے فرعون کے گھر میں حضرت موسیٰؑ کی پرورش۔ ایک تمندار گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا جس نے اس ظالمانہ نظام کے خلاف آواز بلند کی۔ اس تاریک دور میں جب اکثر و بیشتر تمندار اپنے عوام کو زیورِ علم سے محروم رکھنے کی غرض سے سرکاری سکول کھولنے کی اجازت دینے کے روادار نہ تھے اور ان کی لوٹ مار اور جبر و تشدد نے مالی اور ذہنی طور پر عوام کو مفلوج کر دیا تھا تو قدرت نے بلوچستان کے ایک غیر معروف قصبہ سے میر یوسف علی خان مگسی کو قوم کے درد سے نواز کر ابھارا۔ اس نے انتہائی مشکل حالات میں عوام کی راہنمائی کی۔

میر یوسف علی خان ۱۹۰۸ء میں نواب قیصر خان تمندار جھل مگسی کے ہاں پیدا ہوا۔ آپ ان کے دوسرے بیٹے تھے۔ قیصر خان ایک محب وطن اور عوام کا خیر خواہ سردار تھا اور اس نے جب انگریزوں کی منشا کے مطابق اپنے عوام کو ذلیل و رسوا نہ کیا تو اسے حکومت سے عدم تعاون کی سزا میں ملتان جلاوطن کر دیا گیا۔ میر یوسف خان بھی ان کے ہمراہ تھے۔ وہ فطری طور پر بڑے ذہین تھے اور شعر و شاعری کی مشق بھی کرتے تھے۔ ان کا تخلص عزیزؔ تھا۔ وہ ابھی لڑکے ہی تھے کہ لاہور کے ایک جریدے میں ان کا ایک مضمون بعنوان "فریاد بلوچستان" شائع ہوا۔ اس جرم میں اسے ایک سال کے لئے قید کر دیا گیا۔ انہوں نے لاہور سے ایک اخبار جاری کیا جس کا نام "آزاد" تھا۔ اس کا مدیر عبدالعزیز خان کرد تھا۔ 1930ء میں عبدالعزیز خان کے ایماء پر ایک خفیہ سیاسی تنظیم قائم کی گئی جس کا نام "انجمن اتحاد بلوچاں" تھا۔ جب میر یوسف علی خان قید سے رہا ہوئے تو انجمن کے ممبروں نے اُس کا والہانہ استقبال کیا اور وہ اس کے پُرجوش ممبر اور پھر صدر بن گئے۔ 1933ء میں انہوں نے پہلی بلوچ کانفرنس جیکب آباد کے مقام پر منعقد کی۔ اس میں انہوں نے ایک نظم پڑھی جس

جب محمود خان نے وفات پائی تو اس نے اپنا جانشین نامزد نہیں کیا تھا۔ شمس شاہ میر محمود کے بیٹے محمد انور خان کے حق میں تھا جبکہ قبائلی سردار میر محمود خان کے بھائی میر اعظم خان کے حق میں تھے۔ یوسف علی خان نے میر اعظم خان کے بیٹے میر احمد یار خان سے رابطہ قائم کر رکھا تھا اور انہوں نے اعظم خان کے حق میں مظاہرے شروع کرا دیئے اور ان مظاہروں کو "منگس مظاہرہ" کہا جاتا ہے۔ آخر کار میر اعظم خان کو خان قلات تسلیم کر لیا گیا اسی دوران میں انہوں نے ایک پمفلٹ بنام "شمس گردی" جاری کیا اور اس کی نقول برطانوی پارلیمنٹ کو بھیجیں جس میں شمس شاہ کے مظالم کو بے نقاب کیا گیا جو آخر شمس شاہ کو لے ڈوبا اور اسے ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اس سے پہلے انہوں نے کراچی سے کئی اخبارات جاری کئے جن کو حکومت نے یکے بعد دیگرے بند کر دیا۔

میر یوسف علی خان کی ہر دلعزیزی سے مجبور ہو کر حکومت نے 1933ء میں ان کو ان کے بھائی گل محمد خان کی جگہ تمندار مقرر کیا۔ انہوں نے 1934ء میں دوسری بلوچ کانفرنس منعقد کرائی تاکہ بلوچوں کو ایک محاذ پر متحد کیا جا سکے۔ آپ نے بلوچوں کو زیورِ علم سے آراستہ کرنے کے لئے جھل میں جامعہ یوسفیہ کے نام سے ایک درسگاہ قائم کی جس کے تمام مصارف خود برداشت کئے۔ طلبا کی رہائش، کتب اور خوراک کے جملہ اخراجات بھی اپنے ذمہ لے لئے۔ انہوں نے مخلص نوجوانوں کی حوصلہ افزائی کی اور ان کے تعاون سے ہر ضلع میں نوجوان بلوچوں نے رسالے اور اخبارات شائع کرنے شروع کئے۔

چونکہ میر یوسف علی خان بلوچوں میں نہایت ہر دلعزیز تھا لہٰذا ان کی یہ شہرت اور عوام سے دلچسپی انگریزوں کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ دوسری بلوچ کانفرنس منعقدہ 1934ء کے بعد ان کی گرفتاری کے مشورے شروع ہوگئے مگر ان کے انگلستان چلے جانے کی وجہ سے اسے عملی جامہ نہ پہنایا جا سکا۔ ان کا قیام انگلستان میں بہت مختصر تھا اور وہ بہت جلد واپس وطن آگئے۔

بمبئی سے روانگی اور واپسی کے موقعوں پر وہ قائد اعظم محمد علی جناحؒ سے ملاقات کرتے رہے۔

اس دور میں جبکہ وہ عالم شباب میں بلوچوں کی احیاء اور تمنداروں کے ظلم و تشدد سے عوام کو بچانے کی کوشش کر رہے تھے 1935ء میں کوئٹہ کے زلزلہ میں دار فانی سے کوچ کیا۔ یہ مرد مجاہد منزل کی طرف صرف رہنمائی کر کے اپنے عوام سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا اس وقت ان کی عمر صرف ستائیس برس تھی۔

میں ان کے خیالات کی عکاسی ہوتی ہے ۔

میں اگر چاہوں تو ذرے کو بیاباں کردوں
قطرۂ آب میں پیدا سر طوفاں کردوں
یہ ارادہ ہے کہ اسلام کا خادم بن کر
ساری دنیا کو نئے سرے سے مسلماں کردوں
پھر وہی بھولا سبق یاد دلاؤں سب کو
ہر بلوچ کو غرض عامل قرآں کردوں
جی میں آتا ہے کہ پھر طور کو آباد کروں
آتش دل سے پہاڑوں میں چراغاں کردوں
جوش میں آکے اگر نعرہ الا ماروں
حق و باطل کے تفاوت کو نمایاں کردوں
اس قدر نالہ فشاں بزم جہاں میں ہوجاؤں
ذرے ذرے میں بپا حشر کا طوفاں کردوں
میں وہ مالی ہوں اگر کھول دوں دل کی سوتیں
خشک صحراؤں میں گل و ریحاں کردوں
اسی ایقان ابراہیم کا محدث ہوں عزیزؔ
اب بھی آتش کو اگر چاہوں گلستاں کردوں

قید سے رہائی کے بعد انہوں نے شمس شاہ کے ظلم کے خلاف احتجاج کے طور پر اپنے قبیلے کے ہمراہ ہجرت کی۔ اخبار "زمیندار"، "سیاست"، "انقلاب" وغیرہ نے مگسی قبیلہ کی خوب حمایت کی۔ اس زمانے میں بلوچستان پر انگریزوں کی طرف سے شمس شاہ بطور وزیراعظم، قلات پر حاوی تھا۔ بظاہر میر محمود خان، خان قلات تھا مگر شمس شاہ نے ریاست پر اپنی گرفت انگریزوں کی خاطر بڑی سخت کر رکھی تھی۔ اس کی اجازت کے بغیر کوئی شخص بلوچستان میں داخل نہیں ہوسکتا تھا۔ اخبار پڑھنا جرم تھا اور باہر سے کوئی اخبار حدود بلوچستان میں نہیں آسکتا تھا۔ کئی بلوچ سردار اس کے حکم سے نظر بند اور قید کردیئے گئے تھے اس کا دور عموماً شمس گردی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اس ظلم کے خلاف میر یوسف علی خان نے لاہور سے اخبار "مساوات" جاری کیا۔

باب 8

انگریزی دورِ حکومت

جب دیوان مولراج انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوا تو بہت سی سکھ افواج نے اس کا ساتھ دیا اور اس کی حمایت میں لڑنے کے لئے فوجیوں کی ٹولیاں دیوان مولراج کے جھنڈے تلے جمع ہونا شروع ہو گئیں۔ بہت سے سکھ امراء جو سردار کے لقب سے خالصہ حکومت کی طرف سے ملقب تھے وہ بھی مولراج کے حامی بن گئے۔ جس طرح مسلمان سلاطین کے دور میں لفظ امیر استعمال ہوتا تھا اسی معنی میں سکھوں کے ہاں لفظ سردار تھا۔ انگریزوں میں اس کا مترادف لارڈ ہے۔ گویا سکھ حکومت کے کئی نامور ستون مثلاً شیر سنگھ، خوشحال سنگھ مورار یہ رتن سنگھ، سکھا سنگھ وغیرہ نے علی الاعلان دیوان مولراج کا ساتھ دیا۔ مسلمان اس جنگ میں عموماً سکھوں سے گریزاں تھے کیونکہ سکھوں نے اپنے دورِ حکومت میں ان پر بڑے مظالم ڈھائے تھے ویسے بھی اس ملک کی بدقسمتی رہی ہے کہ یہاں کے باسی لالچ میں ہر لٹیرے اور غاصب کا ساتھ دینے کے لئے تیار رہتے ہیں جس سے کچھ ملنے کی توقع ہو۔ ایسی حالت میں اصول، وطن، ملت یا کسی اعلیٰ اقدار کی پرواہ نہیں کی جاتی اور اب تک وہی حالت ہے۔ جس غدار، ظالم اور سفاک نے علاقے پر قبضہ کر لیا سب اسے خوش آمدید کہنے کے لئے دوڑ پڑتے ہیں۔ دراصل اس میں عوام کا بھی قصور نہیں۔ سینکڑوں ہزاروں سالوں سے یہی ہوتا آیا ہے کہ بیرونی حملہ آور آتے رہے اور انہوں نے صرف اپنی قوم یا قبیلے کو ایک مراعات یافتہ طبقہ قرار دیا۔ عام رعایا کے نہ تو حقوق تھے اور نہ ہی انہیں ذریعہ پیداوار کے علاوہ کوئی اور اہمیت دی جاتی۔ ان حکمرانوں میں مساواتِ انسانی کا تصور نہ تھا۔ انہوں نے تو اپنی حکومت اور اقتدار کو ہر حالت میں برقرار رکھنا تھا خواہ یہ حکومت عوام کے چتا پر ہی کیوں نہ تعمیر ہو۔ اقتدار کی ہوس، سلطنت کی توسیع، فاتح بننے کا اشتیاق، دولت جمع کرنے کی دھن وغیرہ نے عوام کو ذلت کی پستی میں دھکیل کر معاشرے کے بہت بڑے حصے کو احساس محرومی میں مبتلا کر دیا۔ ایسے حالات میں عوام کی بلا سے کہ حاکم کون بن گیا ہے۔ ان ظالم حاکموں نے اپنے اقتدار کو دوام بخشنے کے لئے ملاں، پیر اور جاگیردار طبقے پیدا کئے۔ جنہوں نے اپنی مراعات اور دولت کو محفوظ رکھنے کی خاطر ہر نئے آنے والے جابر کا پُرتپاک خیر مقدم کیا اِلّا ماشاءاللہ۔ یہی سبب ہے کہ انگریزوں نے بھی اس طبقے کو بڑے بڑے قطعات اراضی نہری علاقوں میں دیئے تاکہ یہ مذہب کے ٹھیکیدار لوگوں کے سامنے حاکم کی مدح سرائی کر کے ان کی حکومت کو دوام بخش سکیں۔ یہ خرد

شمال
1" = 24 میل
نقشہ ضلع ڈیرہ غازی خان
1875ء میں رابرٹ سنڈیمن کے چارج سنبھالنے پر
انگریزی حکومت کی حدود اور حفاظتی چوکیاں ۔
دہوا
رستڑہ
تونسہ
منگروٹھہ
بارتھی
مہوئی
احمدانی
نورپور
شادن لنڈ
یارو
ڈیرہ غازی خان
ڈیرہ کہنہ
وڈور
فورٹ منرو
چوٹی
گینہٹر
جام پور
ہڑند
داجل
لعل گڑھ
حاجی پور
درگڑی
آسنی
راجن پور
مٹھن کوٹ
عمرکوٹ
بدوبھان
میراں پور
شاہ وال

وزیر جواہر سنگھ کے خلاف ہو گئے اور اسے سزائے موت دی گئی۔ مستی گیٹ کے باہر چتا تیار کی گئی اس کی دو بیویوں اور تین کنیزوں نے ستی ہونے کا اعلان کیا۔ جب یہ مظلوم عورتیں چتا کے لئے روانہ ہوئیں تو فوجیوں نے ان عورتوں کے تمام زیورات اور رقوم نوچ لیں جو وہ خیرات کر رہی تھیں پھر جب وہ چتا پر جانے کے لئے سیڑھی چڑھ رہی تھیں تو انہوں نے ان کے کان اور ناک چیر کر زیورات اتار لئے۔ فوجیوں نے اس پر بس نہ کی بلکہ جب وہ چتا پر بیٹھی تھیں تو ان سفاک لوگوں نے ان کے جسم سے قیمتی لباس اور کشیدہ کاری کے ٹکڑے تک نوچ لئے اور مظلوم عورتیں صرف آسمان کی طرف منہ اٹھا کر بد دعائیں دیتی رہیں۔

سکھوں کے عہد میں مساجد کی توڑ پھوڑ

ڈسٹرکٹ گزیٹر 4-1833ء کے مطابق ڈیرہ غازی خان کہنہ کی آبادی 27,886 (ستائیس ہزار آٹھ سو چھیاسی) تھی اور شہر کا مشہور زمانہ بازار شمال سے جنوب کی طرف ایک تنگ جگہ میں واقع تھا۔ نیا بازار ابھی تک زیادہ معروف نہ تھا۔ شہر میں مسجد غازی خان اس وقت کے تیس ہزار روپے کے خرچ سے تعمیر ہوئی تھی۔ اسی طرح سے مسجد عبدالجبار خان اور مسجد چھٹہ خان بھی عالی شان مساجد تھیں جب سکھوں نے ڈیرہ غازی خان پر قبضہ کیا تو ان مساجد کو دھرمسالہ اور مندروں میں تبدیل کر دیا گیا۔ گلالی والی مسجد کو محمد خان گوجر نے تعمیر کرایا تھا اس مسجد کی حالت جب بہت شکستہ ہو گئی تو غلامی نامی رنگریز نے اس کی مرمت کرا دی۔ اسی سبب سے یہ گلالی والی مسجد مشہور ہو گئی تھی اسے بھی سکھوں نے دھرمسالہ وغیرہ میں تبدیل کر لیا۔

جنرل کورٹ لینڈ

جنرل کورٹ لینڈ سکھ فوج میں بھاری تنخواہ پر ملازم تھا۔ دیوان مولراج کے خلاف جب انگریزوں نے کارروائی کرنے کا اعلان کیا تو جنرل کورٹ لینڈ اپنی فوج (سکھ فوج) کے ہمراہ انگریزوں کے ساتھ مل گیا۔ یہ تھی سفید چمڑی والوں کی ذہنیت۔ وہ کھاتے اور کماتے تھے کالوں سے مگر ان کی تمام ہمدردیاں اپنے ہم رنگ لوگوں سے تھیں۔ ہم کس قدر بدنصیب ہیں کہ چند ٹکوں کی خاطر اپنے ہم مذہب اور ہم وطن کو بھنبھوڑنے کے لئے ہمہ وقت تیار ہیں صرف وقت کا انتظار ہوتا ہے۔ اسی ذہنیت نے سراج الدولہ، ٹیپو سلطان، بخت خان، میر مہراب خان بلوچ، غلام حسین خان بگٹی، رانی جھانسی، میر محل خان بلوچ والئ مکران، میر شیر محمد خان تالپور وغیرہم کو ناکام کیا۔

دیوان مولراج جنگ کنیری اور سدو سہام کی شکست کے بعد ملتان میں قلعہ بند ہو گیا۔ جنگ کے خاتمے پر جنرل کورٹ لینڈ کو اسی تنخواہ پر ڈپٹی کمشنر ڈیرہ غازی خان تعینات کیا گیا۔ اس لحاظ سے وہ ڈیرہ غازی خان میں انگریزی حکومت کا پہلا ڈپٹی کمشنر تھا۔ وہ ۱۸۴۹ء سے 1856ء تک اس عہدہ پر تعینات رہا۔

بے عمل اور دوسروں کی کمائی پر گزارہ کرنے والے تھے لہٰذا عوام کو بھی "قسمت" "نصیب" اور "مقدر" کے لاینحل گورکھ دھندے کے چکر میں ڈال کر جاگیرداروں کے ہر ظلم کو برداشت کرنے کی تلقین کرتے رہے۔ عوام کو عمل اور جدوجہد سے عاری کرنے کے لیے انہیں گنڈے، تعویذ اور عملیات کا سہارا لینے کی طرف راغب کیا تاکہ ان کے گھر میں اگر کچھ بچ گیا ہو تو وہ بھی کھینچ لیا جائے اور حاکموں کو بھی یہ خطرہ نہ رہے کہ یہ بھوکے ننگے عوام اپنے حقوق کے لئے کبھی اٹھ کھڑے ہونگے۔ عوام کو ذہنی پستی اور بے عملی میں مبتلا کرنے کے صلے میں حاکموں نے بھی مذہبی طبقے سے تعاون بڑھایا اور ان کو انعام، مراعات، جاگیر اور "برات" سے نوش رکھا تاکہ وہ عوام کو مذہب کی غلط تاویل کی افیون دے کر ہر ظلم و ستم اور محرومی کو برداشت کرنے کا مادہ پیدا کریں۔ ان لوگوں کو کبھی توفیق نصیب نہ ہوئی کہ ظالم کا ہاتھ روک کر مظلوم کی امداد کرتے۔ الا ماشاء اللہ۔ کاش اس سرزمین پر بھی شہدا بالاکوٹ کی طرح چند عالم دین پیدا ہوتے۔

دربارِ لاہور میں ڈوگرہ خاندان چھایا ہوا تھا۔ ان کی لوٹ کھسوٹ اور غداری سے کوئی محاذ خالی نہ تھا۔ 1843ء میں جب دلیپ سنگھ کو مہاراجہ قرار دیا گیا تو ہیرا سنگھ ڈوگرہ وزیر اعظم مقرر ہوا۔ ہیرا سنگھ نے بے دریغ خزانہ شاہی سے مال اڑایا۔ اسی طرح سے گلاب سنگھ نے بھی خوب لوٹ میں ہاتھ رنگے تھے۔ وہ درپردہ انگریزوں سے ملے ہوئے تھے اور اندر ہی اندر سکھوں کی حکومت کو دیمک کی طرح کھوکھلا کر چکے تھے۔ اس کے صلہ میں انگریزوں نے بدنام زمانہ معاہدہ کر کے کشمیر ان کے ہاتھ فروخت کر دیا جس کی قیمت اس لوٹ کے مال سے ادا کی گئی۔ ان کی غداریوں اور ریشہ دوانیوں کا سلسلہ اس قدر پیچیدہ اور طویل تھا کہ سکھوں کی بہترین فوجوں کو انہوں نے غلط ڈھنگ سے محاذوں پر ڈال کر آسان شکست سے روشناس کرایا۔ جلا پنڈت نے جو ڈوگروں کا رشتہ دار تھا آسان شکست کے لئے راستہ صاف کرنے کے لئے تمام غیر ملکی فوجی افسران کو سبکدوش کر دیا تھا۔ پھر فوج میں اس قدر بدنظمی پھیلائی کہ سکھ فوج کوئی منظم ادارہ نہ رہا بلکہ غنڈوں اور ٹھگوں کا ایک گروہ بن گئی۔ موت خواہ کسی کی بھی ہو عبرت کا سامان پیدا کرتی ہے جس میں ہر دل کے اندر پسماندگان کے لئے احساس ہمدردی جاگتا ہے مگر اس فوج میں ذرہ بھر انسانیت کا درد نہ رہا تھا۔ 1845ء میں گلاب سنگھ ڈوگرہ نے رنجیت سنگھ کے بیٹے پشورا سنگھ کے قتل کا منصوبہ بنایا مگر کامیاب نہ ہوا۔ پشورا سنگھ نے اٹک پر قبضہ کر کے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ اس کے خلاف جو فوج بھیجی گئی اس نے اس کے خلاف لڑنے سے انکار کر دیا۔ فتح خان ٹوانہ مقیم ڈیرہ اسماعیل خان اور چتر سنگھ کو لاہور سے اس کے خلاف روانہ کیا گیا مگر کامیابی کی کوئی امید نظر نہ آئی۔ مذاکرات میں طے پایا کہ شہزادہ کے اٹک کو خالی کر دینے پر اسے سیالکوٹ کی جاگیر بحال کر دینے کے علاوہ ایک لاکھ روپے سالانہ کی ایک اور جاگیر بھی دی جائے گی۔ جب وہ معاہدہ کے مطابق لاہور آیا تو اسے دھوکہ سے گرفتار کر کے قید کر دیا گیا۔ عوام

بے کار محض تھا"۔

آزاد فطرت عوام نے اس پالیسی پر اپنے غم وغصے کا اظہار کیا مگر انگریز کی عظیم طاقت کے سامنے بے بس تھے۔ ان لوگوں میں حقیقی لیڈروں کا فقدان اور غداروں کی کثرت تھی۔ صرف غلام حسین خان نے عملی طور پر اس پالیسی کے خلاف ردِ عمل ظاہر کیا۔ اس کے لشکر سے دو صد قیدی بنا لئے گئے۔ گرفتار شدگان کو ان کے سرداروں کی دخل اندازی پر اس شرط پر رہا کر دیا گیا کہ وہ آئندہ کوئی شرارت نہ کریں گے سرداروں کی پنشن مقرر کی گئی۔

ڈاکوؤں کو روکنے کے لئے سرحدی محافظ سوار بھرتی کئے گئے مگر یہی لوگ حملہ میں اپنے آدمیوں کی امداد کرتے یا بروقت اطلاع نہ دیتے جس کی وجہ سے ڈاکہ زنی کا خاتمہ نہ ہو سکا۔ سرحدی محافظوں کو زیادہ کار آمد بنانے کے لئے قبائلی سرداروں کی معرفت سوار ان کے علاقے سے بھرتی کئے گئے نیز جرگہ کا اجرا کیا گیا۔ جو ایک قسم کی پنچایت تھی تاکہ پہاڑ اور دامن کوہ کے مقدمات کا تصفیہ کیا جا سکے۔

ضلع ڈیرہ غازیخان کا بندوبست اراضی

ضلع ہذا کا اولین بندوبست 50-1849ء میں وان کورٹ لینڈ کی سرکردگی میں ہوا۔ جس میں ایک چوتھائی حصہ پیداوار کو بطور محصول نقد صورت میں وصول کرنے کا حکم دیا گیا۔ اس صورت میں کل رقم کا تخمینہ مبلغ =/389704 روپے ہوا۔ یہ رقم کاشتکاروں پر بہت بھاری بوجھ ثابت ہوئی اور کسان اراضی چھوڑ کر بھاگ نکلے جن کی بنیاد پر رکھوک کی بنیاد پڑی۔ 1854ء میں جان لارنس کے ایما پر اس رقم کو گھٹا کر =/348815 روپے کر دیا گیا۔ 60-1859ء میں مسٹر لوک نے اسے =/318061 روپے کر دیا۔ ان رقوم میں راجن پور کی جاگیر اور مزاری کسوعہ کی رقوم بالترتیب مبلغ =/11425 روپے اور =/16050 روپے شامل نہ تھیں گویا یہ رقوم تخمینہ کی رقم کے علاوہ تھیں۔ 76-1872ء کی بندوبست میں یہ رقم =/435853 روپے کر دی گئی۔ تمنداروں کو جاگیردار کی حیثیت دے کر زمین کی پیداوار کا ایک چوتھائی بطور بٹائی وصول کرنے کا حق دیا۔ تمنداروں نے عوام پر بے انتہا مظالم ڈھا کر بٹائی وصول کی اور ایسے ایسے دردناک واقعات رونما ہوئے جن کا صرف چشم تصور سے اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ قلم سے ان واقعات کا احاطہ کرنا مشکل ہے۔ مختصراً کہا جا سکتا ہے کہ انہوں نے عوام کے جسم سے آخری قطرۂ خون تک نچوڑ لیا۔ مسٹر منچن خود لکھتے ہیں کہ بٹائی کا رواج بلوچوں اور پٹھانوں میں نہ تھا بلکہ حاکموں نے اپنی سہولت کی خاطر اس طریقے کو اختیار کیا کیونکہ حالات ناسازگار تھے اور وہ عوام تک رسائی نہ رکھتے تھے"۔ اس بٹائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ عوام سے تن کے کپڑے تک چھین لئے گئے۔ ان کے گھر فقط سرکنڈوں، جوار یا باجرہ کے ڈنٹھلوں سے تیار شدہ جھونپڑا تھا۔ اس میں چارپائی، کرسی یا پلنگ کا کبھی گذر نہ ہوتا تھا۔ سردیوں میں تمام لوگ زمین پر سوتے تاکہ رات کسی طرح سے کٹ جائے

اُس سے کیپٹن پولاک نے چارج لیا۔ پولاک کے بعد کرنل گرا ہم، کیپٹن پولاک، کیپٹن منرو، میجر منچن، کیپٹن سنڈیمن، میجر شارٹ، کیپٹن سنڈیمن، گلیڈ سٹون، فرائر، بیکٹ، فرائر، کیپٹن رابرٹ، تھاربرن، ٹکر، فرائر، کیپٹن میسی، فرائر، میجر پلاؤڈن، کے سی، ڈیمز، لوئیس، ڈیمز اور کیپٹن تھامس 1896ء تک بالترتیب ڈپٹی کمشنر کے فرائض انجام دیتے رہے۔
ڈیرہ غازی خان کے پہاڑی قبائل پر ڈپٹی کمشنر کے اختیارات نومبر 1889ء سے لاگو کئے گئے تاہم بزدار قبیلے پر اس کا اطلاق کچھ تاخیر سے ہوا۔

پتافی اور لشاری قبائل کی ہجرت گورچانی قبیلے کی شاخیں پتافی اور لشاری ڈاکہ زنی کے لئے بڑی شہرت رکھتی تھیں۔ انہوں نے علاقے میں سخت اودھم مچا رکھا تھا۔ جب حکومت نے ان کے خلاف مسلح کارروائی شروع کی تو ان لوگوں نے 1852ء میں تمن گورچانی سے نکل کر مری کے ہاں پناہ لی تاہم ڈاکہ زنی کرتے رہے۔

مردم شماری ضلع ہذا میں پہلی مردم شماری 1855ء میں ہوئی۔ ضلع کی کل آبادی 2,38,964 افراد پر مشتمل تھی۔

غلام حسین خان مشوری کی جنگ غلام حسین خان نے انگریزوں کے خلاف ہتھیار سنبھالے اور آخرکار 1867ء میں مقابلے میں کام آیا۔ اس کا مفصل حال اس سے پہلے دیا گیا ہے۔

سرحدی ملیشیا کا قیام 1866ء میں سنڈیمن نے کیپٹن منچن سے ضلع ڈیرہ غازی خان کا چارج لیا۔ اس زمانے میں ضلع ہذا کی مغربی حد دامن کوہ تک تھی اور تمام پہاڑی قبائل آپس میں برسرپیکار تھے۔ پہاڑی علاقوں سے ڈاکو میدانی علاقوں میں ڈاکہ زنی کرتے تھے۔ مری، بگٹی، کھتران اور بزدار قبائل آزاد زندگی گزار رہے تھے انگریزوں نے یہ ظاہر کر رکھا تھا کہ مری اور بگٹی کو خان قلات قابو میں رکھے مگر در پردہ یہ قبائل انگریزوں ہی کی شہ پر خان قلات سے باغی تھے۔ سنڈیمن نے فارورڈ پالیسی (آگے بڑھ کر علاقوں پر قبضہ کرنا) کا پروگرام بنایا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ آزاد قبائل کے معاملات میں زیادہ سے زیادہ مداخلت کی جائے اور اس طرح سے ان کو پوری طرح سے اپنی گرفت میں لے لیا جائے۔ اس غرض سے قبائلی سرداروں کی مدد سے قبائل کو اچھی طرح سے جکڑ لیا جائے۔ اس پالیسی کے تحت کئی نام نہاد سرداروں کو نوازشوں کی برکھا کے بعد قبائل پر مسلط کر دیا گیا۔ اب سردار محض دکھاوے کے قبائلی سردار تھے۔ ان کا قبلہ قبیلے کی بجائے انگریز تھا ان غلط بخششوں کی بدولت ان سرداروں کی شان و شوکت میں خوب اضافہ ہوا۔ فارورڈ پالیسی کے متعلق سر اولف کیرو کی رائے تھی کہ یہ نظام سرداروں کے تعاون اور قوت (فوجی) کے مظاہرے کے بغیر

رات کو کمو گرم رکھنے کے لئے کسی بڑے سے لٹھ کو چولہے میں جھونک دیا جاتا کیونکہ بچوں کو سردی سے محفوظ رکھنے کے لئے گدڑی تک میسر نہ تھی۔ گرمیوں میں چھپر جسے مقامی زبان میں منہی کہا جاتا ہے، کے اوپر سوتے تھے۔ جب کوئی فصل تیار ہوتی تو تمندار کے کارندے مٹھی گرم کئے بغیر نہ ملتے ورنہ فصل کا تخمینہ اس قدر زیادہ لگایا جاتا کہ کاشت کار سب کچھ دے کر بھی گلو خلاصی نہ کرا سکتا تھا۔ مزارعین اور کسانوں کی غربت نے ان کے تن اور روح کو اس قدر لاغر اور مردہ کر دیا کہ وہ چوں چرا کرنے کے قابل بھی نہ تھے اور پھر ان کی کون سنتا؟ تمندار جملہ سرکاری افسران پر چھائے ہوئے تھے۔ اس خستہ حالی میں یہ جاگیردار اپنا حق سمجھتے تھے کہ جب وہ اپنی جاگیروں پر نکلیں تو کسان اور مزارعین ان کے پاؤں پر ہاتھ رکھ کر سلام کریں۔ وہ خود تو چارپائی پر براجمان ہوتے مگر کسان بیچارے ہمیشہ کی طرح خاک نشین رہتے۔ چونکہ ان لوگوں کی قوتِ خرید صفر کے برابر تھی لہٰذا موسم سرما میں سرسوں اور تارا میرا کا ساگ ابال کر "پنی" بنا کر کھاتے۔ موسم گرما میں پیلو، کھجور اور بیر سے پیٹ بھرتے۔ اسی طرح سے کھپ کے پھول اور پھلیاں اور جنڈ کی پھلیوں کی روٹیاں پکا کر پیٹ کا دوزخ بھرا جاتا۔

29 مارچ 1869ء کو مسٹر الیف۔ ڈبلیو فرائر مہتمم بندوبست مقرر ہوا۔ ان کے ماتحت ڈیرہ غازی خان میں منشی چمن لعل (یکم اپریل 1869ء سے یکم دسمبر 1871ء تک) اور کرپارام (یکم دسمبر 1871ء) نے خدمات سرانجام دیں۔ جام پور میں میر اولاد حسین از یکم اپریل تا نومبر 1869ء اور پھر شیخ فضل الدین مقرر ہوئے۔ سنگھڑ میں منشی گلاب سنگھ 1869ء سے 1870ء تک کام کرتے رہے جبکہ راجن پور میں شیخ صوبہ نے دسمبر 1870ء سے یکم جولائی 1873ء تک خدمات سرانجام دیں۔

ابتدا میں پٹواریوں کی تربیت کا انتظام کیا گیا۔ پھر تمام چاہات کے گرد نشان لگوائے گئے اور ان نشانات پر گہری نالیاں بنائی گئیں تاکہ نشانات صاف نظر آئیں۔

ذیلدار انتظامی سہولتوں کو مدِنظر رکھ کر ضلع کو 75 (پچھتر) ذیلوں میں تقسیم کیا گیا جن کی تفصیل تحصیل وار حسب ذیل ہے۔

ڈیرہ غازی خان	جامپور	سنگھڑ	راجن پور	مجموعہ
15	21	15	24	75

نمبردار کی طرح ہر ذیل پر ایک ذیلدار مقرر ہوا جو موروثی ہوتے تھے۔

فورٹ منرو کی آبادی 1867ء میں پہاڑی لوگوں کے حملوں کی روک تھام کرنے اور انگریز افسران کے لئے صحت افزا مقام کی تلاش کے سلسلہ میں فورٹ منرو اور ماڑی دراگل پر بنگلہ جات تعمیر کر کے ہیڈ کوارٹر تعمیر کئے گئے۔ سنڈیمن نے کمشنر ملتان کرنل منرو کے نام پر اس کا نام فورٹ منرو رکھا۔ اس جگہ کا مقامی

نام اناری مول تھا۔

مردم شماری

جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے ضلع کی پہلی مردم شماری 1855ء میں ہوئی۔ دوسری مردم شماری 1868ء میں ہوئی اس کے بعد جو مردم شماریاں ہوئیں ان میں آبادی کا اضافہ جو گوشوارہ ذیل سے ظاہر ہے۔

سن :	1855ء	1868ء	1881ء	1891ء	1901ء	1911ء
آبادی:	238964	309912	385470	427758	471140	528447
سن	1921ء	1931ء	1941ء			
آبادی	495810	520686	621596			

1921ء میں آبادی 1911ء کے مقابلے میں کم تھی کیونکہ انفلوئنزا کی وبا کے سبب ضلع ہذا سے تقریباً ایک لاکھ افراد جاں بحق ہوئے۔ اس وبا کی ابتدا پونا سے ہوئی۔ پنجاب اور سندھ میں ہر ہزار انسانوں میں سے تیس کی موت واقع ہوئی۔ 1921ء کی مردم شماری میں ایک عجیب بات یہ تھی کہ ڈیرہ غازی خان ضلع میں تو افراد نے اپنا مذہب سخی سرور لکھوایا۔ قیام پاکستان پر غیر مسلموں کے انخلا کی وجہ سے بہت سے شہروں کی آبادی گھٹ گئی جس کا اظہار 1951ء کی مردم شماری سے ہوا۔

	1941ء	1951	کمی فی صد
داجل	6378	3764	%41
کوٹ مٹھن	5889	3675	%38
وہوا	3781	2827	%25
تونسہ	8701	7286	%16

1881ء کی مردم شماری کی رو سے اس ضلع کے خاص خاص شہروں کی آبادی حسب ذیل تھی[۵۱]

کل رقبہ ضلع ڈیرہ غازی خان	4740 مربع میل
آبادی شہر ڈیرہ غازی خان	20,123
" " داجل	6,335
" " جام پور	4,209

۵۱ : IMPERIAL GAZETTEER OF INDIA VOL. III 1881.

آبادی شہر راجن پور - 3556
" " مٹھن کوٹ 3347

حلقہ وہوا کی ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں شمولیت

1866ء میں انتظامی سہولت کو مدِنظر رکھ کر وہوا بمع علاقہ کھتران ضلع ڈیرہ اسماعیل خان میں شامل کر دیا گیا مگر جب ڈپٹی کمشنر ڈیرہ اسماعیل خان مسٹر گرے کو سردار کوڑا خان قیصرانی نے اغوا کر لیا تو یہ علاقہ دوبارہ ضلع ڈیرہ غازی خان میں شامل کر دیا گیا۔

قیصرانی قبیلے کے خلاف فوجی کارروائی

1867ء میں پہلی سرسری بندوبست شروع ہوئی تو قیصرانی قبیلہ کے علاقے میں ایک ہندو اوورسیئر عدم پتہ ہو گیا۔ اس سلسلہ میں جب یوسف خان کے بھائی کو قید کر لیا گیا تو قیصرانیوں نے انتقامی طور پر ڈیرہ فتح خان کو لوٹ لیا۔ پولیس اور فوج کے ساتھ تصادم ہوا۔ میجر نکلسن نے ان کے خلاف فوجی کارروائی کی اور ان کے دیہات کو نذرِ آتش کیا۔

ڈیرہ غازی خان کے قبائل کا انتظام حکومت سندھ کے پاس

انگریزوں نے جب سنڈیمن کے تحت فارورڈ پالیسی پر عمل شروع کیا تو تمام قبائلی علاقہ ہلچل میں مبتلا تھا۔ انگریز افسر مسلسل دورے کر رہے تھے تاکہ عوام پر انگریزی حکومت کا رعب اور دبدبہ طاری کر دیا جائے۔ اسی سلسلے میں لیفٹیننٹ گورنر میجر جنرل سر ہنری ڈیورنڈ ٹانک (صوبہ سرحد) کے دورے پر تھا جہاں وہ ہاتھی سے گر کر فوت ہو گیا۔ 1871ء میں ایک اجلاس منعقد کرنے کا پروگرام تھا جس میں قبائل کے انتظامی معاملات پر تبادلہ خیالات کرنا تھا۔ اس سلسلے میں گورنر پنجاب ولیم میری ویدر، کرنل فائر اور سنڈیمن کے علاوہ ڈیورنڈ نے بھی شامل ہونا تھا مگر ڈیورنڈ کی موت کی وجہ سے کچھ عرصہ کے لئے ملتوی ہو کر ۳ فروری 1871ء میں کوٹ مٹھن کے مقام پر اجلاس ہوا۔ اس میں فیصلہ کیا گیا کہ بلوچ قبائل جو اس وقت کچھ حکومت پنجاب کے ماتحت ہیں اور کچھ سندھ کے، آئندہ اُن تمام کے معاملات مکمل طور پر حکومت سندھ کے پاس ہوں گے۔ کپتان سنڈیمن (ڈپٹی کمشنر) اگرچہ حکومت پنجاب کا ملازم ہوگا مگر ان قبائل کے معاملات میں وہ حکومت سندھ کا عہدہ دار ہوگا اور پولیٹیکل سپرنٹنڈنٹ سندھ فرنٹیئر جیکب آباد کے ماتحت کام کریگا۔ [۱]

---

۱ BALUCHISTAN — HISTORICAL AND POLITICAL PROCESS
A - B - AWAN.

سنڈیمن کی قلات کو پہلی مشن

1875ء میں رابرٹ سنڈیمن، جب ضلع ڈیرہ غازی خان کا ڈپٹی کمشنر تھا تو قلات پر میر خداداد خان بلوچ حکمران تھا۔

سنڈیمن اس دور کے برطانوی سامراج کا بہت بڑا معاون تھا جو انگریزوں کی مملکت کو جلد از جلد بلوچستان تک وسعت دینا چاہتا تھا۔ بلوچستان میں مداخلت کرنے کے لئے انگریزوں نے زمین پہلے ہموار کرنا شروع کردی تھی۔ قبائلی سرداروں کو خان قلات کے خلاف بھڑکا کر بغاوت کا سماں باندھ رکھا تھا۔ میر آزاد خان سردار خاران، تاج محمد خان، ملا محمد خان، جام لس بیلا وغیرہ نے سازش کر کے ملک میں فتنہ وفساد برپا کیا کیونکہ ان کو انگریزوں کی سپرہ حاصل تھی۔

جب بلوچ سرداروں کی خود غرضی کی وجہ سے بلوچستان میں سخت افراتفری پھیلی ہوئی تھی تو انگریزوں کو بھی بلوچستان کے معاملات میں دخل دینے کا سنہری موقع مل گیا۔ رابرٹ سنڈیمن کی ایماء پر ایک مشن قلات روانہ کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اس مشن کا قائد سنڈیمن خود بنا اور اس کے ہمراہ ڈیرہ غازی خان اور ملحقہ علاقے کے قبائلی سردار وغیرہ تھے۔ سنڈیمن کے ہمراہ غلام حیدر خان گورچانی، میرن خان دریشک، غلام حیدر خان لنڈ، سکندر خان کھوسہ، مزار خان لنڈ، جمال خان لغاری، مہراللہ خان مری، غلام مرتضیٰ خان مری، بلوچ خان کھتران، قادر بخش خان کھتران، مسو خان تنکانی بمعہ جملہ گیارہ سو چھ سوار اور تین سو پیادے تھے۔ اس کے علاوہ پنجاب کیولری کا ایک دستہ بھی ساتھ تھا۔ دفتری کارروائی کے لئے منشی ہتورام اور گنپت رائے ہمراہ تھے۔ مشن کے بعد لالہ ہتورام کو رائے بہادر کا خطاب ملا۔ ان دنوں لس بیلہ کے حکمران جام عالی خان اور اس کے بیٹے جام علی خان کے اختلافات بہت بڑھ گئے تھے۔ جب جام عالی خان فوت ہوا تو لالہ ہتورام اس ریاست کا دو سال تک حاکم رہا۔ لالہ ہتورام تاریخ ڈیرہ غازی خان، بلوچستان وغیرہ کا مصنف بھی ہوا۔ دیوان گنپت رائے بلوچستان میں پولیٹیکل اسسٹنٹ اور ایکسٹرا اسسٹنٹ کمشنر کے طور پر تعینات رہا۔ اس مشن کے دوران میاں احمد بخش خانساماں تھا جس کو خان صاحب کا خطاب دیا گیا۔

یہ مشن 23، نومبر 1875ء کو ڈیرہ غازی خان سے روانہ ہو کر کوٹ چھٹہ، گھنٹر، پھتوک اور درہ چھا چھڑ سے گذر کر 31، دسمبر 1875ء کو قلات میں وارد ہوا۔ سنڈیمن اور خان بلوچ کی دوسری ملاقات یکم جنوری 1876ء کو دربار عام میں ہوئی۔ خان بلوچ کی طرف سے میر محمود خان ولی عہد، میر شاہنواز خان اور میر اعظم خان فرزندان خان بلوچ، کرم خان اور گہنور خان بھانجے خان بلوچ، عبداللہ خان وکیل، نواب محمد خان، ملا عطا محمد خان وکیل، سردار نوردین خان، عبداللطیف خان نائب شال (کوئٹہ)، ملا فقیر محمد خان، قیصر خان موسیانی، فقیر محمد خان کمانیر پلٹن، بخش خان کمانیر، امام بخش خان کمانیر رسالہ اور فتح شاہ کمانیر رسالہ موجود تھے۔ سنڈیمن کے ہمراہ ملاقات کے وقت امام بخش خان مزاری، جمال خان لغاری، سکندر خان کھوسہ، غلام حیدر خان لنڈ، میرن خان دریشک، مسو خان تنکانی اور مزار خان لنڈ بمعہ اپنے بیٹے احمد خان موجود تھے۔ اس کے علاوہ سنڈیمن اپنے ہمراہ باغی سرداروں کو بھی لے گیا تاکہ انہیں عام معافی دلوائی جا سکے۔ اس سے صاف ظاہر

ہوتا ہے کہ باغی سردار دراصل انگریزوں کے اشاروں پر ناچ رہے تھے) ان باغی سرداروں میں ملا محمد خان رئیسانی مع اپنے بیٹے اسد خان، اللہ ڈینہ خان کرد [illegible] پشہ، بیٹے یار محمد خان، شادی خان بنگلزئی، سید خان محمد شاہی، جندہ خان شاہوانی، میر ہزار [illegible] گلاب [illegible] کرم خان مقدم [illegible] جمال خان [illegible]، گہنور خان پسر تمندار بگٹی، ہیبت خان مقدم مشوری بگٹی، بیج خان نوتھانی بگٹی، رودھے خان مقدم کھلپر، بجر خان برادر مقدم نوتھانی وغیرہ شامل تھے۔ اس ملاقات میں خان بلوچ کے دائیں طرف سنڈیمن اور بائیں طرف میر محمود خان بیٹھے۔ جب سردار ملا محمد خان دربار میں حاضر ہوا تو خان بلوچ نے اس سے اٹھ کر مصافحہ کیا۔ امام بخش خان مزاری اور جمال خان لغاری کو بھی نیم ایستادہ ہو کر شرف ملاقات بخشا۔ باقی سرداروں کو سلام کے جواب میں وعلیکم السلام کہا۔

مشن کے مقاصد

سنڈیمن کے ذمے جو کام حکومت ہند نے سپرد کیا تھا وہ تھا علاقہ مری میں امن قائم کرنا مگر جب وہ خان بلوچ سے ملا تو اس نے درہ بولان کو تجارتی اور سیاسی اغراض کے لئے استعمال کرنے کے لئے کھلا رکھنے کی خاطر گفت و شنید کرنا چاہی مگر بلوچستان کے مخبر نے خان بلوچ کو مطلع کر دیا تھا کہ سنڈیمن کے اختیارات اور دائرہ کار کہاں تک ہیں۔ لہٰذا خان بلوچ نے درہ بولان کی بجائے درہ مُلا سے تجارت کرنے کی خواہش ظاہر کی جس کی حفاظت حکومت بلوچستان نے اپنے ذمہ لینے کی خواہش کا اظہار کیا۔ البتہ یہ واضح کر دیا کہ بلوچ حکومت اس راستے سے گزرنے والے مال پر حسبِ سابق ٹیکس وصول کریگی۔ درہ بولان کے کھلا رکھنے میں خان بلوچ نے چند رکاوٹوں کا ذکر کیا۔ اس نے سنڈیمن کو مزید بتایا کہ بلوچی حکومت کی چھاؤنیاں صرف ڈھاڈر اور شالکوٹ (کوئٹہ) میں ہیں جو اس طویل درے کی حفاظت کے لئے ناکافی ہیں۔ علاوہ ازیں درہ بولان کو بند کرنے کی ذمہ داری بھی انگریزی حکومت پر عائد ہوتی ہے جس کے دو اعلیٰ افسران بیری سن اور میری ویدر نے تمام تجارتی مراکز اور خاص طور پر قندھار میں یہ اعلان کرائے تھے کہ درہ بولان تجارتی اغراض کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔

مشن کی ناکامی

چونکہ خان بلوچ کو معلوم ہو چکا تھا کہ سنڈیمن درہ بولان کو کھولنے کے لئے اس قدر دلچسپی کیوں لے رہا ہے لہٰذا اس نے درہ بولان کو حسب سابق بند رکھ کر کسی قسم کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ وہ اس طرح سے غیر ملکی اثر و نفوذ اور ریشہ دوانیوں کو کم سے کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ سنڈیمن جب درہ بولان کو کھلا رکھنے میں ناکام ہو گیا۔ تو اس نے باغی قبائل اور خان بلوچ کے جھگڑوں کے متعلق معاہدہ کرنا چاہا تو خان بلوچ نے اس سے بھی اتفاق کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ یہ اس کی سلطنت کے اندرونی معاملات میں مداخلت کے مترادف تھا۔

خان بلوچ کو محمد خان وکیل کے بیٹے پیر خان مقیم شاہ پور کی معرفت بھی اطلاع مل چکی تھی کہ سنڈیمن کو ان معاملات

---

۵۱ تاریخ بلوچستان ص 413 لالہ ہتو رام

میں دخل دینے کا اختیار حکومت ہند کی طرف سے نہیں ملا لہٰذا صاحب سنڈیمن نے خان بلوچ سے اُس کا ایسا معلوم کرنا چاہا تو میر خداداد خان نے فرمایا کہ " اول آ[illegible] فرمایئے کہ آپ کو فیصلہ میں کیا اختیار ہے۔ ہم نے سنا ہے کہ آپ صرف واسطے دریافت حال بولان کے آئے ہیں"

سنڈیمن: بے شک! لیکن بندوبست بولان کا سوائے فیصلہ فیمابین آپ کے اور اقوام بروہی کے ہونا ممکن نہیں۔

خانصاحب (خان بلوچ) ہم سچ کہتے ہیں کہ ہم کو کسی کا کچھ خوف نہیں۔ ہم اپنے ملک کے بادشاہ ہیں۔ بادشاہ کو لازم ہے کہ وہ سچ کہے۔ جھوٹ کبھی نہ بولے۔ اگرچہ ہمارا وکیل سچ کہنے سے ڈرتا ہے۔ اس کو اپنے بیٹے پیر جان کا لحاظ ہوتا ہے لیکن ہم کو کچھ خوف نہیں اور اس کا بوجھ ہماری پشت پر ہے۔ ہم کو بذریعہ پیر جان پسر وکیل محمد خان جو شاہ پور میں قریب جیکب آباد میں رہتا ہے، خبر ملی ہے کہ آپ کو ایسے معاملات میں دست اندازی کرنے کا اختیار نہیں بلکہ آپ کے نام بھی کئی چٹھیات از صاحبان سندھ سے آئی ہونگی۔ ہم آپ کو اپنا دوست سمجھتے ہیں۔ صاحبان سندھ کی ہم کو کچھ پرواہ نہیں۔ اب تک جو ہمارا معاملہ متعلق ان لوگوں کے رہا اس حد تک پہنچ گیا ہے کہ سرکار انگریزی سے ہماری خط و کتابت بھی بند ہے"۔ پھر خانصاحب نے اپنے سلسلۂ کلام کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ " حکومت ہند ڈھاڈر تک ریلوے لائن بچھانے کا ارادہ رکھتی ہے مگر تا حال کام شروع نہیں ہوا۔ حکومت کو چاہیئے کہ ہماری امداد اس طرح سے کرے جیسا کہ امیر شیر علی خان (افغانستان) سے کرتی ہے۔ ہم اس سے کم نہیں۔ ہم بھی اپنے ملک کے بادشاہ ہیں"۔ سنڈیمن ابھی تک قلات میں تھا کہ اسے گورنمنٹ ہند کی طرف سے قلات کے معاملات میں بغیر اجازت دخل انداز ہونے کی جواب طلبی کی گئی۔ اس طرح سے یہ مشن ناکام واپس گیا۔

سنڈیمن کا دوسرا مشن برائے قلات

حکومت ہند کی منشا کے مطابق ۱۴ اپریل 1876ء کو دوسرا مشن برائے قلات سنڈیمن کی سرکردگی میں قلات روانہ ہوا۔ جس کو راستے میں ہیضہ کی وبا سے کافی جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ اس مشن کے مقاصد تو تقریباً وہی تھے البتہ اب انگریزوں نے جھالاوان کے سرداروں سے اپنے زر خرید افراد پیدا کر لئے جو خان بلوچ کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ ان میں جام عالی خان، میر گہنور خان، ابراہیم خان اور چاکر خان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں جن کی سازشوں اور شرارتوں نے حکومت قلات کو تنگ کر رکھا تھا۔ اگرچہ خان بلوچ ان کو قرار واقعی سزا دینا چاہتا تھا مگر یہ لوگ انگریز کی غلامی میں پناہ حاصل کر چکے تھے اور ان کے تعاون سے خان بلوچ کی تمام کوششوں کو ناکام کرتے رہے۔ اب سنڈیمن انگریزی دستر خوان کے جھوٹے ٹکڑوں پر پلنے والوں کے سہارے اور امداد سے درپردہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے

---

(۱) تاریخ بلوچستان [illegible] 43 ہتو رام

لئے روانہ ہوا۔ امام بخش خان مزاری اور جمال خان لغاری سنڈیمن کے دستِ راست بن گئے اور ہر معاملہ میں ہاں میں ہاں ملاتے۔ میر خداداد خان کو اگرچہ ان دو بلوچ سرداروں سے بڑی توقعات وابستہ تھیں کہ وہ اس سلطنت کی بقا کے لئے امداد کریں گے مگر انگریز کے سیم وزر کے لالچ نے ان دونوں سرداروں کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جس کی وجہ سے وہ قومی اور ملی مفادات سے قطعاً لاتعلق ہو گئے۔ حقیقت میں سنڈیمن کی نسبت ان دونوں بلوچ سرداروں کو انگریز کی کامیابی کی زیادہ فکر لاحق تھی۔

کئی روز تک خانِ بلوچ اور سنڈیمن کے درمیان گفتگو کا سلسلہ جاری رہا۔ آخر 12 جولائی 1876ء کو گفتگو کامیاب اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور مستونگ میں عہد نامہ پر دستخط ہو گئے جس کی رو سے قرار پایا کہ:

1. ۱۴ مئی ۱۸۷۴ء کا جو عہد نامہ خان بلوچ اور انگریز حکومت کے درمیان طے پایا تھا اس کی تجدید کی جائے۔
2. گورنمنٹ ہند اور خانِ قلات کے درمیان دائمی دوستی کا اقرار کیا گیا۔
3. خان قلات اپنے ورثاء کے علاوہ اپنے سرداروں کا بھی ذمہ دار ہو گا جس کے عوض حکومت ہند قلات کی آزادی کا پورا احترام کریگی جس میں قلات کی حفاظت بھی شامل ہوگی۔
4. حکومتِ قلات کا نمائندہ حکومتِ ہند کے پاس مقیم ہو گا اور قلات میں ایک انگریزی مسلح دستہ رہے گا جس کا کمانڈر انگریز ہوگا۔
5. انگریز نمائندہ مقیم قلات خانِ بلوچ اور قبائلی سرداروں کے درمیان جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کا حق دار ہوگا۔
6. انگریزوں کو اختیار ہوگا کہ علاقہ قلات میں جب چاہیں فوج متعین کر دیں۔
7. [illegible]ت ہند خان کو ایک لاکھ روپے سالانہ بطور امداد اس وقت تک ادا کرتی رہے گی [illegible] وہ ان معاہدوں کی پابندی کریگا۔

ڈیرہ فورٹ منرو سڑک کی تیاری

1886ء میں بلوچستان اور پنجاب کو ملانے کے لئے ڈیرہ غازی خان فورٹ منرو سڑک بنائی گئی جس کو بعد میں بارکھان اور لورالائی تک وسعت دی گئی۔

طبقہ وار ملکیت اراضی

حکومت نے ۱۸۷۴ء میں ضلع کی اراضی پر طبقہ وار ملکیت کا اندازہ لگایا تھا۔ اس وقت قبائلی علاقہ آزاد تھا اور ضلع کا رقبہ 2806959 ایکڑ تھا۔ اس کی ملکیت اس طرح سے تھی۔

بلوچ	1928404	ایکڑ یعنی	68 فی صد تقریباً
جاٹ مسلم	484982	"	17 " "

ہندو	22066	ایکڑ یعنی	8 فی صد تقریباً
سید	105648	" "	4 " " "
سنی سرور کے مجاور	41224	" "	2 " " "
پٹھان	23635	" "	1 " " "

اسی زمانے میں جام پور کی آبادی 7796 تھی۔ شہر میں 1599 مکانات اور 250 دکانیں تھیں جبکہ کوٹلہ مغلاں کی آبادی 2884 تھی جہاں 110 دکانیں تھیں۔

جنگِ عظیم اوّل

اس جنگ کے دوران انگریزوں نے فوجی بھرتی کی مہم بڑے زور شور سے شروع کی۔ بعض مقامات پر لوگوں کو جبراً فوج میں بھرتی کیا گیا۔ اس سے عوام میں ناراضگی پھیل گئی جس کی وجہ سے بستی تونکی نزد داجل بلوہ ہو گیا۔ عوام میں گرفتاریاں کی گئیں اور بہت سے لوگوں کو سخت سزائیں دی گئیں۔

مری قبیلے کا حملہ

فروری 1918ء کو مری قبیلہ نے انگریزوں کے خلاف ہتھیار سنبھال لئے۔ انہوں نے کھتران قبیلہ سے اتحاد کر کے علاقہ ڈیرہ غازی خان پر حملہ کیا اس کا مفصل حال مری قبیلے کے بیان میں آ چکا ہے۔

مری اور بگٹی قبائل انگریز اور سکھ حکومت کے لئے ہمیشہ دردِ سر بنے رہے جب انگریز اور سکھوں کی تمام جنگی چالیں ان کے علاقوں پر قبضہ دلانے میں ناکام رہیں تو انہوں نے ان قبائل کو اقتصادی طور پر تباہ کرنے کے پروگرام بنائے۔ دونوں اقوام شروع ہی سے مسلمانوں کو اقتصادی طور پر پسپا یا بیج کرنا چاہتی تھیں۔ اس کا واضح ثبوت موہن لعل کی تحریر سے ملتا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ سکھ حکومت ہندو سوداگروں سے معمولی ٹیکس لیتی ہے مگر اسی چیز پر مسلمان سوداگروں (افغان) سے کئی گنا محصول وصول کرتی ہے۔ انگریزوں نے تو اس قدر تشدد کیا کہ ان قبائل کو بھوکا مارنے کے لئے ان کی مکمل اقتصادی ناکہ بندی کر دی تھی کہ ہر مری کو حدود انگریزی میں گرفتار کرنے پر فی کس مبلغ دس روپے انعام ملتا تھا۔ اس دور میں دس روپے بہت بڑی رقم تھی۔ ان ظالمانہ کارروائیوں کا یہ ردعمل ہوا کہ بلوچ قبائل بزدار، مری وغیرہ وغیرہ جوابی کارروائی کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ان کے حملے سرحدوں پر اس قدر بڑھ گئے کہ تجارت جو دروں کے راہ سے ہوتی تھی بالکل بند ہو گئی۔ اس تجارت کے بند ہونے کا قبائل پر کوئی خاص اثر نہ ہوا کیونکہ یہ تجارت یکطرفہ تھی قبائل کو اس میں کوئی فائدہ نہ تھا بلکہ تمام تر تجارتی منافع انگریز اور ہندو کی تجوری میں جاتا تھا۔ ان حالات میں اس تجارت کو نہ روکنا دشمن کے ہاتھ مضبوط کرنے کے مترادف تھا لہٰذا انہوں نے گوریلا حملوں کی صورت میں انگریز اور سرحد کے درمیان ایسا منطقہ بنا دیا جہاں کسی کی حکمرانی نہ تھی۔ اس طرح سے وہ اپنے دشمنوں کو حملہ کرنے سے

بآسانی روک سکتے تھے ۔ مری اور بگٹی کے حملے ایسے شدید ہوتے تھے کہ سکھ اور انگریز چلا اٹھے۔ ان حملوں کی وجہ سے ان کو "وحشتِ سرحد" کا نام دیا گیا تھا۔

ضلعی مسلم تعلیمی انجمن کا قیام

آخر انیسویں اور بیسویں صدی کے ابتدا میں برصغیر کے مسلمان ہر لحاظ سے پسماندہ تھے جس کی سب سے بڑی وجہ تعلیم کی کمی تھی۔ ان پڑھ اور نام نہاد ملاؤں نے جدید تعلیم کے خلاف عوام کو بھڑکا کر علم و عمل کی دنیا سے ان کو دور کر رکھا تھا حالانکہ حدیث مبارکہ میں فرمایا گیا ہے کہ علم حاصل کرو خواہ اس کے لئے تمہیں چین جانا پڑے۔ مقصد یہ تھا کہ علم حاصل کرنے کے لئے کٹھن سے کٹھن مشکلات کی پرواہ نہ کرو۔ جب بے علم و عمل ملاؤں کے ہاتھ میں مسلمانوں کی قسمت کی باگ ڈور آگئی تو جیسی روح ویسے فرشتے کے مصداق انہوں نے عوام کو بھی جہالت کی عمیق، تنگ اور اندھیری غاروں میں دھکیل دیا۔ انہوں نے سائنس اور ہنر (ٹیکنالوجی) سیکھنے کو ارتداد قرار دیا۔ حالانکہ دنیا کے اولیں سائنس دان مسلمان ہی تھے جنہوں نے علم نباتات، طب، روشنی، کیمیا، حیوانات، فلکیات، ہندسہ، الجبرا وغیرہ پر لاجواب تحقیق کر کے کتابیں لکھیں۔ یہ کتب صدیوں تک یورپ کی درسگاہوں میں بطور نصاب پڑھائی جاتی رہیں۔ مسلمان علماء یورپ کے اکثر و بیشتر حکمرانوں کے مشیر تھے۔ فریڈرک اعظم شہنشاہ جرمنی کے اکثر مشیر مسلمان علماء تھے اور وہ ان سے عربی میں گفتگو کرتا تھا۔ مسلمان سائنس دانوں نے قرآن مجید پر عمل کر کے سائنس کی خدمت کی۔ جناب محمد احمد مصری کی تحقیقات کے مطابق قرآن مجید کی کل آیات چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ (6666) ہیں جن میں سے سات سو چھپن (756) یعنی تقریباً $\frac{1}{9}$ مسلمانوں کو خدا کی بنائی کائنات اور اس کی چیزوں اور قدرتی عوامل کا مشاہدہ کرنے، غور و فکر کرنے کی طرف دعوت دیتی ہیں جبکہ صوم و صلوٰۃ، زکوٰۃ، حج، جہاد جیسے فرائض کے متعلق تقریباً صرف ایک سو پچاس (150) آیات ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن حکیم نے مسلمانوں کو سائنس کے علوم پڑھنے اور خدا کی اس کائنات کو سمجھنے اور پھر اسے بنی نوع انسان کے استعمال میں لانے پر کتنا زور دیا ہے۔ یہی وہ قرآنی آیات و ہدایات تھیں جن پر عمل کر کے مسلمان سائنسی علوم پر تقریباً سات سو برس تک چھائے رہے۔ وہ جب بھی قرآن مجید کی تلاوت کرتے تھے تو سوچ سمجھ کر پڑھتے تھے۔ حکم الٰہی ہے کہ قرآن مجید ٹھہر ٹھہر کر پڑھو (تاکہ غور کر سکو) جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل آیت ۱۰۶ اور المزمل آیت ۴ میں ہے مگر اب یہ حالت ہے کہ نام نہاد ملا شبینہ تلاوت پر جوش دکھا رہے ہیں جو صریحاً احکام الٰہی کی خلاف ورزی ہے۔ پچھلی صدی میں مساجد مدرسہ کا کام دیتی تھیں جہاں اکثر و بیشتر نیم تعلیم یافتہ ملا بچوں کو ابتدا سے "کریما" کا درس دیتا تھا۔ یہ کتاب فارسی زبان میں تھی۔ بچے اس زبان سے نابلد ہوتے تھے اور تمام عمر سر کھپانے کے باوجود لاعلم رہتے۔ نہ تو ان کو علم حاصل ہوتا اور نہ ہی وسعت قلب کہ قرآن مجید میں جو یتفکرون، ینظرون اور انظروا کی تکرار آئی ہے انہیں سوچ بچار کر کے اس کا مطلب سمجھیں

مثلاً سورۃ آل عمران آیت ۱۹۱ میں فرمایا گیا" ...... ان ہوشمند لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں اور آسمان وزمین کی ساخت پر غور کرتے ہیں اور ...... " اور پھر سورۃ الروم آیت 22 میں فرمانِ خداوندی ہے " ..... اور تمہاری زبانوں اور تمہارے رنگوں کا اختلاف ہے۔ یقیناً اس میں دانشمند لوگوں کے لئے بہت سی نشانیاں ہیں" جب تک علم حاصل نہ کیا جائے یہ نشانیاں معلوم نہیں ہو سکتیں۔ اسی طرح سے سورۃ یونس میں فرمایا " بھلا کیا نگاہ نہیں کرتے اونٹوں پر کیسے بنائے گئے ہیں اور آسمانوں کو کیسے بلند کیا گیا اور پہاڑوں کو کیسے کھڑا کیا گیا اور زمین کیسے صاف بچھائی گئی"۔ ایک اور جگہ فرمایا " یقیناً خدا کے نزدیک بڑی مخلوق وہ ہے جو گونگوں اور بہروں کی طرح عقل استعمال نہیں کرتی" یا " کیا انہوں نے کبھی زمین پر نگاہ نہیں ڈالی کہ ہم نے کس کثیر مقدار میں ہر طرح کی عمدہ نباتات اس میں پیدا کی ہے (الشعراء) اور " مشاہدہ کرو جو کچھ آسمانوں اور زمینوں میں ہے " ایک اور فرمانِ خداوندی ہے" اللہ وہی ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کیا (قابو میں دیدیا) تاکہ اس میں اس کے حکم سے کشتیاں چلیں اور تاکہ تم اس کی دی ہوئی روزی تلاش کرو اور تاکہ تم شکر گذار بنو اور اس نے تمہارے لئے مسخر کردیا جو کچھ بھی آسمانوں میں ہے اور جو کچھ بھی زمین میں ہے سب کو اپنی طرف سے۔ بیشک اس میں ان لوگوں کے لئے نشانیاں ہیں جو غور کرتے ہیں۔

(الجاثیہ 12 - 13)

نتیجتاً اس فرسودہ نظامِ تعلیم کی بدولت جو دینی مدرسوں میں جاری رہا، مسلمان بحیثیت قوم جاہل رہ گئی۔ جو کبھی حامل علم وعمل تھی اس کے علاوہ دین کے ٹھیکیداروں میں اسلامی روح مفقود تھی اور وہ صرف دولت اکٹھی کرنے والے تھے۔ اسلام شاہ سوری کے وقت شیخ الاسلام مُلاّ عبداللہ سلطان پوری (ضلع جالندھر) تھا۔ اس کا یہ حال تھا کہ ہر ایک سے رشوت وصول کرتا تھا اور زکوٰۃ سے بچنے کے لئے وقت سے پہلے اپنی دولت زمین میں دفن کردیتا اور دل کو تسلی دے دیتا کہ اب تو میرے پاس کوئی دولت نہیں جس کی زکوٰۃ ادا کروں۔ اگر زکوٰۃ نکالتا بھی تھا تو اسے کسی بڑے گھڑے میں ڈال کر اسے گندم سے بھر دیتا جس سے وہ بہت وزنی ہو جاتا تھا۔ پھر وہ کسی کمزور اور بوڑھے آدمی سے کہتا کہ یہ گندم زکوٰۃ کی ہے اور آپ اسے گھر لے جائیں۔ مگر وہ بوڑھا اسے اٹھا نہ سکتا۔ پھر اس سے کہا جاتا کہ ایسی صورت میں گندم کی قیمت نقد لے لو اور جملہ دولت پھر رکھ لی جاتی کیونکہ وہ غریب اس مکر سے لاعلم ہوتا تھا گویا یہ نام نہاد شیخ الاسلام اللہ تعالیٰ کو بھی دھوکہ دینے کی کوشش کر رہا تھا جو دلوں کے بھید بھی جانتا ہے ایسے لوگوں کے زمانے میں بچوں کی تعلیم کا کیا حشر ہوگا؟ اس کا انجام بعد میں ظاہر ہوا کیونکہ کسی بھی برائی کا ثمرہ کچھ وقت کے بعد ظاہر ہوتا ہے۔ یہ صرف ایک غلط کار کی مثال ہے اس کے بعد آنے والے بھی ایسے لوگ تھے اِلاّ ماشاء اللہ جن کی مساعی کا نتیجہ مسلمانوں کی عمومی پسماندگی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اس پسماندگی کی سب سے بڑی وجہ ان میں تعلیم کی کمی تھی۔

آج کل بھی اَن پڑھ ملاں اکیلے ہیں جامعۃ العلوم (یونیورسٹی) چلا رہے ہیں جہاں سے وقت بے وقت لاؤڈ سپیکر پر ٹیپ ریکارڈ پوری آواز سے لگائے جاتے ہیں یا کورس میں کسی فلمی گانے کی دھن میں نام نہاد مذہبی گانے گا کر پڑھتے، طلبا اور سارا دن مزدوری کرنے والوں کی خوب ایذا رسانی کی جاتی ہے۔ ان کی اوٹ پٹانگ تقاریر کا موضوع ایک دوسرے کی کاٹ کر کے فرقہ بندی کی جڑیں خوب مضبوط کرنا ہوتا ہے۔ ان کو یہ تو معلوم ہی نہیں کہ فرمانِ خداوندی ہے " اللہ کی رسی کو اکھٹے مضبوطی سے پکڑو اور فرقوں میں نہ بٹ جاؤ" یہاں پڑھنے والے بچے فرسودہ نصاب تعلیم کی بدولت جب ان مدرسوں سے نکلتے ہیں تو وہ نہ لکھ سکتے ہیں اور نہ ہی کسی ہنر کو جانتے ہیں کہ رزقِ حلال اپنے ہاتھوں سے کما کر کھائیں جسے اللہ اپنا فضل قرار دیتا ہے۔ طویل عمر ضائع کرنے کے بعد یہ بچے نئی مسجد بنا کر قوم کا ستیا ناس کرتے ہیں اور اس طرح سے قوم پر بار بن جاتے ہیں نئی مسجد بنانے کے لئے سڑکوں اور چوراہوں پر بھی قبضہ کر لیا جاتا ہے۔ شہر ڈیرہ غازی خان میں اس کی کئی مثالیں ہیں۔ یہ نام نہاد " علما" صرف مُردوں کی روٹیاں کھانے والے بن جاتے ہیں ان کے دستور میں کوئی سماجی خدمت سرے سے شامل ہی نہیں حالانکہ ہر مذہب کے علماء اپنے اپنے حلقوں میں ضرورت مندوں کی مناسب خدمت کر کے اللہ کا نام بلند کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو عیسائی مبلغین کی کارکردگی کو مدِ نظر رکھنا چاہیئے بالخصوص مادر ٹریسا۔ چونکہ ان کی ہر قصبہ اور شہر میں اس قدر کثرت ہو گئی ہے کہ جہاں پہلے قل خوانی کی نام نہاد رسم پر صرف ایک ملاں مذہبی رسوم ادا کرتا تھا اب ان کے معاشی حل کے لئے ایسے مواقع پر کم از کم ایک درجن اکھٹے ہو جاتے ہیں۔ اسلام نے سادگی سکھائی ہے مگر اب ہر رسم میں فضول خرچی کو جگہ دلائی جا رہی ہے جس سے مرحوم کے ورثا اور لواحقین کو معاشی طور پر مزید زیرِ بار ہونا پڑتا ہے۔ انہی لوگوں کی وجہ سے مساجد ضرار بن گئی ہیں جن کی بنیاد تقویٰ پر نہیں بلکہ دنیاوی منفعت ہے۔ بلاک ایکس شہر ڈیرہ غازی خان کے صرف ایک چوک میں پانچ مساجد ہیں۔ کیا یہ مساجد مسلمانوں میں انس پیدا کر سکتی ہیں؟ یہ لوگ نئی مسجد بنا کر مسلمانوں کو جاہل رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کو آپس میں آئے دن فساد برپا کر کے لڑاتے ہیں تاکہ ان کے معاشی مسائل چندے کے ذریعہ حل ہوتے رہیں۔ ان مساجد کے لاؤڈ سپیکروں کے ذریعہ ان کی پارسائی کا غلغلہ بلند سے بلند تر ہوتا جائے۔ حالانکہ فرمانِ خداوندی ہے کہ " تم چاہے اپنی بات پکار کر کہو، وہ تو چپکے سے کہی ہوئی بات بلکہ مخفی تر بات بھی جانتا ہے" (سورۃ طٰہٰ 6-7)۔ پھر ایک اور جگہ فرمایا " اپنی چال میں میانہ روی اختیار کرو اور اپنی آواز پست رکھو کیونکہ آوازوں میں سب سے بری آواز گدھے کی ہے (سورۃ لقمان ۱۹)

چونکہ یہ لوگ دن کو سو کر نیند پوری کر لیتے ہیں لہٰذا وقت بے وقت کی راگنی سپیکر پر گاتے ہیں اس شور بے ہنگم سے لوگ نالاں ہیں مگر ان کے " فتویٰ" سے ڈر کر خاموش ہیں۔ یہ لوگ اسلام سے لوگوں کو متنفر کر رہے ہیں اور شور سے ذہنی امراض بڑھ رہے ہیں۔ عموماً ہر مسجد پر قابض ملاں تان سین بننے کی کوشش کرتا ہے۔

الاماشاء اللہ پچھلے چودہ سو سالوں سے مساجد میں خاموشی سے عبادت ہوتی رہی ہے مگر اب مسجد میں بھی بھجن گائے جارہے ہیں[۱]۔ یہ نام نہاد ملاں جاگیردار طبقہ کے مراعات یافتہ تھے لہٰذا حرم سرا کی افادیت کو برقرار رکھنے اور عورتوں کو اُن کے حقوق جو اسلام نے اُن کو دیئے تھے، بے خبر اور پامال کرنے کی غرض سے زنانہ تعلیم کو شجرِ ممنوعہ قرار دیا۔ اس طرح سے نصف آبادی کو پوری طرح جاہل رکھا۔ جاہل عورت نہ تو اچھی ماں بن سکتی ہے اور نہ بیوی۔ اس قبیل کے لوگوں کی مثال ڈاکٹر مبارک علی نے "بہشتی زیور" نامی کتاب کے حوالے سے[۲] دی ہے جس میں مولانا اشرف علی تھانوی عورت کو صرف دینی تعلیم پڑھنے کی سفارش کرتے ہیں مگر لکھنے کی تربیت حاصل کرنا ممنوع قرار دیتے ہیں۔ سرسید احمد خان جن کی مسلمانوں کے لئے تعلیمی مساعی کے دن رات گن گائے جاتے ہیں وہ بھی صرف جاگیردار طبقہ کے بچوں کی تعلیم کے قائل تھے تاکہ وہ انگریزوں سے بڑے بڑے مناصب حاصل کرکے اپنی موروثی ریاستوں اور جاگیروں کی عظمت بحال رکھ سکیں۔ وہ ایک جگہ عوامی تعلیم کے خلاف تحریر کرتے ہیں "افسوس اس بات کا ہے کہ ہمارے دوستوں کے اب تک وہی پرانے خیالات ہیں۔ وہ بورڈنگ ہاؤس کو ایسے لوگوں سے بھرنا چاہتے ہیں جو مسجدوں میں مُردوں کی فاتحہ کی روٹیاں کھانے پر بسر اوقات کرتے ہیں۔ افسوس کہ اُن کو تعلیم کی ابھی تک قدر نہیں"[۳] وہ دراصل جاگیرداروں اور اُمراء کے خدائی حقوق (DIVINE RIGHTS) کے قائل تھے۔ سائینسی علوم سے تو اُن کو خاص طور پر چڑ تھی اور مسلمانوں کو اس سے دور رہنے کی ہدایت کی۔ وہ عوام اور لڑکیوں کی تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ مولوی طفیل احمد منگلوری اپنی کتاب میں سرسید کے متعلق لکھتے ہیں "انہوں نے حکومت کی اس تجویز کی بھی مخالفت کی جو لڑکیوں کے سکول کھولنے کے سلسلہ میں تھی، یہاں تک کہ جب مولوی ممتاز علی نے خواتین کا اخبار نکالنا چاہا تو سرسید نے انہیں اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی"[۴]

مسلمانوں کو اس پستی سے نکالنے کے لئے ضروری خیال کیا گیا کہ ان میں تعلیم کو فروغ دیا جائے۔ اللہ کی رحمت ان بزرگوں پر ہو کہ انہوں نے تعلیم صرف جاگیردار طبقے کے لئے نہیں رکھی بلکہ عوام کے لئے۔ چونکہ مسلمان معاشی طور پر بھی نہایت پس ماندہ تھے لہٰذا موزوں اور مستحق طلباء کی امداد کے لئے انجمن کا قیام لازمی سمجھا گیا۔ اس غرض سے

۱۔ قرآن مجید میں گانے کو لھوالحدیث (سورۃ لقمٰن: ۶) کہا گیا ہے اور اس سے منع فرمایا۔

۲۔ بہشتی زیور حصہ چہارم صہ 45 مطبوعہ لاہور   مولانا اشرف علی تھانوی

۳۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل از مولوی طفیل احمد منگلوری منقولہ تاریخ و آگہی از ڈاکٹر مبارک علی صہ 273، دو آرٹ پریس لاہور

۴۔ ایضاً صہ 2-5

درد مند مسلمانوں نے اس کارِ خیر میں شامل ہو کر یکم جون ۱۹۱۳ء کو ضلعی تعلیمی انجمن کی بنیاد رکھی ۔ اس انجمن کے ابتدائی عہدیدار اور ممبران حسب ذیل تھے :۔

سردار عزیز محمد خان پتافی	میر مجلس
دوست محمد خان حجانہ	اعزازی سکریٹری
میاں نور احمد خان	آمین
سردار کرم خان لغاری	ممبر
اللہ بخش خان فوفل زئی	ممبر
شیخ کریم بخش فاروقی	ممبر
غلام رسول خان کورائی	ممبر
گل محمد خان بزدار	ممبر
سردار احمد خان پتافی	ممبر
منشی ولی محمد زمیندار	آڈیٹر
مولوی شمس الدین تاجر	آڈیٹر

اس انجمن کے اغراض و مقاصد حسب ذیل تھے :۔

۱۔ مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور کامیابی کے لئے حکومت کی توجہ اور مدد حاصل کرنا اور قوم کی دلچسپی اور توجہ تعلیم کی طرف پیدا کرنا ۔ اس غرض سے انجمن کا قیام ضروری تھا تاکہ آئینی اور جمہوری کوشش کے سلسلہ میں متفقہ آواز ہو کیونکہ جس قدر اثر مجموعی آواز کا ہو سکتا ہے اتنا منتشر آواز کا نہیں ہو سکتا ۔

۲۔ مسلمان بچوں کے لئے بورڈنگ ہاؤس کا قیام تاکہ انہیں اچھی تربیت دی جا سکے ۔

۳۔ ہونہار مگر مفلس طلباء کی وظائف کے ذریعہ امداد کرنا ۔

۴۔ اچھے اور اعلیٰ اخلاق پیدا کرنے کے لئے کتب خانے اور دارالمطالعہ کا قیام ۔

۵۔ مسلمان یتیم اور لاوارث بچوں کی پرورش کا انتظام کرنا ۔

اس انجمن کے روح رواں سردار احمد خان پتافی تھے ۔ اُن دنوں اُن کی رہائش لنڈی پتافی میں تھی جو جام پور شہر سے چار میل جانب مشرق ہے ۔ اس انجمن کے ابتدائی اخراجات سردار احمد خان نے برداشت کئے ۔ ان کی سعی اور کوشش کی بدولت کسانوں نے اُس دودھ سے گھی تیار کر کے رقم انجمن میں دی جو اس سے قبل وہ شیخ عبدالقادر گیلانی کے نام پر ہر ماہ گیارہ تاریخ کو خیرات کر دیتے تھے ۔

اس انجمن کے لئے دوست محمد خان مجانہ کو اعزازی سکرٹری مقرر کیا گیا جو ان دنوں ایک مدرسہ میں مدرس تھے۔ اس سکول کے ہندو ہیڈ ماسٹر نے شکایت کی جس کی بنا پر ان کا ایک دور افتادہ علاقہ کے سکول میں تبادلہ کر دیا گیا۔ دوست محمد خان کے علاوہ کوئی ممبر انجمن کے لئے سکرٹری کے فرائض سرانجام دینے کے لئے تیار نہ تھا لہٰذا اس قومی خدمت کو سرانجام دینے کے لئے انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے کر ذاتی مفاد کی قربانی دے کر ایک اعلیٰ مثال قائم کی۔

ضلعی مسلم تعلیمی کانفرنس جام پور

چونکہ جام پور کو ضلع ڈیرہ غازی خان میں مرکزی مقام حاصل تھا لہٰذا اس انجمن کا صدر دفتر بھی جام پور میں رکھا گیا۔ جام پور میں ضلعی مسلم تعلیمی کانفرنس ۳ اپریل سے ۵ اپریل ۱۹۱۴ء تک منعقد کی گئی۔ اس کانفرنس کے اخراجات پورے کرنے اور چندہ اکٹھا کرنے کی خاطر ملک یار محمد خان جکھڑ، اللہ بخش خان نوفلزئی، مولوی شمس الدین، میاں نور احمد خان اور سردار احمد خان پتافی نے سرگرم حصہ لیا۔ اس کانفرنس میں کئی قرار دادیں منظور کی گئیں۔ جن میں سے چند درج کی جاتی ہیں۔

۱۔ آل انڈیا مسلم تعلیمی کانفرنس سے استدعا کی گئی کہ انجمن حمایت اسلام جامپور کو بطور ڈسٹرکٹ کمیٹی تسلیم کرتے ہوئے ضروری تعلقات قائم کرے۔

۲۔ ضلع کے تمام سرداروں خصوصاً تمندارون سے استدعا کی گئی کہ مسلمانان ضلع کی تعلیمی پستی کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس کانفرنس کے اغراض و مقاصد میں عملاً حصہ لیں۔

۳۔ چونکہ دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی ضروری ہے لہٰذا سجادہ نشین تونسہ شریف سے استدعا کی گئی کہ تونسہ سکول کے طلبا کی دینی تعلیم کے لئے اپنی طرف سے ایک استاد کا انتظام کریں۔ اسی طرح سے انجمن اسلامیہ ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ غازی خان کے سکول کے لئے، تمندار درلیشک راجن پور کے لئے اور تمندار مزاری روجھان کے سکول کے لئے استاد کی تنخواہ ادا کریں جو بچوں کو سکول کے اوقات کار کے بعد دینی تعلیم دیں۔

اس کانفرنس کا پہلا اجلاس نواب جمال خان لغاری کی زیر صدارت ہوا۔ دوسرے اجلاس کی صدارت نامور محب وطن اور آزادی پسند سردار محمد اسلم خان بنکانی سابق ایڈیٹر "الامین" امرتسر نے کی۔ تیسرے تا آٹھویں اجلاس کی صدارت بھی نواب جمال خان لغاری نے کی۔[1]

جام پور میں جو سکول جاری ہوا اس نے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی میں بڑا اہم کردار ادا کیا جس کو "چھوٹا علی گڑھ" کہا جا سکتا ہے۔ سردار احمد خان پتافی نے تمام عمر اس سکول کی سرپرستی کی اور یہاں سے سینکڑوں طلبا فارغ التحصیل

[1] روئیداد ڈسٹرکٹ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس جام پور ۱۹۱۴ء

ہوئے جنہوں نے اس ضلع کی قومی زندگی میں اہم کردار ادا کیے۔

کوئٹہ کا زلزلہ

۱۹۳۵ء میں کوئٹہ ایک زبردست زلزلہ کی آفت سے دو چار ہوا جس میں شدید جانی و مالی نقصان ہوا۔ کوئٹہ کی آبادی میں اہلِ ڈیرہ غازی خان بہت بڑی تعداد میں شامل تھے کیونکہ یہ لوگ وہاں ملازمت اور کاروبار کے سلسلہ میں مقیم تھے۔ اس زلزلہ سے سارے ضلع میں کہرام مچ گیا۔ ہر گھرانہ اپنے عزیز و اقارب کی خیریت معلوم کرنا چاہتا تھا۔ ڈیرہ غازی خان کے عوام کے جانی نقصان کا اندازہ ایک غمزدہ باپ کی تیار کردہ سنگی لوح سے کیا جا سکتا ہے جو اُس وقت کے ہندو ہائی سکول ڈیرہ غازیخان کے کنواں کے قریب نصب تھی۔ جسے اب کمرشل کالج کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اُس پر درج تھا:۔

"پانی کی یہ ٹینکی لالہ مادھوداس ٹوٹیجہ ریٹائرڈ ڈپٹی ای ایس (محکمہ تعلیم) نے اپنے پیاروں کی یاد میں تعمیر کرائی جو کوئٹہ کے زلزلہ مورخہ ۳۱-۵-۱۹۳۵ میں ابدی نیند سو گئے۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں:۔

۱	شریمتی پیاری بائی	ساس
۲	شریمتی نندی بائی	بیوی
۳	شریمتی جانکی دیوی	بیٹی
۴	وتوئے کمار	پوتا
۵	صوفیہ	پوتی
۶	ڈاکٹر لیشن داس ایم بی بی ایس	بیٹا
۷	شریمتی رادھا بائی	بہو
۸	اوشا	پوتی
۹	ششی	پوتا
۱۰	روی	پوتا
۱۱	جگ موہن لال	بیٹا
۱۲	شریمتی سیتا دیوی	بہو
۱۳	کرن لتا	پوتی
۱۴	شریمتی وشنو دیوی	بیٹی
۱۵	لاجپت رائے	پوتا
۱۶	چیتن آنند	بیٹا
۱۷	شریمتی شیام بائی	بہو

ڈیرہ غازی خان کے سیلاب

ضلع ڈیرہ غازی خان کو دریائے سندھ سے اکثر و بیشتر سیلاب کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اس دریا کے سیلابوں میں کئی شہر اور قصبے غرق ہو گئے۔ 1812ء، 1833ء، 1841ء اور 1856ء میں زبردست سیلاب آئے۔ کالا بند کی تعمیر کی وجہ سے 1878ء تک علاقہ دریائے سندھ کی تباہ کاری سے محفوظ رہا مگر جب اٹک پر دریائے سندھ 6.45 فٹ تک چڑھ گیا تو سیلاب سے ڈیرہ غازی خان چھاؤنی اور شہر کو نقصان اٹھانا پڑا۔ 1857ء سے پہلے ڈیرہ غازی خان چھاؤنی شہر کے مشرقی جانب واقع تھی۔ سیلاب کی وجہ سے چھاؤنی کو سخت نقصان پہنچا۔ لہٰذا چھاؤنی کو شہر کے مغرب میں تعمیر کیا گیا۔ اسی طرح سے قدیم قلعہ کو ہموار کر کے عمارات برائے کچہریاں بنائی گئیں۔ 1888ء اور 1889ء کی طغیانی نے گورنمنٹ کو شہر ڈیرہ غازیخان کو دریائے سندھ سے بچانے کی طرف متوجہ کیا اور شہر کے گرد پتھروں کا ایک مضبوط بند باندھا گیا مگر اگست 1895ء میں دریائے سندھ نے شمالی طرف سے کٹاؤ شروع کر دیا۔ اس حصے کی فوراً مرمت کی گئی اور اسے گرائین یعنی پشتہ کی صورت دے دی گئی۔ 1896ء میں اسے پھر مضبوط کیا گیا۔ مگر اگلے سال ساری محنت رائیگاں گئی اور اسے دریا بہا کر لے گیا۔ 1901ء میں تین مدافعتی بند بنائے گئے جو ایک دوسرے سے پونے میل کے فاصلے پر تھے جن میں سے دو اسی سال بہہ گئے۔ آخرکار 1909ء میں شہر تباہ ہو گیا اور نیا شہر پرانے شہر سے دس میل مغرب میں آباد کیا گیا۔[1]

ڈیرہ غازی خان شہر کی تباہی سے تقریباً دس سال پہلے دریائے سندھ کٹاؤ کر کے شہر سے تقریباً تین ہزار فٹ (نصف میل) کے فاصلے پر پہنچ گیا۔ شہر کو بچانے کے لئے پتھروں کا بند بنایا گیا تاکہ جب کٹاؤ سے پتھر دریا کی تہہ میں جائیں تو قدرتی بند بن جائے۔ یہ سکیم عارضی طور پر کامیاب رہی۔ اس غرض سے پتھر کوہستان نمک سے واڑچھہ کی کانوں سے اور سکھر سے لائے گئے۔ اس پر سات لاکھ روپے سے زائد رقم خرچ ہوئی جسے حکومت ہند، حکومت پنجاب اور میونسپل کمیٹی ڈیرہ غازی خان نے برابر برابر برداشت کیا۔[2]

ڈیرہ غازی خان کی طرح مٹھن کوٹ 1862ء میں تباہ ہو گیا۔ اس دور میں اسے تحصیل کا درجہ حاصل تھا۔ شہر کی تباہی پر راجن پور کو تحصیل کا درجہ دے دیا گیا اور اسسٹینٹ کمشنر کا دفتر وہاں پر منتقل کر دیا گیا۔ راجن پور کا شہر مخدوم راجن شاہ نے 33-1732ء میں آباد کیا تھا۔ 1862ء تک یہ ایک معمولی قصبہ رہا۔

مذکورہ طوفانوں کے علاوہ 1917ء، 1929ء، اور 1942ء میں بھی زبردست سیلاب آئے جن سے علاقے میں بڑی تباہی پھیلی۔

1- Imperial Gazzetteer of India vol. II P. 269 ed. 1881
2- History of The Punjab P. 260 Syed Muhammad Latif.

ڈیرہ غازی خان میں زمینداری نظام

انگریزوں کی آمد سے قبل قبائلی علاقے میں اراضی قبیلے کی مشترکہ جائیداد ہوتی تھی جو افرادی قوت کے مطابق خاندانوں میں بانٹ دی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ ہر قبیلے کا ایسا قطعہ اراضی ہوا کرتا تھا جہاں تمام قبیلہ کے مولیشی چرتے تھے۔

جب انگریزوں نے یہاں قبضہ جمایا تو انہوں نے اپنے ہاتھوں کو مضبوط کرنے کے لئے تمنداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کی جماعت تیار کی جو ان کی حکومت کے لئے باعثِ تقویت بنیں۔ ان لوگوں کے پاس انگریزوں کی طرف سے دیئے گئے اعزازات کے علاوہ اعزازی مجسٹریٹ کے اختیارات بھی تھے۔ انہوں نے ہر طریقہ سے اراضیات کو غصب کرنا شروع کیا۔ بندوبست اراضی میں قبائلی چراگاہوں کو ان لوگوں نے اپنی ملکیت درج کرایا اور اس طرح سے وہ وسیع و عریض قطعہ اراضی کے مالک بن گئے۔ پھر بعض جگہوں پر فقط درخواست دینے پر ان تمنداروں کو وسیع رقبے مل گئے جو اب بھی درخواست کے نام سے موسوم ہیں مثلاً درخواست جمال خان۔ انگریزوں نے ان دھاندلیوں کو نظر انداز کئے رکھا کیونکہ مجرم لوگ احتساب کے ڈر سے حاکمِ اعلیٰ کے احکامات چون و چراں کئے بغیر تعمیل کرتے ہیں اور بھیگی بلی بن کر اُن کے سامنے حاضری دیتے ہیں۔ اس طریقے سے انگریز بھی زیادہ سے زیادہ قومی جرائم کرنے کا موقع فراہم کرتا رہا تاکہ یہ مجرم ذہنیت کے سردار کبھی اپنے آقا کے سامنے آنکھ اٹھا کر بات نہ کرسکیں اور یہی فارورڈ پالیسی کا مقصد تھا۔ اس طرح سے ایک ایسا طبقہ پیدا کیا جو اُن کا غلام بن کر اپنے عوام کو تہ و بالا کرے۔

مسٹر ایس ایم اکبر لکھتے ہیں

" انگریزوں نے زمین میں ملکیت کے حقوق یا تو برطانیہ کے زمینداروں کی طرز پر حالات کی لاعلمی کی بنا پر دیئے جو اس ملک میں موجود تھے یا جان بوجھ کر ایسا کیا گیا تاکہ اس ملک میں ایسا طبقہ پیدا کیا جائے جن کی وفاداریوں پر حکومت برطانیہ بھروسہ کرسکتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ ان سب بڑے زمینداروں میں سے ایک بھی اپنے حقوق 1857ء (جنگ آزادی) سے قبل ثابت نہیں کرسکتا۔ اُن میں سے کوئی بھی یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ انہوں نے یہ حقوق انگریز کی نظرِ کرم کے بغیر حاصل کیے ہیں"[1]۔ ان جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں نے عوام کی اراضی پر جبر و اکراہ اور مکر و فریب سے قبضہ کیا اور پھر کسان کو اس قدر مفلوک الحال کردیا کہ وہ ہر ذلت سہنے کو تیار ہوگیا۔ اسی ظلم نے اب تک اس ضلع کو پنجاب کا سب سے زیادہ پسماندہ علاقہ رکھا ہے۔

نہری نظام

خاندان میرانی سے قبل کسی نہر کی موجودگی کا ثبوت نہیں ملتا۔ اس سے قبل اگر کوئی نہر تھی تو وہ میرانی خاندان کے وقت تک برباد ہوچکی تھی۔ کیونکہ منگول کے مسلسل حملوں اور

1- ECONOMICS OF PAKISTAN P. 92-93 S.M. Akbar.

لوٹ مار کی بدولت اکثر و بیشتر علاقے ویران ہو چکے تھے۔ جب بلوچ عہد میرانی میں اس ضلع میں وارد ہوئے تو اس وقت عملی طور پر سارا علاقہ انسانی آبادی سے خالی ہو چکا تھا۔ قلیل آبادی علاقہ بیٹ میں موجود تھی جو حملہ آوروں کی آمد پر گھنے جنگلوں میں چھپ جاتی تھی جو دریا کے بیٹ میں اگتے تھے۔ یہاں پر یہ امر واضح رہے کہ میرانی یا دودائی بلیدی قبیلہ کا خان خیل طائفہ تھا۔ جو بلوچستان سے قسمت آزمائی کرنے یہاں وارد ہوا۔ بالاچ خان گورگیج کی جنگیں بیورغ بلیدی (دودائی)[1] سے ہوئی تھیں۔

خاندان میرانی کے عہدِ حکومت اور بعد میں مختلف طغیانی کی نہریں دریائے سندھ سے نکالی گئی تھیں جن میں سے کچھ کا ذکر وقتاً فوقتاً پہلے ہو چکا ہے۔ باقی انہار حسب ذیل تھیں۔

نالہ قطب: اسے مخدوم راجن شاہ نے احداث کرایا۔ اس کام کا انتظام قطب خان کورائی کے ذمہ تھا۔ اس لیئے اس کے نام سے مشہور ہوئی۔

کڑیہ گامنوں: ملک گامنوں خان جکھڑ نے 1847ء بکرمی میں احداث کرایا۔ کابل کی حکومت نے جب ملک فتح محمد خان پسر ملک گامنوں خان پر ایک لاکھ روپے جرمانہ کیا تو اس کی ادائیگی کے لئے اُسے کڑیہ گامنوں رہن رکھنا پڑا۔ (کوشش کے باوجود یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ جرمانہ کیوں کیا گیا تھا)

نالہ شوریہ: اسے شبنو خان پتافی نے احداث کرایا۔ چونکہ اس کا پانی بکثرت تھا لہٰذا شوریہ مشہور رہا۔

مسوواہ: محمد مسو خان نتکانی نے احداث کرایا۔ } ان دونوں نالوں کی احداث میں مسٹر مچن ڈپٹی کمشنر نے بڑی دلچسپی لی۔

فضل واہ: فضل علی خان لنڈ نے 1863ء میں احداث کرایا }

نالہ سون: 1765ء میں محمود خان گجر نے احداث کرایا۔

انہار ضلع ڈیرہ غازی خان کا قدیم ترین نقشہ 4-1853ء میں تیار رہا تھا۔ لیفٹیننٹ انجینئر جولیس۔ جی۔ میڈلے ڈیرہ جات انہار کا سپرنٹنڈنٹ تھا۔ اس نقشے میں ایک پرانی نہر کے آثار کا ذکر ہے جس کو وہ مانکہ کے آثار بتاتا ہے جو صحیح نہیں۔ یہ ڈھول واہ کے آثار ہیں جو محمود خان گوجر نے احداث کرانا شروع کیا تھا مگر مکمل نہ ہو سکا۔ اسی نہر کے ساتھ ساتھ اس نے موضع درخواست جمال خان میں گورنمنٹ ہائی سکول میاں پھیرو کے شمال مشرق میں ایک نیا شہر آباد کرنا شروع کیا تھا جس کی ویران سڑکوں پر مصنف کتاب ہذا بچپن میں کھیلتا رہا۔ گوجر حکومت کے خاتمے پر یہ قصبہ ویران ہو گیا۔ 1935ء تک سڑکیں اور مساجد واضح تھیں۔

نسل و اولاد: محمود خان گوجر کی اولاد میں دو بیٹے اور ایک لڑکی تھی۔ بیٹوں کے نام فاضل خان اور اللہ داد خان تھے جبکہ اسکی

۱۔ تاریخ بلوچستان شخصیات کے آئینہ میں صہ ۱۰۳ پروفیسر عزیز محمد بگٹی قلات پریس کوئٹہ 1987ء

بیٹی کا نام بھو بیگم اور لقب مائی صاحبِ دولت تھا۔ وہ غلام شاہ کلہوڑہ کے عقد میں آئی۔ جب میاں عبدالنبی خان کو سندھ سے نکال دیا گیا تو مائی بیگم اپنے بھائی اللہ داد خان کے پاس احمد پور شرقیہ چلی گئی۔ فاضل خان نے اپنے نام پر فاضل پور کا قصبہ آباد کیا اور دریائے سندھ سے نہر نکالی جس کا نام فاضل واہ تھا۔

خانقاہیں

پاکستان کے دیگر علاقوں کی مانند اس ضلع میں بھی کئی بزرگانِ کرام کی خانقاہیں اور روضے موجود ہیں۔ ان بزرگانِ دین کے متعلق کچھ حقائق تو معلوم ہیں مگر زیادہ وقت گزرنے کے ساتھ روایات کا ایسا جال بُن جاتا ہے جس میں سے حقیقت معلوم کرنا بعض اوقات ناممکن ہو جاتا ہے۔ بدقسمتی سے برصغیر کے مسلمانوں میں اولیاء کرام سے صرف کشف وکرام اور محیر العقول واقعات بیان ہوتے رہے ہیں۔ اُن کے علمی اور تبلیغی کاموں کی طرف کبھی توجہ نہیں دی گئی۔ اس میں عوام کا قصور نہیں بلکہ اس کا سبب اہلِ علم عقیدت مندوں کا غلو اور غیر محتاط رویہ ہے۔ انہوں نے جوشِ عقیدت میں اپنے بزرگوں کو آسمانی مخلوق بنا دیا یا انہیں دیو مالائی کردار کا روپ دے دیا۔ اُن کے متعلق ایسے ایسے واقعات گھڑ لیئے گئے ہیں جن کا تعلق ذرہ بھر اسلامی اقدار سے نہ تھا۔ بزرگوں کی زندگی کے حالات میں عام طور پر بیان کیا جاتا ہے کہ وہ چلہ کشی کے دوران سالہا سال تک ایک اندھے کنویں میں الٹے لٹکے رہے یا وہ طویل مدت تک جنگل میں عبادت کرتے رہے جہاں ان کی غذا درختوں کے پتے تھے یا وہ لنگر کے مہتمم ہونے کے باوجود مدت دراز تک بغیر خوراک رہے کیونکہ انہیں یہ تو نہ کہا گیا تھا کہ تم بھی اسی لنگر سے کھانا کھا سکتے ہو حالانکہ اسلام اپنے نفس کے حقوق بھی تسلیم کرتا ہے۔ اللہ تعالٰے نے انسان پر واضح کر دیا ہے کہ یہ کائنات اور اس کے جملہ ذرائع سب انسان کی خدمت کے لیئے پیدا کیئے گئے ہیں اور انسان کو ان سے پورا فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ اس ضمن میں فرمانِ خداوندی ہے

"اے ایمان والو! جو پاک چیزیں اللہ نے تمہارے لیئے حلال کی ہیں، انہیں حرام نہ کرو اور حد سے تجاوز نہ کرو۔ اللہ تعالٰے کو زیادتی کرنے والے سخت ناپسند ہیں۔ جو کچھ حلال وطیب رزق اللہ نے تم کو دیا ہے اسے کھاؤ پیو اور اس خدا کی نافرمانی سے بچتے رہو جس پر تم ایمان رکھتے ہو" (المائدہ 87 - 88) یہ طریقے عیسائی اور ہندو راہب اختیار کرتے ہیں مگر اسلام میں رہبانیت ممنوع ہے۔ اسی دنیا میں رہ کر اسلامی اقدار کو نبھانا سب سے بڑی نیکی ہے۔ جنگل یا مسجد میں ہر وقت عبادت کرنے والا رزقِ حلال کمانے والے سے افضل ہے۔ جب ان اولیاء کرام کے متعلق رہبانیت کی کہانیاں گردش میں آئیں تو زمانے کے ساتھ اُن کے عقیدت مند اور زیادہ غیر محتاط ہوتے گئے۔ پھر یہ حال ہو جاتا ہے کہ ان کے حالاتِ زندگی لکھنے والے اُن کے علمی، مشاغل اور تبلیغی کارناموں کو بالکل چھوڑ کر ان کی زندگی کو الف لیلٰے سے بھی بڑھ کر ایک دلچسپ داستان بنا دیتے ہیں جس میں حقیقت چھپ جاتی ہے اور افسانہ رہ جاتا ہے۔ غلو کی انتہا یہ ہے کہ حضرت سخی سرور کے والد بزرگوار کی شادی ایک صحابیِ رسول ؐ کی بیٹی سے لکھی گئی ہے جس کے بطن سے 535ھ میں حضرت سخی سرور پیدا ہوئے۔ گویا ایک صحابیِ رسول اللہ پانچ سو برس تک زندہ رہا حالانکہ آخری صحابی حضرت ابوالطفیل

۱۱۰۰ھ میں انتقال فرما گئے۔ صوفی عنایت شاہ (قوم لنگاہ) ساکن میراں پور (سندھ) کے ایک مرید غلام محمد شاہ نے اپنے پیر کو سجدہ کرنا شروع کر دیا اور پیر صاحب بھی اس پر راضی تھے۔ یہ تو بھلا ہو اُس وقت کے علماء کرام کا کہ اس بدعت کے خلاف سخت اقدام کئے اور پیر صاحب کو عدالتی کارروائی کے ذریعہ سزا دلوائی اور اس طرح سے اس بدعت کا سدِ باب کر دیا۔ اسی طرح سے سید محمد جون پوری کے ایک مرید کے حالتِ حال میں ایک غیر محتاط فقرے "اَنْتَ مہدی" کے زبان سے نکالنے پر انہیں خیال آیا کہ وہ مہدی موعود ہیں۔ اسی غلو کا نتیجہ لواری (سندھ) اور کوہ مراد (فاران بلوچستان) کے حج ہیں۔ ذکری کوہ مراد پر حج کے جملہ مناسک ادا کرتے ہیں حتیٰ کہ اب زم زم بھی بنا لیا گیا ہے۔ غیر محتاط رویے کے نتیجے میں بہشتی دروازے معرضِ وجود میں آئے۔

بہشت میں جانے کے لئے ہر سال کسی بہشتی دروازے سے گزرنا کافی ہے۔ کتنا سستا نسخہ ہے! قرآن مجید میں تو بار بار اعمالِ صالحہ پر زور دیا گیا ہے مگر یہاں ایک دروازے سے گذرنا کافی قرار دیا گیا ہے۔ ایک غیر معروف سے آدمی نے کہہ دیا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس دروازے سے خانقاہ کے اندر داخل ہوتے دیکھا۔ کسی نے اس شخص کے اخلاق، سچائی اور کردار کو نہیں پرکھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا اس کی بات پر اعتبار کر لیا گیا اور بہشتی دروازہ بن گیا۔ دراصل اس بات کا مقصد صاحبِ روضہ کی عظمت کو مزید اجاگر کرنا تھا۔ اگر اس بات کو سچ تسلیم کر لیا جائے تو ماننا پڑے گا کہ نعوذ باللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس روضے والے کی زیارت کرنے آئے تھے جو رسول اللہ کے پاسنگ کے برابر بھی نہ تھا۔ دراصل لوگ ایسی ہی دیو مالائی کہانیوں کی تلاش میں ہوتے ہیں اور زمانہ ساز لوگ ان کو ایسے افسانے تیار کر دیتے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں اُن کی دنیا کے وارے نیارے ہو جاتے ہیں خواہ آخرت تباہ ہو جائے۔

اسی طرح کی سینکڑوں مثالیں دی جاسکتی ہیں مگر اصل مسئلہ یہ ہے کہ یہ اولیاء کرام بھی انسان تھے۔ البتہ انہوں نے ارکانِ اسلام پر پورا عمل کیا اور بزرگوں کا مرتبہ پایا۔ ہمیں اُن کے خدمتِ خلق، علمی اور تبلیغی کارناموں کو اجاگر کرنا چاہیئے۔ ہمیں ان کے حالاتِ زندگی سے جو اچھے درس ملتے ہیں اُن پر عمل پیرا ہونا چاہیئے۔ غیر اسلامی روایات کو رد کر دیں کیونکہ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الممتحنۃ کی آیت ۱۲ میں فرمایا "اے نبی! جب تمہارے پاس مومن عورتیں بیعت کرنے کے لئے آئیں اور اس بات کا عہد کریں کہ وہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ کریں گی، چوری نہ کریں گی زنا نہ کریں گی، اپنی اولاد کو قتل نہ کرینگی، اپنے ہاتھ پاؤں کے آگے کوئی بہتان (تہمت) گھڑ کر نہ لائیں گی اور کسی امر معروف (نیکی کا کام) میں تمہاری نافرمانی نہ کرینگی، تو ان سے بیعت لے لو اور ان کے حق میں اللہ سے دعائے مغفرت کرو بے شک اللہ بخشنے والا ہے"۔ اس آیت مبارکہ کی تفسیر میں علامہ الوسی فرماتے ہیں کہ "یہ ارشاد اُن جاہلوں کے خیال کی تردید کرتا ہے جو سمجھتے ہیں کہ اولی الامر (حاکم، بزرگ، پیر، اولیا) کی اطاعت مطلقاً لازم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تو

۱۔ تذکرہ صوفیائے سندھ ص ۱۳۴ طبع ۱۹۵۹ء اعجاز الحق قدوسی

رسول کی اطاعت پر بھی معروف کی قید لگا دی ہے حالانکہ رسول کبھی معروف کے سوا حکم نہیں دیتا۔ اس سے مقصود لوگوں کو خبردار کرنا ہے کہ خالق (اللہ) کی نافرمانی میں کسی کی اطاعت جائز نہیں"
ان بزرگان دین کے جو تاریخی حقائق اور روایات معلوم ہو سکے ہیں، قارئین کی خاطر درج کئے جاتے ہیں اور پھر حقیقت اخذ کرنا ان کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے۔

حضرت سخی سرور

ڈیرہ غازی خان سے مغرب میں 35 کلو میٹر کے فاصلے پر سخی سرور نامی قصبہ آباد ہے جو حضرت سخی سرور نامی بزرگ کی وجہ سے اس نام سے منسوب ہے۔ قدیم دور میں اس قصبہ کا نام لگاھ تھا۔ جناب سبط حسن کے مطابق "خیال کیا جاتا ہے کہ سخی سرور ہندوستانی تصوف یعنی بھگتی کی پیداوار ہے تاکہ ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائی آپس میں پیار و محبت سے رہیں۔ بھگتی کے موٹے موٹے اصول یہ تھے:
"ایشور سے لو لگانا، جگ میں جگدیو کی چمک دمک اور روپ میں سروپ کی جھلک دیکھنا، بھگوان اور اللہ، رام اور رحیم کو ایک سمجھنا۔ سب آدمیوں سے چاہے وہ چمار چنڈال ہوں یا ترک افغان پریم کرنا اور پریم راگ کی نوبت بجانا۔ اونچ نیچ اور ذات پات کے فرق کو نہ ماننا۔ پوجا پاٹ، جنتر منتر، تیرتھ یاترا، گنگا اشنان، برت بھوگ، تلک مالا اور دکھاوے کی رسموں سے انکار، بھائی چارے اور میل ملاپ کو دھرم بنانا، کسی کو دکھ نہ دینا بلکہ دکھوں کی سیوا کرنا، دھن دولت کا موہ نہ کرنا، من کی جوت جگانا اور تن کے سکھ پر دھیان نہ دینا، سرکار دربار سے دور رہنا اور گیان دھیان کے دیپک جلانا"۔ بھگتی تحریک کی ابتداء سوامی رامانج (۱۰۱۶ء تا ۱۱۳۷ء) نے کی۔ ان کے چیلے کبیر، پیپا، اننت نند، بھوانند، سُکھا، سُرسرا، پدماوتی، رائے داس، دھنا اور سائیں وغیرہ تھے۔ یہ چیلے عموماً نیچ ذات کے تھے۔ کبیر جولاہا، دھنا جاٹ، سائیں نائی اور رائے داس چمار تھا۔
جناب سبط حسن کی رائے کی تصدیق لالہ حکم چند کی کتاب تواریخ ڈیرہ غازی خان سے بھی ہوتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ "..... جذامی لوگ اسے زیادہ مانتے ہیں اور اکثر جذامی مرد و زن یہاں بامید شفا رہتے ہیں خصوصاً پنجاب کے زمینداران ہندو و مسلمان بکثرت معتقد سخی سرور کے ہیں۔ گوہرا نامی جذامی قوم کلھنگ و جبرت لنگاہ و احمد خان افغان مریض یہاں آئے۔ گوہرا کا جذام دور ہو گیا۔ جبرت کی نابینائی چلی گئی۔ احمد خان کے مرض جاتے رہے۔ تینوں بطور مجاوران خدمت خانقاہ کی کرنے لگے کہ تب سے انہیں تینوں کی اولاد مجاور اس خانقاہ کی چلی آتی ہے۔ مجذوم کی کلھنگ اور نابینا کی کاہن اور پٹھان کی اولاد شیخ کہلاتی ہے...... پھر بروز بیساکھی یعنی بتاریخ ۱۱ اپریل ہر سال ایک بڑا میلہ اس مقام پر ہوتا ہے۔ اس میلہ کلاں پر ضلع ڈیرہ غازی خان، مظفر گڑھ، ملتان کے لوگ بکثرت جمع ہوتے ہیں۔ بروز بیساکھی تخمیناً بیس پچیس ہزار مرد و زن بچہ جمع ہو جاتا ہے۔ اس میلہ میں ڈھول نقارہ زیادہ بجتا ہے۔

(۱) پاکستان میں تہذیب کا ارتقا ص 8-207 سبط حسن

پہاڑی لوگ بھی کچھ مویشی، بھیڑی بکری، گھوڑے، گھوڑا و دیگر اشیاء کو ہی توبرہ، خلاسی، نمدہ وغیرہ لاکر یہاں میلہ پر فروخت کرتے ہیں۔ کنجریاں جا بجا ناچتی گاتی ہیں اور اس طرح کے تماشا ہوتے ہیں۔ سال ۱۹۲۹ء میں بروز بیساکھی جناب کپتان سنڈمن صاحب بہادر نے بھی جلسہ کمیٹی انعام اسپاں اس جگہ منعقد فرمایا .... اکثر ہندو لوگ اس ضلع و ملتان کے مقام ہذا پر آکر اپنے بچوں کی زنار بندی کرتے ہیں اور جھنڈ اترواتے ہیں۔ <u>بعض بعض مسلمان بھی جھنڈ اپنے بچوں کی یہاں اترواتے ہیں"</u>

محولہ بالا کتاب کی اشاعت کے بعد مسلمانوں کی بڑی تعداد نے ہندوؤں کی طرح یہاں اپنے بچوں کی جھنڈ اتروانا شروع کر دی جو ہندوؤں کی دیکھا دیکھی زور پکڑ گئی۔

اس خانقاہ کے متعلق مسٹر ڈیوڈ راس لکھتے ہیں کہ "یہ عمارت اپنی طرز تعمیر اور مذہبی نقطہ نظر سے عجیب و غریب معجون مرکب ہے جو ایک ہندو مندر، بابا نانک جو سکھ دھرم کے گرو تھے ان کی سمادھ، مقبرہ سخی سرور مع اس کی بیوی اور ایک ٹھاکر دوارہ (بت خانہ) پر مشتمل ہے۔ دریا کے پاٹ سے روضہ تک شاندار سیڑھیاں بنی ہوئی ہیں جہاں ہندو، سکھ اور مسلمان سارا سال زیارت کے لئے <u>آتے</u> رہتے ہیں"

ایک[2] اور مورخ نے لکھا ہے کہ "سید احمد المعروف سخی سرور ۱۲۲۰ء میں ملتان کے قریب پیدا ہوئے۔ انہوں نے لاہور میں تعلیم پائی اور پھر وزیر آباد کے قریب دھونکل چلے گئے۔ باپ کے حکم کے مطابق سخی سرور کے قصبہ کے نزدیک سکونت پذیر ہو گئے اور یہاں پر لوگوں کو تلقین شروع کی۔ شہنشاہ دہلی نے خزانہ شاہی سے رقم روانہ کی تاکہ اپنا مکان تعمیر کریں۔ ملتان کے ایک شخص گنو نامی نے آپ کی شادی اپنی بیٹی بی بی بائی سے کر دی۔ اُن کے تین خدمت گار تھے جن کے نام کھلنگ، کاہن اور شیخ تھے ان کی اولاد اب تک بطور مجاور کام کرتی ہے اور خانقاہ کی معافی کی زمین پر قابض ہیں۔ حسب فرمان سید احمد صاحب 750 کھلنگ 600 کاہن اور تین سو شیخ (یعنی کل آمدنی 5 : 4 : 2 کی نسبت سے تقسیم ہوتی ہے) کی نسبت سے کل آمدنی تقسیم ہوتی ہے اس خانقاہ پر ہندو، مسلمان اور سکھ زائرین بکثرت آتے ہیں۔ دیوان ساون مل نے ہندوؤں کو منع کر دیا تھا اور جو ہندو زیارت کو آتا اُس سے مبلغ سوا روپیہ بطور جرمانہ وصول کرتا تھا۔ 1883ء میں خانقاہ کو آگ لگ گئی اور اس آگ میں نادر شاہ کی طرف سے عطا کردہ دو ہیرے اور شاہ زماں کے عطا شدہ قیمتی زیورات تباہ ہو گئے۔ خانقاہ دوبارہ تعمیر <u>ہوئی</u>۔

منشی گوپال داس نے تاریخ گوجرانوالہ میں لکھا ہے کہ "اکثر معتبرین از روئے اسناد تحریری بیان[3] کرتے ہیں کہ تین

---

۱) تواریخ ڈیرہ غازی خان صہ ۵-۴۴ لالہ حکم چند
2) The land of five rivers and sindh P. 91 David Ross
3) India of Aurangzeb P. 76 M.C. Sarkar.

منقولہ از خلاصۃ التواریخ از سوجان رائے بٹالوی

واللہ اعلم۔ معلوم نہیں ان دونوں میں سے کون سی روایت قرین صحت ہے۔ البتہ دوسری روایت میں عداوت کے سبب جھوٹ کا احتمال ہو سکتا ہے کیونکہ جو مال و دولت سلطان سرور کے مجاوروں کو اس کے معتقدوں سے حاصل ہوتی ہے وہ بہاء الدین زکریاؒ کے مجاوروں کو کبھی خواب میں بھی نصیب نہیں ہوئی اور یہ پیشہ ورانہ ہم چشمی و رقابت تو کوئی نئی چیز نہیں۔ قدیم سے اسی طرح سے چلی آرہی ہے۔ پھر بھلا اول الذکر صوفی (زکریاؒ) کے مقبرے کے مجاور بھی کیونکر جھوٹے اور افترا پرداز ٹھہرں گے۔ قصہ مختصر اس عقدے کی گرہ کشائی اس کے پیروکاروں کو مبارک ہو۔ ہمیں ان معاملات کی تحقیق سے کوئی سروکار نہیں۔ بہر حال شہرت کی بنا پر ہم نے جو دیکھا سنا ہے وہ یہ ہے کہ جاہل اور نیچ قوم کے مسلمان اور پنجاب کے ہندو شرفاء سب اس کے آستانے پر ارادت اور خلوص سے جبہ سائی کرتے ہیں۔

شاہان مغلیہ کے تسلط سے پہلے ہندوستان کے ایک بادشاہ نے دو عدد لعل اس قبر پر بطور نذر کے چڑھائے تھے۔ اس روز سے "پیر صاحب لعل" کے لقب سے ملقب ہوا۔ چنانچہ آج بھی مسلمانوں کے ایک رذیل فرقے کے لوگ جو بھرائی کے نام سے موسوم ہے، بڑی عقیدت کے ساتھ بڑے بڑے ڈھول پیٹتے اور اس کا اسم مبارک اسی لقب کے ساتھ گاتے ہوئے خود بھی رقص کرتے ہیں اور سامعین کو بھی نچاتے ہیں۔ پنجاب میں اس ناچ کو لڈی کہتے ہیں اور اس نغمۂ سماع میں بے پناہ تاثیر ہے۔ اس سے اکثر اہل درد رذیلوں اور احمق شرفاء پر گریہ طاری ہو جاتا ہے۔

روایت ہے کہ پنجاب میں جب کسی ہندو لڑکے کی شادی ہوتی ہے تو بھرائی اس کے گھر کے صحن میں آکر دولہا اور دلہن کے مقابل کھڑے ہو جاتے ہیں اور نغمے الاپنا اور ڈھول پیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر جیسے ہی سرور مذکور کا نام زبان پر آیا پاؤں اٹھا کر ناچنے لگ جاتے ہیں اور جب ہنگامہ رقص گرم ہو جاتا ہے تو وہ ہندو لڑکا اور اس کی بیوی دونوں اس لڈی میں شریک ہو کر بھرائی کی آواز پر رقص کرتے ہیں۔ ان کے اعتقاد میں یہ رقص باعث فیروبرکت ہے۔

بھرائیوں کے نغمۂ سماع میں تین باتیں ہوتی ہیں یا تو وہ سرور کی مدح اس رنگ میں کرتے ہیں کہ وہ پیر صاحب "لعل" تھا یا اس (نغمہ) میں بھیرو نام کے ایک برہمن کا قصہ ہوتا ہے جو ابتدا میں تو نانِ شبینہ تک کا محتاج تھا لیکن بعد میں سرور کے ساتھ اپنی عقیدت راسخ کے سبب ترقی کر گیا۔ یا پھر لاہور، ملتان کے ناظم اور نواب عبد الصمد خان بہادر دلیر جنگ کے بیٹے نواب زکریا خان مشہور بہ خان بہادر کے عدل کا ذکر ہوتا ہے۔

(نواب زکریا خان ابن عبد الصمد خان المعروف نواب خان یا خان بہادر احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے قبل مغلیہ خاندان کا ملتان و لاہور کا ناظم اعلیٰ یعنی وائسرائے تھا۔ 1743ء میں دیوان لکھپت رائے ایمن آباد سے خزانہ لا رہا تھا کہ جسا سنگھ کلال ولد بدر سنگھ نے حملہ کر کے خزانہ شاہی کو لوٹ لیا اور دیوان مارا گیا۔ بعد میں سکھوں کو اس کی خوب سزا دی گئی تاہم حضرت سخی سرور اور نواب زکریا خان کے عدل کا باہمی تعلق کی نوعیت معلوم نہیں ہوئی۔ موجودہ دور میں نواب مذکور کا کوئی ذکر نہیں کیا جاتا۔ یہ قدیم دور کی بات ہے۔ مؤلف)

۔ سی روایت قرینِ صحت ہے البتہ دوسری روایت میں عداوت کے
ت سلطان سرور کے مجاوروں کو اس کے معتقدوں سے حاصل ہوتی
نصیب نہیں ہوئی اور یہ پیشہ ورانہ ہم چشمی و رقابت تو کوئی نئی
اول الذکر صفی (زکریا) کے مقبرے کے مجاور بھی کیونکر جھوٹے
شائی اس کے پیروکاروں کو مبارک ہو۔ ہمیں ان معاملات کی تحقیق
یکھا سنا ہے وہ یہ ہے کہ جاہل اور نیچ قوم کے مسلمان
ت اور خلوص سے جبہ سائی کرتے ہیں۔

ے ایک بادشاہ نے دو عدد لعل اس قبر پر بطور نذر کے چڑھائے
ہوا۔ چنانچہ آج بھی مسلمانوں کے ایک رذیل فرقے کے لوگ جو براہی
۔ ڈھول پیٹتے اور اس کا اسم مبارک اسی لقب کے ساتھ گاتے
تے ہیں۔ پنجاب میں اس ناچ کو لڈی کہتے ہیں اور اس لغو وسماع
ر احمق شرفاء پر گریہ طاری ہو جاتا ہے۔

شادی ہوتی ہے تو براہی اس کے گھر کے صحن میں آکر دو ہلا اور
ھول پیٹنا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر جیسے ہی سرور مذکور کا نام زبان پر
ش گرم ہو جاتا ہے تو وہ ہندو لڑکا اور اس کی بیوی دونوں اس لڈی
ے اعتقاد میں یہ رقص باعثِ خیر و برکت ہے۔
تو وہ سرور کی مدح اس رنگ میں کرتے ہیں کہ وہ پیر صاحب "لعل"
ے جو ابتدا میں تو نانِ شبینہ تک کا محتاج تھا لیکن بعد میں سرور
ر لاہور، ملتان کے ناظم اور نواب عبدالصمد خان بہادر دلیر جنگ کے بیٹے
ا ہے۔

۔ خان یا خان بہادر احمد شاہ ابدالی کے حملوں سے قبل مغلیہ خاندان
دیوان لکھپت رائے ایمن آباد سے خزانہ لا رہا تھا کہ جسا سنگھ
لیا اور دیوان مارا گیا۔ بعد میں سکھوں کو اس کی خوب سزا دی گئی
ہی تعلق کی نوعیت معلوم نہیں ہوئی۔ موجودہ دور میں نواب مذکور کا

باوثوق لوگوں سے سننے میں آیا ہے کہ جب معزالدین جہاندار شاہ اپنے والد بزرگوار شاہ عالم بہادر شاہ بن اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد تخت پر بیٹھا تو اس نے سرور کے نوبت خانے میں چاندی کے نقارے بھجوائے۔ چنانچہ یہ بات بھی عوام کے مزید اعتقاد کا باعث بنی۔ القصہ: سرور کے ہندو مرید اپنے مذہب کے پیشواؤں کو بھی عزت و احترام کے ساتھ یاد کرتے ہیں لیکن درگاہ خداوندی سے اپنی مراد سرور کے وسیلے سے مانگتے اور ہر قسم کی دنیاوی ترقی کو اس کی عنایت و توجہ سے جانتے ہیں۔ ہر جمعرات کو اس کی نیاز کا حلوہ لوگوں میں بانٹتے اور اسی روز گھر کے حجرے میں چراغ روشن کرتے ہیں۔ اس قسم کے چراغ اور حجرے دہلی تک کے بعض ہندوؤں کے گھروں میں موجود ہیں۔ اس کے مریدوں کے اعتقاد کے مطابق اگر اس کا کوئی معتقد ہندو دانستہ طور پر جھٹکے وغیرہ کا گوشت کھائے تو وہ مصیبت میں گرفتار ہو جاتا ہے اور اگر سور کھائے تو کوڑھی یا پھر اس کے جسم پر موٹا سا دانہ نکل آتا ہے جس کی بدبو سے کیڑے پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ جلد مر جاتا ہے۔

جس طرح نیچ ذات کے مسلمان ہاتھوں میں جھنڈے اٹھائے دور و نزدیک سے آکر شاہ مدار کے مزار پر جمع ہوتے ہیں، اسی طرح ہر شہر کے باہر ہر سال سرور کے جھنڈے نصب کرتے ہیں اور براہی جھنڈے کے نیچے کھڑے ہو کر ڈھول پیٹتے اور اپنے پیر کی مدح کے الفاظ گاتے ہوئے ناچتے ہیں اور دوسروں کو نچاتے ہیں۔ اس تماشے کو دیکھنے کے لئے کیا ہندو کیا مسلمان سب جوق در جوق پہنچتے ہیں۔ کلندار قسم کے لوگ بھی حصولِ نفع کی امید میں اس جگہ حلوہ اور دیگر قسم کی مٹھائیوں وغیرہ کی چھوٹی موٹی دکانیں سفید یا رنگین ٹاٹوں سے بنا لیتے ہیں۔ لبعض تے تو ان کے اوپر چھتر بھی سجا رکھے ہوتے ہیں۔ مختصر یہ کہ تمام رات اسی شور شرابے میں گذر جاتی ہے۔ دوسرے دن صبح کے وقت یہ لوگ نگاہہ کی طرف روانہ ہو جاتے ہیں لیکن تمام اہلِ مجمع نہیں، کیونکہ تمام معتقد اور غیر معتقد تماشائی شہر کو واپس لوٹ جاتے ہیں اور کچھ دکاندار بھی اپنی چیزیں فروخت کر کے ان کے ہمراہ ہو لیتے ہیں مگر براہی اور لبعض طالبانِ مراد (نگاہہ کی طرف) چل پڑتے ہیں۔ اس کے علاوہ کچھ بازاری لوگ بھی حصولِ منفعت کے خیال سے ان کے رفیقِ سفر بن جاتے ہیں۔ نگاہہ میں زائرین کی کثرت کو اسی ایک شہر کی کثرت پر قیاس کر لینا چاہیئے یعنی ایک شہر کی کثرت کے عدد کو براہیوں، دیگر مریدوں اور بازاری آدمیوں سمیت ہزار سے ضرب دینی چاہیئے۔ کوئی بھی بڑا شہر اس جتنا آباد نہیں اور کوئی بھی لشکر اس ہنگامہ و رونق کا لگا نہیں کھاتا۔

ہندوستان میں یہ بات مشہور ہے کہ کمینے اور چھوٹے لوگوں کا مال اگر پیرزہ کھائیں تو ان میں کا ہر شخص شرفاء کو حقارت سے دیکھتا، اس لئے کہ اس جماعت کا ہر فرد سارے سال میں جو کچھ کماتا ہے وہ اس کا مکن پور، نگاہہ اور بھڑائچ (ہندوستان میں ایک قصبہ ہے جہاں مجہول النسب سالار مسعود غازی کا مزار ہے) کی نذر ہو جاتا ہے۔ لبعض چھوٹے لوگوں کو تو دوری مسافت کے سبب وہاں آنے جانے میں پورا سال لگ جاتا ہے۔ البتہ نگاہہ جانے والے سرور پرست ہندو بہل سواروں کی تعداد ہر سال ہزاروں تک جا پہنچتی ہے۔ بہل رتھ کی مانند ایک چیز ہوتی ہے جس میں لکڑی کے دو گول پہیئے ہوتے ہیں۔"

(۱) دربار ملی ص ۵۵۷ تا 558 ڈاکٹر ایس ایم اکبر وغیرہم

سخی سرور کے باب میں الیگزینڈر برنز لکھتے ہیں کہ "سخی سرور کا میلہ بساکھ کے مہینے یعنی مارچ میں لگتا ہے۔ یہ میلہ اسی نام کے پیر کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ یہ میلہ پانچ دن رہتا ہے اور اس میلے میں ہندوستان کے دور دراز کونوں سے لوگ سخی سرور کے آستانے پر حاضری دینے کے لئے آتے ہیں۔ بہت کم لوگ کوہ سلیمان سے مغرب کی طرف سے آتے ہیں۔ زائرین میں برہما کے پجاریوں کی تعداد مسلمانوں سے زیادہ ہوتی ہے اور دونوں کا مجموعہ ایک لاکھ افراد سے کسی طرح سے کم نہیں ہوتا۔"[1]

ایچ. اے. روز کی نامور کتاب " اے گلاسری آف ٹرائبز اینڈ کاسٹس آف دی پنجاب اینڈ این. ڈبلیو. ایف. پی" مطبوعہ ۱۹۱۹ سے طویل اقتباسات درج کئے جاتے ہیں تاکہ قاری اس خانقاہ کے متعلق پوری تفاصیل جان سکے۔

"سب سے اول اور اہم بزرگان دین میں سخی سرور شامل ہے جس کے متعلق کوئی بھی شخص حتمی طور پر نہیں جانتا کہ وہ کب یہاں رہے۔ سر ڈینزل اپبٹسن کے خیال کے مطابق وہ بارھویں صدی عیسوی کے آدمی تھے جبکہ میجر ٹمپل انہیں تیرھویں صدی میں شمار کرتا ہے۔ سکھ دھرم کی ساکھی سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ گورو نانک کے ہمعصر تھے (پندرھویں صدی) اور انہوں نے ایک تربوز گورو نانک کو دیا تھا۔ ان کا سن پیدائش اور وفات خواہ کچھ کیوں نہ ہو وہ مسلمان اولیا میں سے بہاءالدین اور شمس تبریزی کی طرح سے تھے جنہوں نے ملتان کے گرد و نواح میں سکونت اختیار کرکے ریاضت کی۔ سخی سرور جسے لکھ داتا، لعلیں والا اور روہیاں والا بھی کہا جاتا ہے، زین العابدین کے بیٹے تھے اور ان کا اصلی نام سید احمد تھا۔ ان کی زندگی کے متعلق کچھ معلوم نہیں ماسوائے روایات کے۔

کہا جاتا ہے کہ حضرت زین العابدین کے دو بیٹے تھے جن میں سے ایک سیدی احمد تھا جو لبعد میں سخی سرور کے نام سے مشہور ہوا جبکہ دوسرے کا نام خان دودا تھا جو بغداد میں فوت ہوا اور کسی خاص شہرت کا مالک نہیں۔ شہر ڈیرہ غازی خان اور قصبہ سخی سرور کے درمیان وڈور نامی گاؤں میں اس کی زیارت گاہ ہے۔ سیدی احمد نے تعلیم لاہور میں حاصل کی جہاں سے وہ دھونکل چلا گیا جو ضلع گوجرانوالہ میں وزیرآباد کے قریب ہے۔ انہوں نے دھونکل میں ایک بڑھیا کے پاس ایک گھوڑی دیکھی اور اس سے یہ مانگی۔ بڑھیا نے انکار کیا کہ اس کے پاس کوئی گھوڑی ہے جس پر سیدی احمد نے گھوڑی کو بلایا اور گھوڑی نے چھلانگ لگا کر کوہ سلیمان کو پار کیا۔ (حالانکہ قصبہ سخی سرور کوہ سلیمان کے مشرق میں واقع ہے اور اسے کوہ سلیمان پار کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ مولف)۔ پھر انہوں نے بڑھیا کو حکم دیا کہ وہ ایک کنواں احداث کرائے۔ اس نے تعمیل کی اور اب اس کی اولاد اس کنوئیں کی متولی ہے جہاں ہر سال ماہ جون میں سخی سرور کے اعزاز میں میلہ لگتا ہے۔ (دھونکل میں مقامی روایت یہ ہے کہ کنواں آپ کی کرامت سے ہوا جب انہوں نے چھڑی زمین پر ماری کیونکہ وہ اس وقت پیاسے تھے) اس کے پانی کے

1- Cabool P. 276 Alexander Burnes.

متعلق کہا جاتا ہے کہ کوڑھ کے مرض میں مبتلا ہے جس کی بنا پر اس گاؤں میں کوڑھی بہت آتے ہیں۔ وہاں سے جو آمدنی ہوتی ہے وہ اکیس کنزیں برابر تقسیم کرتے ہیں۔ جب کوئی کنزاں فروخت کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ آمدنی کا حصہ بھی جاتا ہے۔ سیدی احمد اپنے باپ کے حکم پر کوہ سلیمان کے دامن میں نگاہہ نامی گاؤں میں آباد ہو گئے (دوسری روایت میں وہ رشتہ داروں کے خوف سے یہاں آئے۔ مؤلف)۔ اس صحرا میں آباد ہونے کے بعد انہوں نے دوسری کرامت دکھائی۔ خراسان سے دہلی جانے والے قافلے کے ایک اونٹ کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ قافلے کے سردار نے سیدی احمد سے التجا کی اور انہوں نے اُسے وہاں جانے کا حکم دیا جہاں وہ اونٹ کو چھوڑ کر آیا تھا۔ سوداگر جب حسب حکم وہاں پہنچا تو اُسے اپنا اونٹ صحیح و سالم حالت میں ملا۔ سوداگر جب دہلی پہنچا تو اس نے اس کرامت کی تشہیر کی اور بات شہنشاہ تک جا پہنچی۔ شہنشاہ اس معجزے کی حقیقت جاننا چاہتا تھا لہٰذا اُس نے اونٹ منگوا کر ذبح کرایا جس سے معلوم ہوا کہ ہڈی کو کیلوں کے ذریعہ جوڑا گیا ہے۔ (گویا یہ علاج بذریعہ اپریشن ہوا، کوئی کرامت نہ ہوئی۔ مؤلف)۔ جب شہنشاہ اس معجزے کا قائل ہو گیا تو چار خچروں پر خزانہ بار کر کے سیدی احمد کو مکان بنانے کے لئے روانہ کئے۔ سخی سرور کا روضہ اسی رقم سے تعمیر ہوا۔ ملتان کے ایک شخص جس کا نام گنو تھا اپنی بیٹی کا نکاح آپ سے کر دیا اور تمام جائیداد بھی دے دی کیونکہ اُسے دو بیٹے معجزانہ طور پر عطا ہوئے تھے۔ گنو کی تمام دولت انہوں نے غربا میں بانٹ دی اور اسی سبب سے سخی سرور مشہور ہوئے۔ اسی دور میں سخی سرور بغداد گئے اور واپسی پر اُن کے تین مرید بھی ساتھ تھے جن کی قبریں سخی سرور کے قریب ایک چھوٹی سی پہاڑی پر مشاہدہ کرائی جاتی ہیں۔ (حالانکہ دوسری روایت میں وہ شادی سے قبل دس سال کی عمر میں بغداد گئے۔ ان کے ساتھ تین کا ذکر نہیں بلکہ اُن کی قبر پر لعین کئے۔ مؤلف)

ایک مقامی روایت کے مطابق روضہ دہلی کے بادشاہ نے تیار کرایا تھا جبکہ سیڑھیاں دیوان لکھپت رائے اور جسپت رائے ساکن لاہور نے تیار کرائی تھیں۔ مسٹر ٹمپل اول الذکر کی نشاندہی کرتے ہوئے اُسے (وہ) شخص قرار دیتے ہیں جس کو مشہور سکھ لیڈر جسا سنگھ اہلوالیہ (کلال) نے 1743ء میں قتل کر دیا تھا (حوالے کے لئے دیکھئے کلکتہ ریویو جلد نمبر 111×7، سنہ 1881ء، ص 254)۔

ایک اور روایت میجر ٹمپل سے لاہور کے ایک منشی نے بیان کی جو حسب ذیل ہے:-

"سید احمد کے والد سید زین العابدین بغداد سے 520ھ میں ہجرت کر کے ہندوستان آئے اور شاہ کوٹ ضلع جھنگ میں سکونت اختیار کی جہاں انہوں نے ایک زمیندار پیرا کھوکھر نامی کی بیٹی عائشہ سے نکاح کیا۔ عائشہ کے بطن سے ایک بیٹا احمد پیدا ہوا جو بعد میں عظیم ولی سخی سرور ہوا۔ سید احمد اپنی جوانی میں اپنے رشتہ داروں کے ہاتھوں بہت ستائے گئے اور اپنے والد کی وفات پر 535ھ بمطابق 1149ء ملک چھوڑ کر بغداد چلے گئے اور وہاں غوث اعظم شیخ شہاب الدین سہروردی اور خواجہ مودود چشتی سے خرقہ خلافت حاصل کیا (غوث اعظم درحقیقت عبدالقادر گیلانی تھا نہ کہ شیخ شہاب الدین۔

شیخ شہاب الدین 145ء سے 1234ء تک زندہ رہے جبکہ خواجہ مودود چشتی نے ۱۱۳۳ء میں وفات پائی۔ گویا ترتیب واقعات صحیح نہیں ہے)۔ کچھ عرصہ بغداد میں گذارنے کے بعد سخی سرور اپنے وطن واپس آ گئے اور کچھ عرصہ تک دھونکل ضلع گوجرانوالہ میں مقیم رہے۔ پھر ملتان گئے جہاں گورنر نے اپنی بیٹی اُن سے بیاہ دی (حالانکہ پہلی روایت میں وہ صرف ایک زمیندار تھا۔ مولف) اس کے علاوہ انہوں نے دوسری عورت سے بھی نکاح کیا اور اس سے سید عبدالرزاق پیدا ہوئے۔ اس کے بعد وہ لاہور گئے جہاں انہوں نے سید اسحاق کی رہنمائی میں علوم باطنی میں دسترس حاصل کی (یہ بھی تاریخی طور پر غلط ہے کیونکہ سید اسحاق اُچ ریاست بہاولپور میں پیدا ہوئے اور اپنے چچا صدرالدین راجو قتال سے بمقام سہارنپور تربیت حاصل کی جہاں انہوں نے ۱۴۶۵ء میں وفات پائی)۔ آخر کار شاہ کوٹ واپس آ کر مقیم ہو گئے جہاں وہ اپنی کرامات کی بدولت مشہور ہوئے اور بڑی تعداد میں لوگ مرید ہوئے۔ مریدوں کی کثرت سے اُن کے رشتہ داروں کو حسد پیدا ہوا اور انہوں نے اُس کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ جب انہیں اپنے رشتہ داروں کے ارادوں کا علم ہوا تو وہاں سے فرار ہو کر ڈیرہ غازی خان کے مقام نگاہہ کے صحرا میں آباد ہو گئے (پہلی روایت میں باپ کے حکم سے آباد ہوئے تھے۔ مولف)۔ وہاں اُن کے ہمراہ ان کا بھائی عبدالغنی، اس کی بیوی بائی اور بیٹا سید سراج الدین تھے۔ اُن کے رشتہ داروں نے تاہم ان کا پیچھا بہت بڑی جمعیت کے ساتھ کیا اور انہیں ہمراہیوں سمیت ۵۷۰ھ مطابق ۱۱۷۴ء قتل کر دیا۔ انہیں وہیں دفن کر دیا گیا اور ان کی قبر اب بھی موجود ہے"۔ (یہاں میجر ٹیمپل نے خواجہ شہاب الدین کے متعلق غلط سن دیئے ہیں۔ صحیح سن ۱۱۴۵ء اور ۱۲۳۴ء ہے۔ مؤلف)۔

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا اس روایت پر غور کرنا لازم ہے۔ اس روایت کی رو سے سید احمد نے ۱۱۴۹ء میں بغداد کی طرف ہجرت کی اور شیخ شہاب الدین سے خرقہ خلافت حاصل کیا۔ یہ صریحاً بے بنیاد بات ہے کیونکہ جب سید احمد بغداد کے لئے روانہ ہوئے تو شیخ شہاب الدین کی ابھی پیدائش بھی نہیں ہوئی تھی لہٰذا شیخ شہاب الدین سے خرقہ خلافت حاصل کرنے والی روایت قطعاً غلط ہے۔ اسی طرح سے خواجہ مودود چشتی نے سید احمد کی بغداد کی طرف روانگی کی تاریخ سے دو سال کے اندر اندر وفات پائی۔ اس وقت تک سید احمد نے علوم باطنی میں بھی دسترس حاصل نہیں کی تھی بلکہ بعد میں سید اسحاق سے تربیت حاصل کی۔ لہٰذا خواجہ مودود چشتی اور سید احمد کا آپس میں اس قدر گہرا تعلق نہیں ہو سکتا۔ اگر سید اسحاق سے تربیت حاصل کرنے کے معاملہ کو لیا جائے تو یہ بھی قطعاً غلط ثابت ہوتا ہے کیونکہ سید احمد نے ۱۱۷۴ء میں وفات پائی جبکہ سید اسحاق نے ۱۴۶۵ء میں وفات پائی گویا سید اسحاق سخی سرور کی وفات کے کئی سو سال بعد پیدا ہوئے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ چند بڑے بڑے ناموں کا سہارا لے کر یہ روایت گھڑی گئی ہے جس میں حقیقت کا شائبہ تک نہیں اور اس طرح سے ایک افسانہ تیار کر لیا گیا۔

…مرہے جبکہ خواجہ مودود چشتی نے ۵۲۷ھ میں وفات پائی ۔ گویا ترتیب واقعات …کے بعد سخی سرور اپنے وطن واپس آ گئے اور کچھ عرصہ تک دھونکل ضلع گوجرانوالہ میں …پنی بیٹی اُن سے بیاہ دی (حالانکہ پہلی روایت میں وہ صرف ایک زمیندار تھا۔ …ورت سے بھی نکاح کیا اور اُس سے سید عبدالرزاق پیدا ہوئے ۔ اس کے بعد …رہنمائی میں علوم باطنی میں دسترس حاصل کی (یہ بھی تاریخی طور پر غلط ہے کیونکہ سید …ے اور اپنے چچا صدرالدین راجو قتال سے بمقام سہارنپور تربیت حاصل کی …کار شاہ کوٹ واپس آکر مقیم ہو گئے جہاں وہ اپنی کرامات کی بدولت مشہور …مریدوں کی کثرت سے اُن کے رشتہ داروں کو حسد پیدا ہوا اور انہوں نے اُس …داروں کے ارادوں کا علم ہوا تو وہاں سے فرار ہو کر ڈیرہ غازی خان کے …وایت میں باپ کے حکم سے آباد ہوئے تھے ۔ مولف)۔ وہاں اُن کے ہمراہ ان کا …سراج الدین تھے ۔ اُن کے رشتہ داروں نے تاہم ان کا پیچھا بہت بڑی جمعیت کے …ابق ۱۱۷۴ء قتل کر دیا ۔ انہیں وہیں دفن کر دیا گیا اور ان کی قبر اب بھی موجود …ن کے متعلق غلط سن دیئے ہیں ۔ صحیح سن ۱۱۵۲ء تا ۱۱۸۹ء ہے ۔ مولف)۔ …پر غور کرنا لازم ہے ۔ اس روایت کی رو سے سید احمد نے ۱۱۶۹ء میں بغداد کی …خلافت حاصل کیا ۔ یہ صریحاً بے بنیاد بات ہے کیونکہ جب سید احمد بغداد کے …یدائش بھی نہیں ہوئی تھی لہٰذا شیخ شہاب الدین سے خرقۂ خلافت حاصل کرنے …مودود چشتی نے سید احمد کی بغداد کی طرف روانگی کی تاریخ سے دو سال کے اندر …علوم باطنی میں بھی دسترس حاصل نہیں کی تھی بلکہ بعد میں سید اسحاق سے تربیت …ین اس قدر گہرا تعلق نہیں ہو سکتا ۔ اگر سید اسحاق سے تربیت حاصل کرنے …ہے کیونکہ سید احمد نے ۱۱۷۴ء میں وفات پائی جبکہ سید اسحاق نے ۱۴۶۰ء …کے کئی سو سال بعد پیدا ہوئے ۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ چند بڑے بڑے …ہں حقیقت کا شائبہ تک نہیں اور اس طرح سے ایک افسانہ تیار کر لیا گیا۔

حضرت سخی سرور کے متعلق روایات کا اب ذرا تفصیل سے جائزہ لیں ۔ اُن کا من بزرگان دین اور اولیاء کرام کے متعلق روابط بتائے جاتے ہیں اُن کی زندگی کے دور حسب ذیل ہیں : —

اسم گرامی بزرگ	تاریخ ولادت	تاریخ وفات
حضرت سخی سرور	۵۳۵ھ بمطابق ۱۱۴۰ء ہجرت بغداد ۵۴۵ھ	۵۷۷ھ بمطابق ۱۱۸۱ء
شیخ شہاب الدین سہروردی	۱۱۵۲ء	۶۳۲ھ " ۱۱۸۹ء
شیخ عبدالقادر گیلانی	۴۷۰ھ مطابق ۱۰۷۸ء	۵۶۱ھ " ۱۱۶۴ء
شیخ بہاء الدین زکریا	۵۷۸ھ " ۱۱۸۲ء	۶۶۵ھ " ۱۲۶۹ء
بابا گورو نانک	۱۴۶۹ء	۱۵۳۹ء
شیخ مودود چشتی	۴۳۰ھ " ۱۰۳۸ء	۵۲۷ھ " ۱۱۳۲ء
سید محمد اسحاق لاہوری	—	— ۱۴۶۰ء

اس سے عیاں ہوتا ہے کہ جب سید احمد بغداد کے لئے روانہ ہوئے تو شیخ شہاب الدین کی پیدائش بھی نہ ہوئی تھی ۔ شیخ بہاء الدین زکریا کی ولادت سید احمد (سخی سرور) کی وفات کے بعد ہوئی ۔ بابا گورو نانک تو ان کی وفات کے دو سو ستاسی برس بعد پیدا ہوئے ۔ شیخ مودود چشتی کی وفات کے وقت سید احمد (سخی سرور) پیدا ہی نہیں ہوئے تھے ۔ سید احمد (سخی سرور) جب بغداد کو روانہ ہوئے تو ان کی عمر اس وقت نو یا دس برس ہو سکتی ہے اور انہوں نے ابھی تک سید اسحاق سے مفروضہ طور پر علوم باطنی کی تعلیم بھی حاصل نہ کی تھی تو اس عمر اور حالت میں خرقۂ خلافت حضرت شیخ عبدالقادر گیلانی سے حاصل کرنا ناممکن سی بات ہے ۔ سید محمد اسحاق لاہوری تو بلکہ سید احمد کی وفات کے کئی سو سال بعد پیدا ہوئے لہٰذا وہ سخی سرور کے استاد ہرگز نہیں ہو سکتے ۔ دراصل سخی سرور کی شخصیت کے متعلق حقائق معلوم نہیں ۔ چند نامور ہستیوں کے نام لے کر ایک تانا بانا سا بُن لیا گیا اور بھگتی تحریک کے دوران ہندو مسلم اتحاد کی غرض سے ایک مرکز قائم کرنے کی خاطر ایک استھان سا بنا لیا گیا جو تینوں مذاہب کا ملغوبہ تھا ۔ اس استھان کے جنوبی سمت والے کمرے (ڈھوڈارانا) کی دیواروں پر ہندو دیومالا تصویروں کی صورت میں نقش تھی جس پر قیامِ پاکستان کے بعد مجاوروں نے چونا پھیر دیا ہے ۔ روایات کا جو ڈھانچہ تیار کیا گیا ہے وہ اکثر و بیشتر تاریخ کی کسوٹی پر غلط ثابت ہوتا ہے ۔ ملک غوث صاحب متولی خانقاہ سخی سرور لکھتے ہیں کہ سید عبداللطیف بن شجاع بن امام تقی بن امام موسیٰ رضا بن امام موسیٰ کاظم نے ایک صحابی کی بیٹی سے شادی کی جس سے عمر شاہ پیدا ہوا ۔

عمر شاہ نے بھی ایک صحابی کی لڑکی سے شادی کی جس سے سید زین العابدین پیدا ہوا جو سخی سرور کے والد تھے۔ سید زین العابدین نے ۱۱۶۹ء میں وفات پائی۔[1] ملک عزت نے غلو اور افسانہ تراشی کی انتہا کر دی۔ کیا کوئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صحابی اور ان کی جوان بیٹی تین چار سو برس تک زندہ رہے کہ عمر شاہ ان کے ہاں شادی کر سکیں۔ حقیقت یہ ہے آپؐ کے تمام صحابہ میں آخری صحابی حضرت ابوالطفیل تھے جنہوں نے ۱۰۰ ہجری (۷۱۸ء) میں مکہ معظمہ میں انتقال فرمایا۔ عمر شاہ کے وقت تو تابعین اور تبع تابعین (جنہوں نے صحابیوں کو دیکھنے والوں کو دیکھا تھا) کا زمانہ بھی گزر چکا تھا۔[2] اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان روایات کو نہایت بھونڈے پن سے گھڑا گیا ہے جن کا مقصد کسی بزرگ کو مافوق الفطرت قوتوں کا مالک ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ قرآن حکیم کے الفاظ میں "یہ لوگ اللہ کو چھوڑ کر اُن کی عبادت کر رہے ہیں جن کے لئے نہ تو اس نے کوئی سند نازل کی اور نہ یہ خود اُن کے بارے میں کوئی علم رکھتے ہیں۔ ان ظالموں کے لئے کوئی مددگار نہیں ہے" (الحج ۷۱:۲۲)

بعض کتب میں لکھا ہے کہ اورنگ زیب عالمگیر نے خانقاہ کی تعمیر کے لئے رقم فراہم کی تھی جو ناممکن سی بات ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر شریعت کا پابند تھا جس میں پکی قبریں بنانا، قبہ بنانے اور اُن میں چراغ روشن کرنے والوں پر رسول اللہؐ نے لعنت فرمائی ہے۔ حدیث شریف میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کی زیارت کرنے والی عورتوں پر لعنت فرمائی اور قبروں پر مسجدیں بنانے والوں پر لعنت کی اور قبروں پر چراغ جلانے والوں پر لعنت کی"۔ اگرچہ مردوں کو قبروں کی زیارت کی اجازت ہے تاکہ قبریں موت کی یاد دلاتی رہیں۔ اسی سبب سے اورنگ زیب عالمگیر کی قبر اب تک کچی ہے۔ اورنگزیب عالمگیر کے متعلق لین پول لکھتا ہے کہ "وہ بے پناہ اخلاقی جرأت کا مالک تھا۔ اس کی اخلاقی جرأت ایسی تھی کہ وہ کسی چیز کی پرواہ کئے بغیر اپنے عقائد پر عمل پیرا ہوتا تھا اور اس نے کبھی بھی اپنے ضمیر کے خلاف عمل نہ کیا اور نہ کبھی اپنے عقائد سے غداری کی۔ اب ایسا حکمران جس نے "فتاویٰ عالمگیری" جیسی کتاب تیار کرائی ہو، وہ مندرجہ ذیل حدیثوں سے بے خبر نہیں ہو سکتا۔

۱۔ خبردار رہو! تم سے پہلے لوگوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا تھا۔ میں تمہیں اس حرکت سے منع کرتا ہوں۔ (مسلم)

۲۔ اللہ تعالیٰ نے لعنت فرمائی یہود و نصاریٰ پر انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔ (احمد، بخاری، مسلم، نسائی)

۳۔ ان لوگوں کا حال یہ تھا کہ اگر ان میں کوئی مرد صالح ہوتا تو اس کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر مسجدیں بناتے اور اسکی تصویریں تیار کرتے تھے۔ یہ قیامت کے دن بدترین مخلوقات ہونگے۔ (احمد، بخاری، مسلم، نسائی)

سخی سرور کے متعلق اکثر و بیشتر روایات غلط اور بے سروپا مشہور کر دی گئی ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے نوکروں، بانواروں

۱۔ تذکرہ حضرت سخی سرور صہ 98 حامد خان حامد

۲۔ سبیل الرسول صہ 277 محمد صادق سیالکوٹی

کے نام بھی مختلف روایات میں مختلف ہیں۔ کہیں وہ کھوکھر، کاہن اور شیخ ہیں تو بعض میں جرت، گوپڑا، لنگاہی اور احمد وغیرہ ہیں۔ اسی طرح بعض کے مطابق وہ مریض تھے اور بعض کے مطابق نوکر۔ "تحقیقات چشتی" میں مولوی نور احمد لکھتے ہیں کہ کھوکھر قبیلے نے سوا لاکھ آدمیوں کا لشکر[1] تیار کیا اور حضرت سید احمد کو قتل کرنے چلے۔ حضرت سخی سرور کے پاس کوئی فوج نہ تھی جن کے مقابلے کے لئے سوا لاکھ آدمیوں کی فوج درکار تھی۔ وہ گوشہ نشین بزرگ تھے (اگر اُن کو کوئی حقیقی الشان مان لیا جائے) جن کے ہمراہ چند مرید یا خادم تھے۔ اگر یہ سوا لاکھ آدمیوں کی فوج دھونکل ضلع گوجرانوالہ سے چل کر لگا ہرا (موجودہ سخی سرور) آتی تو ضرور حکومتِ وقت کی فوج سے اس کا مقابلہ و مقاتلہ ہوتا مگر حیرت کی بات ہے کہ کسی کتاب تاریخ میں اس عظیم الشان لشکر کا ذکر نہیں ملتا۔ اُس وقت (۱۱۹۱ء) علاقہ ملتان محمد غوری کے قبضہ میں تھا اور اُس جیسا بیدار مغز حاکم اتنے بڑے لشکر کے اپنے ملک میں آزادانہ پھرنے کا روادار نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر کھوکھر سوا لاکھ افراد کا لشکر جمع کر سکتے تھے تو اُن کی کوئی مملکت ضرور ہو گی جہاں سے انہوں نے اتنے بڑے لشکر کو تیار کیا مگر عجیب بات ہے کہ کھوکھروں کی ایسی کسی سلطنت کا برصغیر کے کسی خطہ میں کسی مورخ نے ذکر نہیں کیا۔ تاریخ میں کھوکھر لیڈروں مثلاً دسرتھ کھوکھر وغیرہ کا ذکر ملتا ہے جو کسی بھی شاہی لشکر کو دیکھ کر رفو چکر ہو جاتے تھے۔ ویسے یہ تاریخی حقیقت ہے کہ برصغیر کا کوئی بھی مسلمان فرمانروا اتنی بڑی فوج میدانِ جنگ میں کبھی نہیں لا سکا۔ احمد شاہ ابدالی اور اس کے اتحادی (میر نصیر خان بلوچ، شجاع الدولہ وغیرہ) بمشکل ستر ہزار مجاہدین پانی پت کی تیسری جنگ میں لا سکے۔ اسی طرح سے محمود غزنوی بھی اس سے بڑے لشکر کبھی فراہم نہ کر سکا۔ دکن کے تمام مسلمان فرمانروا (بیجا پور، گولکنڈہ وغیرہ) مجموعی طور پر ستر ہزار فوج وجے نگر کے راجہ رام راج کے مقابلے میں تلی کوٹہ کے میدانِ جنگ میں نہ لا سکے

ملک عزت صاحب کی طرح ایک بے سروپا روایت حامد خان نے بھی سخی سرورؒ کے بیان میں لکھی ہے۔ انہوں نے حضرت شیخ شہاب الدین کی عظمت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کی خاطر لکھا ہے کہ وہاں نہ صرف سخی سرور بلکہ "اُس زمانے میں شیخ الشیوخ (شہاب الدین سہروردی) کی ذات دنیا بھر کے علما اور مشائخ کا ملجا و ماویٰ تھی۔ شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی، شیخ نجیب الدین برغش، شیخ نور الدین غزنوی، شیخ ضیاء الدین رومی، شیخ محمد یمنی، سید جلال تبریزی جیسے نامور اولیاء آٹھوں پہر زانوئے ادب تہ کئے حاضر رہتے تھے"[2]۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ شیخ سعدی شیخ شہاب الدین سہروردی کا ہمعصر ہی نہ تھا۔ بلبن کے عہدِ حکومت (1266ء تا 1286ء) میں اُس کا بیٹا شہزادہ محمد ملتان کا حاکم تھا جو 1285ء میں منگولوں کے ایک اچانک حملے میں شہید ہوا۔ شہزادہ محمد نے دوبار شیخ سعدی کو ملتان آنے کی دعوت دی

۱۔ تحقیقات چشتی صہ 12-211 مولوی نور محمد

۲۔ تذکرہ حضرت سخی سرور صہ 87 حامد خان حامد

مگر انہوں نے اپنے بڑھاپے کی وجہ سے اسے قبول نہ کیا۔ گویا شیخ سعدی 1285ء سے قبل بڑھاپے کی منزل میں تھے اور شیخ شہاب الدین نے 1189ء میں وفات پائی۔ شیخ سعدی کی ولادت 1184ء میں ہوئی۔ گویا شیخ شہاب الدین سہروردی کے انتقال کے وقت شیخ سعدیؒ کی عمر صرف پانچ برس تھی۔ حضرت سخی سرور کی مفروضہ وفات (1181ء) کے چار سال بعد شیخ سعدی کی پیدائش ہوئی۔ پھر یہ امر بھی قابلِ غور ہے کہ شیخ شہاب الدین سہروردی کی ہستی راسخ العقیدہ مسلمانوں کے لیے قابلِ تقلید نہ تھی جس کے پاس اس قدر عظیم شیوخ جمع ہوتے اور ہدایات دینی حاصل کرتے۔ اُن کے عقائد قرآن اور سنت سے مختلف تھے اور وہ عوام الناس کے لئے ایک فتنے کا باعث بن گئے تھے لہٰذا سلطان صلاح الدین ایوبیؒ جیسے صحیح العقیدہ اور متقی و مجاہد سلطان نے اُسے سزائے موت دی اور اس فتنے کا ہمیشہ کے لئے سدِ باب کر دیا۔ اسی بنا پر شیخ شہاب الدین کو قتیل بھی کہا جاتا ہے، وہ فلسفے کو قرآن پر ترجیح دیتا تھا۔

حامد خان کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ شیخ سعدیؒ اور حضرت سخی سرور نہ صرف ہمعصر تھے بلکہ اکٹھے ہی شہاب الدین کے پاس حاضرِ خدمت ہوتے تھے۔ یہ کہانی سرے سے ہی غلط ہے۔ نہ تو شیخ شہاب الدین مسلمانوں میں کوئی اعلیٰ مرتبہ رکھتے تھے اور نہ ہی شیخ سعدی اور سید احمد آپس میں اور شیخ شہاب الدین کے ہمعصر تھے۔ یہ صرف کسی کی شہرت کو بامِ عروج تک پہنچانے کے لئے بھونڈے غلو سے کام لیا گیا۔ اسی طرح جلال الدین تبریزی کی حاضری بھی عظیم جھوٹ ہے۔

قارئین کی سہولت کے لئے معتبر کتب تاریخ سے مذکورہ بزرگانِ دین کی تاریخ پیدائش وغیرہ معتبر حوالہ کے ذریعہ تقابل کے لئے درج کی جاتی ہے۔

نام	ولادت	وفات	حوالہ نمبر
شیخ عبدالقادر گیلانی	1078ء	1164ء	1
شیخ شہاب الدین سہروردی	1152ء	1189ء	2
سید سخی سرور	1140ء	1181ء	3
شیخ سعدی	1184	1292ء	4

سخی سرور کے روضے

جو روایات اس سے قبل بیان کی جا چکی ہیں، اُن کو اس بزرگ کی افسانوی زندگی کا مختصر سا خاکہ تصور کیا جائے جس کے اردگرد بے شمار روایات کا جال سا بن دیا

---

1. قاموس المشاہیر جلد دوم صہ 66 نظامی بدایونی مطبوعہ 1926ء
2. " " " 270 " " "
3. دائرہ معارف اسلامیہ جلد ۱۰ صہ 762 مطبوعہ زیرِ اہتمام دانش گاہ پنجاب لاہور۔
4. " " " ۱۱ صہ 2-41 " " " " "

اگر کوئی یہ جاننا چاہتا ہو کہ سخی سرور نے کس طرح دانی جٹی کے لئے مردہ بچے کو زندہ کیا (نعوذ باللہ ! خدا تو مارتا ہے مگر حضرت سخی سرور مردے کو زندہ کر دیتے ہیں. گویا وہ خدا سے بھی زیادہ قوت والے ہیں ۔ اسی عقیدے کی بنا پر جاہل لوگ شرک کر کے کہتے ہیں ؎

پیراں دیا پیرا کر دے دور مجبوریاں
لایاں توں بنے جھیڑیاں رب نے رد ہڑیاں

انہوں نے بھیراؤں کو کس طرح سے اپنا پیغامبر بنایا یا عیسی بنیا نے اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں مندر تعمیر کیا وغیرہ وغیرہ تو انہیں میجر ٹیمپل کی دلچسپ کتاب " لیجنڈز آف دی پنجاب " یعنی روایات پنجاب کا مطالعہ کرنا چاہیے اس خانقاہ کے متعلق ایچ اے روز لکھتے ہیں :

اس بزرگ نے نگاہہ کو اپنا مستقر بنایا جو ضلع ڈیرہ غازی خان میں کوہ سلیمان کے دامن میں واقع ہے اور اُن لوگوں کے لئے اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ہو سکتی جو ذاتی آرام و سکون سے لا تعلق ہوں. موجودہ خانقاہ ایک پہاڑی نالے کے بلند دائیں کنارے پر تعمیر کی گئی ہے ۔ لاہور کے دو سوداگروں کی تعمیر کردہ سیڑھیاں نالے کی تہ سے اوپر چلی گئی ہیں ۔ اس خانقاہ کی عمارتوں میں مغربی طرف سخی سرور کا مقبرہ ہے اور شمال مغربی طرف بابا نانک کا آستانہ ہے ۔ مشرقی جانب ایک حجرہ ہے جس میں مائی عائشہ والدہ سخی سرور کی چوکی اور چرخا رکھا ہوا ہے ۔ اس کے قریب ہی ٹھاکر دوارہ (بت خانہ) کیونکہ ہندو اپنے دیوتاؤں کے بت کو ٹھاکر کہتے ہیں) ہے جس کے ملحقہ کمرے میں بھیراؤں کا بت ہے جسے اس بزرگ کا پیغامبر مانا جاتا ہے ۔ (اب خانقاہ کی ترتیب بالکل الٹ دی گئی ہے سخی سرور کا مقبرہ اب مشرق میں ہے. مولف ،

یہاں پر یہ واضح طور پر معلوم ہے کہ بھیراؤں کی پوجا اور اس فرقہ میں کو خاص تعلق ہے جو گرد باد کے عفریت بھائی پھیرو (جس کی بیوی کا نام دیلوی ہے) کو بھی سخی سرور کا مرید قرار دیا جاتا ہے ۔ یہ گرد باد پنجاب میں کثرت سے پیدا ہوتے ہیں ۔ یہ خانقاہ ایک گھاٹی میں ہے جس کے دروازے پر ایک پہاڑی تقریباً ۸۰ فٹ بلند موجود ہے ۔ اس کو ڈاکو کی پھلانگ " (ٹپ) کہا جاتا ہے (یہ وہی جگہ ہے جس کو مجاور لوگ پُل صراط بتلاتے ہیں ۔ جاہل عوام اس نام بنا " پل " کو بہشت کے حصول کی خاطر پار کرتے ہیں اور کئی اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں. مولف) کیونکہ جب ایک چور کا پیچھا کیا گیا تو اس نے چھلانگ لگائی اور منت مانی کہ اگر وہ سلامت رہا تو وہ ایک سیاہ رنگ کی جوان گائے ولی کے نام پر قربان کرے گا. وہ بغیر گزند زندہ رہا (یہاں ہمیں بھیرا ملمپ کی یاد آتی ہے جو کیدار ناتھ کاؤں کی پہاڑی سے جہاں لوگ شو دیوتا کے نام پر اپنے کو سر کے بل گراتے ہیں ۔ اسی طرح سے یہیو نیا کی رسم ستلج کے کنارے ادا کی جاتی ہے جس میں نیچ اقوام مثلاً بھیڈا کے لوگوں کو رسوں کے ذریعہ مہادیو کی پوجا کے طور پر پہاڑی سے لٹکایا جاتا ہے) بیرونی مکانوں کے مغرب میں مگر خانقاہ کی حدود کے اندر دو سوکھے ہوئے درخت موجود ہیں. یہ جال (پیلو) اور جنڈ کے درخت

ہیں جن کے متعلق روایات ہیں کہ یہ اُن گھوڑوں سے برت لکلے تھے جو اُن کی گھڑالی گی کی اگاڑی اور پچھاڑی کے رسوں کے لئے گاڑے گئے تھے ۔ خانقاہ کی پچھلی طرف اُن کے بیٹے راڈین اور بھائی ڈمرڈا کے گھر ہیں ۔ خانقاہ کے مغرب میں قریب ہی لر اور اسحاق کے مقبرے ہیں جو اُن کے ساتھی تھے ۔ اسی طرح مشرق طرف بھی اُس کے دو ساتھی علی اور عثمان کی قبریں ہیں ۔ یہ خانقاہ ہندو اور مسلمان طرز تعمیر کا عجیب و غریب مرکب ہے ۔ 1863ء میں یہ عمارت آگ سے تباہ ہوگئی اور اسی میں نادر شاہ کے عطا کردہ کلس اور کچھ قیمتی جواہرات بھی ضائع ہوگئے ۔ یہ جواہرات شاہ زمان نے دیئے تھے ۔ روضہ دوبارہ تعمیر کر لیا گیا ہے ۔

ڈیرہ غازی خان گزیٹر کے مطابق[1] سخی سرور کے موجودہ مجاور گنوکے تین نوکروں کی اولاد ہیں ۔ جنہوں نے اپنے کو سخی سرور سے وابستہ کر لیا تھا ۔ اُن کے نام کھنگ ، کاہن اور شیخ تھے ۔ سخی سرور نے اُن تینوں کی اولاد کو 1650 پر محدود کر دیا تھا ۔ ایک اور روایت کی رو سے سخی سرور کی وفات کے بعد تین آدمی اُس کی قبر پہ آئے ۔ گویا جو کوڑھی تھا لنگڑا جو اندھا تھا اور احمد خان جو نامرد تھا اپنی امراض سے شفایاب ہوگئے ۔ ان کی اولاد اب موجودہ مجاور ہیں اور کہا جاتا ہے کہ ایک معجزہ کی بدولت اُن کی تعداد 1650 سے تجاوز نہیں کرتی مگر یہ غلط ہے (یہ صرف آمدنی کی تقسیم کا ایک کلیہ ہے) اس تعداد پر پوری طرح سے عمل کیا جا رہا ہے ۔ یہ تقسیم اس طرح سے کی جاتی ہے :

اولاد کھنگ	750	حصے
اولاد کاہن	600	حصے
اولاد شیخ	300	حصے
کل حصص	1650	

خانقاہ پر جس قدر نذرانے وصول ہوتے ہیں اُن کو 1650 حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے ۔ اس تعداد میں عورتیں اور بچے بھی شامل ہوتے ہیں ۔ تمام مجاور مساوی شمار کئے جاتے ہیں ۔ ایک بچے کو بھی وہی حصہ ملتا ہے جو کسی بڑے کو ۔ مجاور سالانہ میلے کے بعد جو اپریل میں ہوتا ہے تمام اطراف پنجاب میں پھیل جاتے ہیں اور زیارت کرنے والوں سے رابطہ قائم کرتے ہیں ۔ صرف سالانہ میلے کے موقع پر خزانے کو کھولا جاتا ہے اور جملہ آمدنی کو تقسیم کیا جاتا ہے ۔ سارا سال زائرین کا جمگھٹا لگا رہتا ہے ۔ انہیں خانقاہ کی طرف سے کچھ نہیں ملتا ماسوائے خانقاہ کی مہر لگا کر کسی مرید کو رقعہ جس کی تعمیل یا عدم تعمیل کا انحصار اس کی عقیدت پر منحصر ہے ..... "

1- A Glossary of tribes and castes of Punjab and NWFP Vol. I Ed. 1919 H.A Rose.

سروریہ برہمن مسلمان کی حیثیت سے سرور اسلامی نام ہے تاہم بعض اوقات غیر اسلامی ناموں کو مشرف باسلام کر لیا گیا ہے۔ کشمیر میں غیر مسلموں کے دیوتاؤں اور آستانوں کو پیر کا نام دے کر اسلامی کر لیا گیا ہے مثلاً پیر پنجال وغیرہ مگر مغربی پنجاب میں سخی کے لفظ کا اضافہ کیا جاتا ہے جس سے صاحب روضہ کے مرتبہ کو بلند ظاہر کرنا مقصود ہوتا ہے۔ مثلاً سخی سحاب، سخی مہری، سخی سرور، سخی لعل شہباز وغیرہ۔

برہمنوں کی کئی گوتیں اور قبیلے ہیں جن میں سے ایک کا نام سروریہ ہے۔ ریوانڈ شیرنگ کے مطابق یہ نام دراصل "سرجو پار" ہے جو اب بگڑ کر سروریہ بن گیا ہے۔ سرجو ایک ندی کا نام ہے جو یو۔پی (اہنسا) میں بہتی ہے۔ اس کے پار علاقہ سروریہ ہے۔ یہ برہمن قبیلہ اُسی علاقہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر سروریہ کہلاتے ہیں۔ اس قبیلے کے برہمن اب بنارس اور اعظم گڑھ کے اضلاع میں کافی تعداد میں آباد ہیں"[1] کیا ان سروریہ برہمنوں کا تعلق سخی سرور سے ہو سکتا ہے؟ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ سخی سرور کے اکثر و بیشتر زائرین ہندو ہوا کرتے تھے۔ مسلمان خال خال نظر آتے تھے اور وہ بھی نہایت رذیل طبقے کے جو جہالت کی بنا پر اسلام اور ہندو مذہب میں تفریق نہ کر سکتے تھے۔ دریائے سندھ جس جھیل سے نکلتا ہے اُسے مان سَرُوَر کہتے ہیں مگر اُسے عام تحریروں میں مانسرور لکھا جاتا ہے۔ ممکن ہے اس نام کی وجہ تسمیہ بھی برہمنوں کی یہی گوت ہو اور پھر مسلمانوں نے اس جگہ کو سخی سرور کر لیا۔ بہر حال اس مسئلہ کی تحقیق کی ضرورت ہے۔ ڈیرہ غازی خان کی مردم شماری ۱۹۲۱ء میں نو افراد نے اپنا مذہب سخی سرور لکھوایا۔ گمان ہوتا ہے کہ وہ مسلمان خاندان سے نہ تھے بلکہ سروریہ ہندو تھے جن کے مخصوص رسم و رواج ہیں۔ شاید سروریہ برہمنوں نے یہ استھان بنایا ہو اور مسلمان اپنی جہالت اور آبائی تقلید میں اس استھان کے معتقد رہے ہوں۔

سخی سرور کے زائرین ایچ۔ اے۔ روز لکھتے ہیں" وسطی پنجاب سے روانہ ہونے والے زائرین کا اس خانقاہ کی طرف سفر اس فرقہ سلطانیہ کا ایک مخصوص طریقہ کار ہے جس کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ سال کے پہلے مہینوں میں ہر فرقے کے لوگوں کا ایک سیلاب سا چل نکلتا ہے۔ جس میں ہندو سکھ اور مسلمان سب شامل ہوتے ہیں اور ان سب کا رخ نگاہہ کی طرف ہوتا ہے۔ میرے لئے مسٹر پرسر سے بہتر طور پر اسے بیان کرنا ممکن نہیں۔ لہٰذا ان کا بیان دہرایا جاتا ہے جو ضلع جالندھر سے شروع ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ" زائرین کی ٹولی کو "سنگ" اور قیام گاہ کو "چوکی" کہا جاتا ہے۔ ان زائرین کے خاص خاص راستے حسب ذیل ہیں۔

جنسون۔ مکندپور۔ کلیتی۔ بارہ پنڈ۔ بھوپا رائے (پھلور)۔ رڑکا۔ کلاں۔ بندالہ۔ چنڈیالہ۔ جھوپارائے (نکودر)

1- Hindo tribes and castes in Benares P. 29 Ed. 1872
Rev. M.A. Sherring.

خانپور اور پھر سلطان پور۔ اس راستے پر سنگ جو ابتدا اگر گڑھ شنکر ضلع ہوشیار پور کے زائرین پر مشتمل ہوتا ہے
ستلج کے جنوب اور ضلع جالندھر کے جنوبی خطے سے زائرین کے گروہ بھی اس میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اسے کالی کملی کا
مخصوص نام دیا جاتا ہے کیونکہ زائرین کی بہت بڑی تعداد کے پاس سیاہ رنگ کے کمبل سردی سے بچاؤ کے لیئے ہوتے
ہیں (سیاہ رنگ شیو دیوتا کا رنگ ہے)۔ ایک اور راستہ آدم پور، جالندھر۔ کپورتھلہ اور ویرو وال کا ہے جس
کو دوآبہ کے شمالی حصے کے لوگ اختیار کرتے ہیں۔ وہ لوگ جو کرتار پور سے روانہ ہوتے ہیں وہاں اکھٹے ہو کر کپورتھلہ کو
جاتے ہیں۔ دوران سفر یہ لوگ زمین پر سوتے ہیں۔ زیارت کی تکمیل تک وہ نہ سر دھوتے ہیں اور نہ ہی کپڑے۔ زیادہ عقیدتمند
لوگ تو گھر واپس آکر ہی نہاتے ہیں اور کپڑے تبدیل کرتے ہیں (یہ غیر اسلامی طریقہ ہے جسے رہبانیت کہا جا سکتا ہے کیونکہ
اسلام میں صفائی نصف ایمان ہے مولف)۔ زائرین کی قیادت بھرائی بذات خود کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو پیر بھائی یا
پیر بہن کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔ ایبٹ سن کا گمان ہے کہ اسی لفظ بھرا یعنی بھائی سے لفظ بھرائی اخذ ہوا ہے۔ وہ لوگ
جو خود زیارت پر جانے کے متحمل نہیں ہو سکتے تو وہ کسی منزل یا چوکی تک جاتے ہیں اور اگر یہ بھی نہ ہو سکے تو ایک رات
گھر پر فرش پر سو کر گزارتے ہیں جسے زیارت کا نعم البدل سمجھا جاتا ہے۔ نگاہہ کی زیارت کو جانا کسی منت کے سلسلہ
میں ہوتا ہے جو اس ولی سے پیدا ہونے کی توقع ہوتی ہے یا پھر منت پوری کرنے کے لئے۔ زائرین سفر کے دوران
عوامی حکومت کے طور پر کام کرتے ہیں۔ چک چیلا اور کانگ چیلا (کانگ کلاں) تحصیل نکودر کے رہنما جنوبی گروہ کے ساتھ
شامل ہو جاتے ہیں اور ایک اسمبلی مقرر کرتے ہیں جسے دیوان کہا جاتا ہے۔ اس کا اجلاس ہر شام ہوتا ہے جس میں عدالتی
کارروائی کی جاتی ہے۔ اس سلسلہ میں انہیں بلگا، جنڈیالہ، بڑا پنڈ اور دیگر گاؤں سے اسیر یا معاون مل جاتے ہیں۔ کانگ چیلا
اور چک چیلا کے اکابرین میں بڑی رقابت ہے مگر چک چیلا کے راہنما زیادہ با اثر ہیں۔

اس بزرگ کے اور بھی کئی آستانے یا خانقاہیں موجود ہیں بلکہ درحقیقت وسطی پنجاب کے ہر گاؤں میں یہ موجود ہیں۔
تاہم ان میں سے زیادہ مشہور وہ ہیں جہاں سالانہ میلہ لگتا ہے مثلاً دھونکل ضلع گوجرانوالہ، جھنڈا میلہ پشاور اور قدموں کا
میلہ انار کلی لاہور ہیں۔ دھونکل میں سلطان سرور نے رہائش اختیار کی تھی اور معجزانہ طور پر پانی کی ندی جاری کی تھی۔
شاہجہاں کے دور میں اس گھر کو مسجد میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ کنواں کی ترمیم کر کے اسے خوبصورت بنایا گیا۔ یہاں کا
میلہ جو جون جولائی میں لگتا ہے ایک ماہ تک جاری رہتا ہے جس میں دو لاکھ سے زائد افراد حصہ لیتے ہیں۔ وہ لوگ اس
مقدس کنوئیں کا پانی پیتے ہیں اور واپسی پر پنکھے اور مہندی کی شاخیں بطور یادگار حاضری لے جاتے ہیں۔ جھنڈا میلہ
پشاور کم اہم ہے۔ یہ پہلے اور دوسرے سوموار ماہ ماگھ میں لگتا ہے اور اگر برسات شروع ہو جائے تو اسے متاخر کر دیا
جاتا ہے۔ یہ میلہ سخی سرور کی وفات کے سلسلہ میں منایا جاتا ہے۔ اس کا نام ان جھنڈوں کی وجہ سے ہے جو فقیر لوگ اٹھائے
ہوئے ہوتے ہیں۔ "قدموں کا میلہ" انار کلی روضہ سخی سرور نزد پولیس تھانہ انار کلی فروری کے بعد پہلے سوموار کو لگتا ہے۔

خانقاہ پر چڑھاوے چڑھتے ہیں اور گانے والوں کا ایک مخصوص طبقہ جسے ڈھولی کہا جاتا ہے اپنے بچوں کو خانقاہ پر لے جا کر حاضری دیتے ہیں اور اُن کے ساتھ مل کر ناچتے ہیں۔ ڈھونکل اور پشاور کی طرح لاہور میں بھی حضرت سخی سرور کی یاد میں میلے لگتے ہیں جن میں بکثرت لوگ شرکت کرتے ہیں۔ ایک کو قدموں کا میلہ اور دوسرے کو "بار کا میلہ" کہتے ہیں۔ آخرالذکر کا حال تو آگے بیان کیا جائے گا۔ یہاں اول الذکر کی بابت کچھ تفصیلات بہم پہنچائی جاتی ہیں۔ ڈھونکل اور پشاور کے میلے کی طرح قدموں کے میلے کے متعلق بھی بہت سے ماخذوں سے گرانقدر معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ ذیل میں بعض اہم ماخذوں کا سرسری جائزہ لیا جاتا ہے۔ ان کے مطالعہ سے معلوم ہو سکے گا کہ یہ میلہ وقتاً فوقتاً کہاں، کیسے اور کیوں لگتا رہا ہے اور بتدریج لاہور کے متغیر انفیائی حالات میں کیا سے کیا تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔

ضلع لاہور کے سرکاری گزیٹر میں مرقوم ہے کہ "قدموں کا میلہ" مسجد سخی سرور واقع انارکلی بازار پر ہر سال فروری کے مہینے میں لگتا ہے۔ حضرت سخی سرور پاک و ہند خصوصاً پنجاب کے ایک بڑے بزرگ تھے ...... پاکستان کی مرتب کردہ رپورٹ مردم شماری میں بھی اس قسم کا اندراج ہے۔ اس میں مذکور ہے کہ قدموں کا میلہ (لاہور میں) دہلی، لوہاری اور شاہ عالمی دروازوں کے باہر ماہ فروری میں لگتا ہے ......"

مولوی نور احمد نے اپنی کتاب "تحقیقات چشتی" میں "احوال مکان چوک سخی سرور" کے ذیل میں لکھا ہے کہ یہ مقام صدر بازار اور انارکلی کی سرائے محمد شفیع کے جنوبی رویہ موجود ہے۔ اس سڑک کے غرب رویہ مکانات خام واقع ہیں۔ یہ مکانات مشتمل کوٹھہ قالبوتی خشتی و پختہ بنا ہوا ہے جس کا دروازہ مشرقی رویہ بچوبی ہے۔ اندر اور باہر کی استرکاری پرانی وضع کی ہے۔ سنگ استرکاری کبھی سفید تھا لیکن اب سیاہ پڑ گیا ہے۔ اس کوٹھہ کے اندر مغربی دیوار میں ایک طاقچہ بڑا اور دو طاقچے چھوٹے ہیں۔ بڑے چراغدان کے اوپر محرابی طاقچہ بنا ہوا ہے۔ یہ مکان حضرت سخی سرور کے نام پر آپ کے عقیدت مندوں نے جن کو بھرائی کہتے ہیں بطبع نفسانی بنایا ہوا ہے ورنہ آپ کے اعتکاف کا یہ کوئی اصلی مکان نہیں۔ اس جگہ پر حضرت سخی سرور کے قدموں کا میلہ ماہ پھاگن کے نوچندہ منگل کو ہوتا ہے۔ ابتدا میں یہ میلہ تھانہ انارکلی کے متصل نواب وزیر خان کے باغ میں ہوا کرتا تھا جہاں کھجوروں کے علاوہ، بیریوں کے چند ایک قدیم درخت تھے۔ اس واسطے اس میلے کا نام "بڈھی بیری" کے قدم مشہور تھا۔ بعد ازاں ۱۹۹۹ (بکرمی) میں یہ مکان بخرچ چندہ چھ بھرائی افراد نے تیار کیا جن کے نام یہ بتائے جاتے ہیں۔ نہال، دودا، خواجہ، جمیتا، خنو اور وزیر۔

مولوی نور احمد نے ذرا آگے چل کر یہ بھی بیان کیا ہے کہ جس روز قدموں کا میلہ لگتا ہے، اس روز شیطان کا بازار خوب گرم ہوتا ہے۔ نچلے طبقے کے لوگوں کا ہجوم ہوتا ہے اور فاحشہ عورتیں کثرت سے میلے میں شریک ہوتی ہیں۔ لوہاری دروازے سے لے کر تھانہ انارکلی تک ہزاروں آدمی نظر آتے ہیں۔ سینکڑوں بھرائی جن کو ڈھولی کہتے ہیں، اِدھر اُدھر ڈھول بجاتے پھرتے ہیں۔ لوگ ان سے چھنیاں ڈلواتے ہیں اور اس سے مراد یہ ہے کہ بھرائی بچوں کو گود میں لے کر ناچتے ہیں اور اکثر ایسی لوریاں

سناتے ہیں:

سرور دے دربار مراداں لے آئی ہاں
دے مراداں سرور پیرا ۔ میںنوں تیرے در دا دہیرا
گودی بال کھڈا مراداں لے آئی ہاں

ملیر کوٹلہ میں پوہ کے پہلے خمیس (جمعرات) کو میلہ لگتا ہے جو ملتان کے میلے کے مشابہ ہے۔ ڈمنی کا میلہ ماہ پوہ کے پہلے بدھ کو لگتا ہے ۔ بھرائی ایک دیا جلا کر ایسی جگہ رکھتے ہیں جہاں پر ہندو اور مسلمان روٹی اور غلے کا نذرانہ دیتے ہیں دوسرے روز وہ ماڑی کے لئے روانہ ہوتے ہیں جہاں روضہ گگا پیر موجود ہے۔ رگگا دراصل سانپ دیوتا کا نام ہے ۔ قدیم ایام میں اکثر قومیں سانپ کی پوجا بار آوری کے دیوتا کے طور پر کرتی تھیں۔ دراصل یہ انسانی اعضا تناسل کی پوجا کا ایک طریقہ تھا جواب بھی ہندوؤں میں مروج ہے) ایک اور روضہ سخی سرور موگا میں موجود ہے۔ یہ نگاہہ پیر کہلاتا ہے۔ جس کی بنیاد سنہ ۱۹۶۹ بکری پٹیالہ کے ایک آدمی نے رکھی۔ اس میں کوئی بت نہیں بلکہ ایک چبوترہ یا تھلہ بنا ہوا ہے ۔ یہاں کا پجاری (مجاور) ایک کھتری ہندو ہے اور باپ کے بعد بیٹا گدی نشین ہوتا ہے ۔ چیت اور اسوج کے خمیس کے ایام میلہ لگتا ہے جس میں نقد اور چوری کا نذرانہ روضہ پر پیش کیا جاتا ہے۔ سخی سرور کا ایک اور روضہ نگاہ میں ہے جہاں ماہ پھاگن کے روشن خمیس کے دن میلہ لگتا ہے ۔ یہاں ایک مخصوص جگہ ہے جہاں عقیدت کے پھول نچھاور کئے جاتے ہیں ۔ یہ دوسرا سال قبل منسا کے ایک سردار نے اُس وقت قائم کی تھی جب اُس پر مصائب و آلام کے پہاڑ ٹوٹ پڑے اور اُسے خواب میں بشارت ہوئی کہ وہ موگا جائے اور وہاں مندر تعمیر کرے ۔ پس اُس نے مندر تعمیر کیا جس میں ہندو مسلمان عقیدت مندوں کی حیثیت سے جاتے ہیں اور فصل کی برداشت پر غلہ دیتے ہیں ۔ یہاں پر ایک سبیل بنی ہوئی ہے جہاں سے مسافر پانی پیتے ہیں ۔ میلہ میں زائرین کو کھانا مفت کھلایا جاتا ہے ۔ یہاں ایک برہمن پجاری (مجاور) کے طور پر کام کرتا ہے ۔

بادل کا میلہ ضلع لدھیانہ میں خانقاہ سخی سرور میں اسی نام کے گاؤں میں لگتا ہے ۔ یہ میلہ پہلے روشن خمیس (جمعرات) ماہ جیٹھ میں لگتا ہے ۔ اس خانقاہ کے اندر سخی سرور کی ایک علامتی قبر ہے ۔ لوگ جب میلے میں آتے ہیں تو ایک بڑا روٹ (روٹی) پکایا جاتا ہے۔ جس کو خانقاہ پر چڑھاوا چڑھانے کے بعد غرباء میں بانٹ دیا جاتا ہے ۔ اس خانقاہ کا انتظام وہاں کے رہنے والے گھمن جاٹ اور بھرائی کرتے ہیں ۔ خانقاہ کی آمدنی کو برابر برابر کے حصوں میں آپس میں بانٹ لیتے ہیں ۔

لکھ داتا فرقہ چمبہ میں پایا جاتا ہے اور اس ریاست میں اس امر کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ یہ سخی سرور سلطان کا فرقہ ہے ۔ پہاڑیوں میں اُس کے روضوں پر ہندو اور مسلمان یکساں طور پر حاضری دیتے ہیں ۔ ان مندروں ، استھانوں اور زیارت گاہوں کے متولی مسلمان مجاور ہیں ۔ گر باری پرگنہ چنڑی کا مجاور بطور برہمن ہے اور پڑلا واقع جگری کا مجاور ایک راٹھی اور چیلا ایک مسلمان ہے ۔

1 . تذکرہ حضرت سخی ۔ ص ۲۲۰۔ حامد خان حامد

یہ عہدے اُن میں موروثی معلوم ہوتے ہیں۔ کشتی کے مقابلے جسے چھنج کہا جاتا ہے اور یہ سکھ داتا فرقے سے منسوب ہے جو ہر سال چیڑہ کے پرگنہ میں اور صدر وزارت کے بعض پرگنوں کے علاوہ بھٹیات میں بھی منایا جاتا ہے۔ اس کے متعلق کوئی صحیح تشریح نہیں مل سکی۔

سخی سرور کی ایک خانقاہ ناہن میں بھی ہے اور اُس کا فرقہ پنجاب سے بھی آگے تک پھیلا ہوا ہے۔ سہارنپور میں سخی سرور کی پوجا جوگیوں کا ایک فرقہ کرتا ہے جو "فاریائی" کہلاتا ہے۔ اس گروہ کے لوگوں کو اس دھرم میں دس بارہ سال کی عمر میں سرگروہ باقاعدہ رسم ادا کرنے کے بعد شامل گروہ کرتا ہے۔ رسم نہایت سادہ ہوتی ہے۔ بچے کے والدین کچھ مٹھائی اُس جوگی کے سامنے رکھتے ہیں جو اُن کا گرو ہوتا ہے اور پھر تبرکاً سخی سرور کی نذر کی جاتی ہے۔ اس مٹھائی کو موجود جوگی کھاتے ہیں۔ پھر بچے کو وہ گیت یاد کرائے جاتے ہیں جس میں ایک دلہن کو سکھ دھرم میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی تھی جس کے نتیجہ میں سخی سرور نے بھیراؤں کو حکم دیا کہ ان غلط کاروں کو سزا دی جائے جس سے وہ کوڑھی اور اندھے ہوگئے۔ جب دلہن نے اُن کی طرف سے معافی کی استدعا کی تو وہ شفایاب ہوگئے۔ تاہم اس وقت اس فرقہ اور سکھوں میں کوئی عناد نہیں بلکہ ایک سکھ جاٹ نے نگاہہ کی زیارت بنانے کے لئے عطیہ اراضی دیا۔

کم از کم مشرقی پنجاب میں سخی سرور مسلک کو عورتیں خصوصی طور پر پسند کرتی ہیں جو بھیراؤں کے تعلق سے ہے جس میں زمین کو بار آوری کی علامت تصور کیا جاتا ہے اور اس زیارت گاہ میں کچھ اس قسم کے (بار آوری) رسوم ادا کئے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ نظریہ کہ یہ عبادت دراصل دھرتی ماتا پر جا ہے، اس امر کو مزید تقویت دیتا ہے کہ فی الحقیقت یہ جاٹ کسانوں کا مذہبی مسلک ہے۔ دانی جٹی کی روایات میں سخی سرور نے اُسے بارہ سال تک بانجھ رہنے کے بعد منت ماننے پر ایک لڑکے سے سرفراز کیا۔ دانی نے منت کی خلاف ورزی کی اور بچہ فوت ہوگیا مگر بچے کو اس بزرگ نے دوبارہ زندگی عطا کردی۔ ملتان میں اُس کے مریدوں نے بھیڑ بکریوں کے تمام بچوں کو کھا لیا مگر اُن کی ہڈیوں اور کھالوں کو ایک ڈھیر کی صورت میں جمع کردیا جو اُس کی (سخی سرور) دعا سے پھر زندہ ہوگئے۔ موسم سرما کے عین وسط میں گگی (گھوڑی) کی خواہش پر اُس نے پیلو کے درخت کو پھل دینے کا حکم دیا تاکہ اُس کے مریدوں کے لئے جنگل میں غذا میسر ہوسکے۔

سخی سرور کی دیگیں ان کی یاد دلاتی ہیں جن کا تذکرہ سکھوں کے مذہب اور ڈم کی روایات میں پایا جاتا ہے۔ ان میں سے ایک من اور دوسری لنگر کہلاتی ہے۔ اول الذکر میں آٹھ من گڑ، پانچ گھی اور بیس دلیہ اور ایک پھل (من) میں سما سکتے ہیں۔ لنگر میں تین من گڑ، گھی دو من، دلیہ آٹھ من اور پھل بیس سیر سما سکتے ہیں۔ سال میں ایک مرتبہ عموماً مئی یا جون کے مہینوں میں دونوں کو بھر کر پکایا جاتا ہے اور پھر غربا میں تقسیم کردیا جاتا ہے۔

قاسم شاہ والد نورنگ شاہ جس کا روضہ ڈیرہ غازی خان میں ہے سندھ سے آیا تھا۔ نورنگ شاہ سخی سرور کا بڑا معتقد تھا اور بارہ سال تک خدمت گزاری خانقاہ کرتا رہا۔ وہ بڑا صاحب کرامات بن گیا اور بڑی شہرت پائی۔ ان کی اولاد اپنا نسب حضرت علیؓ

سے ملاتی ہے۔

پنج پیر: اس ملک کے بعض ہندوؤں میں اپنے کو پانچ پیر کے مرید کہلانے کا بڑا اشتیاق ہے۔ یہ پانچ پیر کونسے ہیں، یہ معتقد کے اپنے نظریہ اور انتخاب پر منحصر ہے۔ بعض اوقات یہ پانچ پانڈو ہیں اور بعض اوقات شیعہ عقیدہ کی پانچ مقتدر ہستیاں یعنی محمدؐ، فاطمہؓ، علیؓ، حسنؓ اور حسینؓ ہیں۔ بعض اوقات پانچ اولیاء یہ ہیں۔ خواجہ قطب الدین، خواجہ معین الدین چشتی، شیخ نظام الدین اولیاء، نصیر الدین ابوالخیر اور سلطان نصیر الدین محمود یا خواجہ خضر و سید جلال۔ زکریا۔ لعل شہباز اور فرید شکر گنج۔ ضلع گوجرانوالہ کے بھٹی آپ کو بتائیں گے کہ پانچ ولی شیخ سمیل، شاہ دولت، شیخ فتح علی، پیر فتح خان اور شاہ مراد ہیں جو تماماً بھٹی قبیلہ کے پشت پناہ ہیں اور ہر قبیلہ اپنی مرضی کے اولیاء کا انتخاب کریگا۔ صوبہ کے مغربی اور مرکزی حصوں میں ہمیں ہندو اور مسلمان اولیا کا عجیب و غریب پنج پیر کا مرکب نظر آتا ہے۔ ایک فہرست میں سلطان، دیوی، گرو، خواجہ اور گگا پیر کے نام ملیں گے جبکہ ایک دوسری میں (مثلاً لدھیانہ) خواجہ خضر، درگا دیوی، وشنو، سخی سرور اور گوبند سنگھ کے نام ملیں گے یا شملہ میں گگا پیر، بالا ناتھ، ٹھاکر، سخی سرور اور شو ہونگے۔ درحقیقت پانچ اولیاء وہ اشخاص ہونگے جن کے نام معتقد جاپ کرنا چاہتا ہے۔ جب کوئی فرد اپنے کو پنج پیر کہتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اسے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ پانچ اولیا کون سے ہیں اور عموماً وہ پنج ذاتوں سے ہوتا ہے۔ پنج پیر سے مظفر گڑھ سے دہلی تک تمام صوبے میں پائے جاتے ہیں۔ ضلع شاہ پور (سرگودھا) میں ساہیوال سے دس میل جانب جنوب پنج پیر کے اعزاز میں ہر سال میلہ لگتا ہے۔ بعض افراد اپنے کو خاص انداز یا معین کرنے کے لئے اپنے کو چہار پیر کا معتقد ظاہر کرتے ہیں جس کا عموماً مطلب رسول اللہ کے چار یار مراد لئے جاتے ہیں جن کے ماننے والے ہندو اور مسلمان دونوں میں پائے جاتے ہیں۔

البوہر میں موجود پنج پیر کی خانقاہ پر چھت نہیں۔ یہاں ہر سال پندرہ ہاڑ کو میلہ لگتا ہے۔ یہاں بہت کم لوگ آتے ہیں جن میں زیادہ تعداد میں مداری، نوشاہی وغیرہ ہوتے ہیں۔ روایت کے مطابق نو سو سال پہلے البوہر پر راجہ آیا نند کی حکمرانی تھی جس کی صرف ایک بیٹی تھی۔ بستر مرگ پر اس نے بڑی حسرت سے کہا کہ اس کی اولاد نرینہ نہیں جو پنج پیراں اچ (بہاولپور) جا کر گھوڑوں کو سوار ہو کر لائے۔ اس کی بیٹی نے دلیری سے کہا کہ وہ اچ جا کر گھوڑوں کو لائے گی۔ وہ ایک چھوٹے سے گروہ کے ساتھ گئی اور وہاں سے پنج پیر کے گھوڑے چرا کر لائی۔ وہ لوگ اس کے پیچھے آئے اور التجا کی کہ گھوڑے واپس کر دیئے جائیں مگر اس نے انکار کر دیا۔ اب ان کے پاس کوئی چارہ نہ رہا کہ صبر کر کے اُن کی واپسی کا انتظار کریں۔ پیر کی بیریاں اس انتظار سے اکتا گئیں اور انہوں نے اپنے خاوند کے نقش قدم پر البوہر کا راستہ اختیار کیا۔ وہاں پر انہیں موت نے گلے لگا لیا اور وہ البوہر اور شہزادی کو بد عادتی راہی ملک عدم ہوئیں۔ تھوڑے دنوں کے اندر اُن کی پیش گوئی سچ ثابت ہوئی اور وہ جگہ ویرانہ بن گئی۔ پانچ پیروں کو گاؤں کے قریب دفن کیا گیا اور اُن کے نزدیک ہی اُن کی ازواج کی قبریں ہیں۔ اس روضے میں پانچ پیروں اور اُن کی ازواج کی قبریں ہیں جن کے گرد اینٹوں کی دیوار ہے مگر چھت نہیں۔ خانقاہ کا انتظام دو مسلمان فقیر کرتے ہیں جو قوم لاڈ سے تعلق رکھتے ہیں وہ اسے صاف ستھرا

رکھتے ہیں اور شام کے وقت دیا جلاتے ہیں"[1]

جب یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت سخی سرور کا چرچا اس قدر دور دراز علاقوں میں بھی تھا تو قدرتی طور پر خیال پیدا ہوتا ہے کہ اُن کا اس قدر شہرہ کیسے ہوا۔ حالانکہ اُن سے قبل اور بعد میں بڑے بڑے اولیائے کرام گزرے ہیں جن کی زندگی کے حالات تاریخی طور پر معلوم نہیں ہیں مگر اُن کی "گدیاں" پر نہ تو اس قدر دولت کی کثرت ہے اور نہ ہی اتنا شہرہ۔ دراصل اس کا سبب حضرت سخی سرور کے مجاوروں کی باقاعدہ تنظیم ہے کیونکہ جو کام ایک منظم ادارہ کر سکتا ہے وہ انفرادی طور پر اتنا کامیاب نہیں ہو سکتا۔ ان مجاوروں کی آبادی کثیر ہے اور انہوں نے باہمی رضامندی سے متحدہ پنجاب اور دیگر علاقوں کو اپنے اپنے خاندانی حلقہ اثر میں تقسیم کر رکھا ہے۔ یہ مجاور مارچ اپریل کے میلے کے بعد اپنے اپنے "حلقوں" میں چلے جاتے ہیں اور وہاں اپنے پیر و مرشد کے اوصاف، کمالات اور معجزات خوب بڑھا چڑھا کر بیان کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ اپنے حلقے کے لوگوں کو "بوٹی" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ فی الحقیقت جاہل عوام تھے بھی بوٹی جن کے پتے اور پھل مجاور، تمندار، کاردار، کارندے اور نام نہاد ملاں و پیر نوچ نوچ کر کھاتے رہے اور وہ ذہنی طور پر اس قدر مفلوج ہو چکے تھے کہ چوں چراں تک نہ کر سکتے۔ وہ اپنی دنیاوی زیست کے سہاروں کو پتھرائی ہوئی آنکھوں سے لٹتے دیکھتے مگر خاموش رہتے۔ راقم الحروف کو بچپن (۱۹۳۰-۳۵) کے واقعات یاد ہیں جب سہون اور دیگر گدیوں کے مجاور سینکڑوں مویشی عوام سے بخوشی یا زبردستی پیر کے نام پر ہانک کر لے جاتے تھے۔ بعض اوقات وہ سینکڑوں کی تعداد میں جانور ہانک رہے ہوتے تھے۔ بلکہ ایسا بھی ہوتا کہ کوئی کسان ہل چلا رہا ہوتا اور یہ لوگ نازل ہو جاتے اور اُس جوڑی بیل سے اچھے بیل کا تقاضا کرتے۔ جاہل کسان جہاں وہ ان دنیاوی "زبردستوں" سے دہشت زدہ تھے وہاں وہ مذہبی ٹھیکیداروں اور اُن کی جونکوں سے بھی ڈرتے تھے جو انہیں "کانی مارنے" یا بد دعا کی دھمکی دے کر اچھے مویشی ہتھیا لیتے۔ اسی طرح سے سخی سرور کے مجاور بھی جٹہ دانی اور دیگر روایات سنا کر لوگوں کو خوفزدہ کئے رکھتے اور فصل پکنے کے موقع پر ہر "بوٹی" سے ایک ٹوپہ (تقریباً چار کلو) غلہ وصول کرتے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ آمدنی ہر مجاور بطور "سفر خرچ" اپنے پاس رکھنے کا مجاز ہے اور اسے مرکزی خزانہ میں جمع نہیں کرایا جاتا۔ اس طریقے سے ہر مجاور ذاتی کارکردگی سے نہ صرف اپنی آمدنی بڑھا لیتا ہے بلکہ اپنے مرشد کی شہرت اور عقیدت کو ترقی دے کر اپنی آمدنی کو مزید بڑھاتا ہے۔ لہٰذا ہر مجاور پوری کوشش کرتا ہے۔ مجاوروں کے ہر خاندان کا ایک "حلقہ اثر" ہوتا ہے جس میں کوئی دوسرا مجاور تجاوزات نہیں کرتا۔ یہ اُن کا غیر تحریری قانون ہے جس پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے اور کبھی بھی اس کی خلاف ورزی سننے میں نہیں آئی۔ اُن کی "بوٹیاں" موروثی ہوتی ہیں یعنی باپ کی وفات کے بعد صرف اس کی اولاد ہی اس حلقے کے دورے کرنے کی مجاز ہوتی ہے۔

حضرت سخی سرور کے بیان میں بھیرلوں کا تذکرہ بار بار آتا ہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ بھیرلوں کے متعلق بھی حالات

1- A Glossary of tribes & castes of Punjab & NWFP vol. I P. 568-573 H.A. Rose

درج کئے جائیں۔ اس سلسلے میں بھی مسٹر روز کی کتاب سے اقتباسات موزوں رہیں گے۔ وہ لکھتے ہیں" ہندو تثلیث میں برہما، شو اور وشنو شامل ہیں۔ اُن سے کم تر درجے کے دیوتاؤں میں سب سے زیادہ شہرت گینش، ہنومان اور بھیراوں کو حاصل ہے۔ ۔۔۔۔ بھیراوں یا بھیرادا ایک خوفناک دیوتا ہے جس کی شخصیت کو پوری طرح سے سمجھنا مشکل ہے۔ مصدقہ ہندو دیو مالا میں شو اور بھیراوں ایک ہی شخصیت ہے۔ شو دیوتا کے کئی ناموں میں سے ایک نام بھیراوں یا بھیرادا ہے اس کے علاوہ اُسے کالی دیوی کا خادم بھی ظاہر کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے سکھ سقے اس کی خاص طور پر پوجا کرتے ہیں۔ بنارس میں اُس کے ڈنڈے کی پوجا بطور " ردکوتوال" کی جاتی ہے جو زمین کا دیوتا ہے۔ بھیراؤں عموماً نچلے درجے کا دیوتا شمار ہوتا ہے جو سیاہ رنگ کا بت ہوتا ہے اور اس کے ایک ہاتھ میں شراب کی بوتل ہوتی ہے۔ اس کے مندر بڑے بڑے شہر میں موجود ہیں۔ یہ ایک بدفصلت روح یا شیطان ہے جس کے پیروکار شراب پیتے ہیں اور گوشت کھاتے ہیں۔ فقیروں کا ایک فرقہ جو جوگیوں سے ملتا جلتا ہے خاص طور پر اس کی خدمت کے شوقین ہیں۔ وہ اپنے جسم پر سرخ رنگ اور تیل مل کر بازار میں جاکر بھیراؤں کی شان میں گیت گاکر بھیک مانگتے ہیں۔ اُن کی کمر کے گرد گھنٹیاں بندھی ہوئی ہوتی ہیں اور اپنے جسم پر چابک زنی کرتے ہیں۔ وہ صرف بڑے بڑے شہروں میں پائے جاتے ہیں اور تجرد کی زندگی نہیں گزارتے۔ اُن کی سب سے بڑی زیارت گاہ (تیرتھ) گرنار پربت پر ہے جو کاٹھیا واڑ میں ہے۔ جو کتب بھیراؤں کی پوجا کے طریقے سکھاتی ہیں اُن کے نام یہ ہیں: بھیراؤں ستوتر اور بھیراوا نشک۔ بھیراوا کا استھان یا مندر نزد اچھرہ لاہور کا نام ایک عجیب و غریب روایت کی بنا پر پڑا ہے۔۔۔۔۔"[1]

ہندوؤں کی رسومات مرگ میں بھی بھیراؤں کا کردار بڑا اہم ہے۔ اُن کے توہم میں سے ایک پنچک ہے جس سے مراد یہ ہے کہ مردہ اپنے پیچھے اپنے رشتہ داروں کو بھی موت کے منہ میں لے جائے گا۔ اس خطرہ سے بچاؤ کے لئے مختلف تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ اُن میں سے پہلی تدبیر تو یہ کی جاتی ہے کہ میت کو اُس دور (وقت) کے گزرنے تک جلایا نہیں جاتا۔ اگر ایسا کرنا ممکن نہ ہو تو ڈیرہ غازی خان کے ہندو لقایا ایام کے مطابق کپڑے یا دربھ گھاس کی اُتنی گڑیاں بناتے تھے۔ البتہ طبقہ امرا تانبے اور سونے کو استعمال کرتے تھے۔ بعض اوقات گڑیاں صرف کپڑے اور گوبر کی بھی بنائی جاتی تھیں اور مردے کے ساتھ آم کی ٹہنی کو بھی جلایا جاتا تھا۔ ڈیرہ غازی خان میں لکڑی کی گڑیاں بھی بنائی جاتی تھیں۔ مردے کے جلانے کے بعد کسی مندر یا چوک میں پانچ برہمن منتر پڑھتے تھے اور پانچ برتن اس طرح سے رکھتے تھے کہ ایک مرکز میں اور باقی ایک ایک کونے میں موجود ہوتے۔ پھر ان میں پنچ امرت (گائے کی گوبر کا نچوڑ، گائے کا پیشاب، دودھ، دہی اور گھی۔ مصنف) ڈال کر اُن کا منہ تانبے کی پتریوں سے ڈھانپ دیا جاتا۔ ان پتریوں پر وشنو، اندرا، جام اور بھیراؤں کی مورتیاں کھدی ہوتی"[2]

1- A glossary of tribes & castes of Punjab & N.W.F.P Vol. I P. 317 H.A. Rose.

2- " " " " " " " " " " " P. 870. H.A. Rose

ڈاکٹر تارا چند نے بھیراوں کو ہندو دیو مالا میں حسب ذیل درجہ میں جگہ دی ہے

برہما　　　شو　　　وشنو

رام چندر ← کرشن

گینش　　　ہنومان　　　بھیراوں
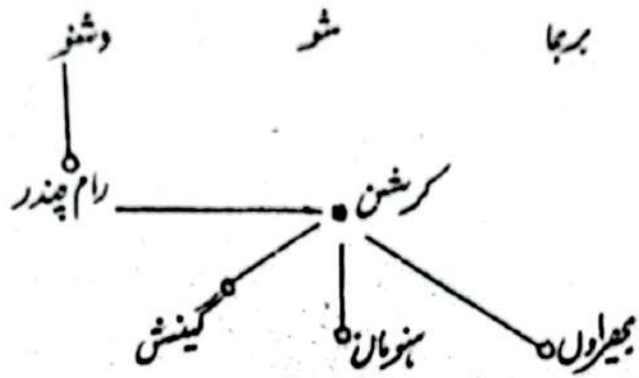
بھیراوں یا کال بھیراوں ہندو مذہب میں ایک خاص مرتبہ رکھنے کی وجہ سے بڑی عقیدت کا مرکز رہی ہے اور ہندوستان کے اکثر و بیشتر شہروں میں اس کے مندر بنے ہوئے تھے۔ آئین اکبری میں لکھا ہے کہ "کالنجر کے قلعہ میں بہت سے بت خانے ہیں۔ ان میں سے ایک مندر کا نام کال بھیروں[1] ہے"۔ سخی سرور کا پیغامبر بھیروں کو مانا جاتا ہے۔ بھیروں کی اصلیت کا مفصل حال جاننے کے بعد اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ آقا کس فطرت کا مالک ہوگا۔

جب ضلع ڈیرہ غازی خان قبائلی دور سے گزر رہا تھا تو خانقاہ سخی سرور کا محافظ لغاری سردار ہوا کرتا تھا۔ تمام نظم و نسق اُس کے ہاتھ میں تھا۔ اس بنا پر اس میلے کے وقت جو مال مویشی فروخت ہوتے تھے، اُن پر لغاری سردار ٹیکس وصول کرتا تھا۔ یہاں پر لاعلاج مریض شفایاب ہونے کی امید میں پڑے رہتے تھے۔ ہندو تمدن میں بھی بیماروں کو مندروں میں لے جایا کرتے تھے اور مریض وہاں قیام کرتا تھا۔ اُس کا علاج نیند طاری کر کے یعنی عمل تنویم کے ذریعہ کیا جاتا۔ اس طریق کار پر یونان، عراق، مصر وغیرہ ممالک میں عہد قدیم میں عمل ہوتا تھا۔ بہر حال اسلام میں اس کا رواج نہیں۔ موجودہ دور میں اولیاء کی قبروں پر مریضوں کا اجتماع ہندو مذہب کا پرتو ہے۔

قیام پاکستان (۱۹۴۷ء) سے پہلے سخی سرور کے میلے کے موقع پر دور دراز شہروں سے طوائفیں یہاں بڑی کثرت سے خیمہ زن ہو جاتی تھیں اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اُس وقت سخی سرور کے مقام پر برصغیر کا سب سے بڑا "طوائف خانہ" بن جاتا تھا جہاں بدکاری نہایت عروج اور کھلے بندوں ہوتی تھی۔ طوائفوں کے خیموں کے باہر بھی شرمناک مناظر دیکھنے میں آتے۔ حکومت پاکستان نے اس بدکاری کے عظیم اڈے کو ختم کر کے نہایت موزوں اور احسن کام سرانجام دیا۔

میلے کے موقع پر ایک کبوتر سخی سرور کی قبر کے اوپر بیٹھا نظر آتا ہے جس کے متعلق مجاور بیان کرتے ہیں کہ حضرت سخی سرور ان مخصوص ایام میں کبوتر کی صورت اختیار کر کے موجود رہتے ہیں۔ یہ دراصل زائرین سے زیادہ سے زیادہ رقم بٹورنے کا طریقہ ہے۔ کبوتر کو کوئی نشہ آور چیز کھلا کر نیم بیہوش کر دیا جاتا ہے اور وہ ادھر اُدھر پھرنے کی بجائے ایک ہی جگہ پر بیٹھا رہتا ہے

۱۔ آئین اکبری جلد اول (حصہ دوم) ص 829 ترجمہ مولوی فدا علی طالب

اس کے علاوہ قبر کے ایک طرف ایک سوراخ ہے جب کوئی معتقد اندر ہاتھ ڈالتا ہے تو اس کے ہاتھ میں ریوڑی، مونگ پھلی یا کوئی ایسی چیز آ جاتی ہے جس کے متعلق مجاور بیان کرتے ہیں کہ حضرت خود اپنے دستِ مبارک سے اپنی قبر سے مریدوں کو تبرک دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک فریب ہے۔ چند افراد نے مونگ پھلی یا ریوڑی دینے والے "غائبانہ" ہاتھ کو اپنی گرفت میں لے یا تو جھٹکا مار کر ہاتھ چھڑا لیا گیا۔ دراصل قبر کا کوئی خفیہ راستہ ہے جس سے کوئی مجاور اندر گھس کر بیٹھ جاتا ہے اور ریوڑیاں وغیرہ دیتا رہتا ہے۔ یہ حیران کن امر ہے کہ لعلیں والا (حضرت سخی سرور کو موتیاں والا بھی کہا جاتا ہے) اسے سائل کو صرف ایک ایک ریوڑی، کوڑی یا مونگ پھلی کا دانہ ملے۔ پھر تمام انبیاء اور اُن کے اصحاب اس دنیا سے انتقال فرما گئے مگر یہ حضرت ابھی تک اپنی ہی قبر میں مقید زندہ ہیں اور لوگوں کو ریوڑیاں بانٹ رہے ہیں۔ روضۂ اقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ختم المرسلین نے ہاتھ بڑھا کر کسی کو کوئی دنیاوی چیز نہ دی۔ اسی طرح سے سید الشہداء حضرت امام حسینؓ اور حضرت علیؓ کے مزارات سے کسی کو کوئی دنیاوی شے نہ ملے جن کی سخاوت ضرب المثل تھی مگر نعوذ باللہ حضرت سخی سرور ابھی تک زندہ ہیں اور اُن سے بھی بڑھ کر صاحبِ قوت ہیں۔ اگر یہ لوگوں کو من و سلویٰ یا جنت کے میوے عطا کرتے تو کوئی بات بنتی۔ دراصل انہوں نے علمائے یہود کی طرح لوگوں کے مال ناجائز طریقوں سے کھانے کے لئے کئی فریب ایجاد کر رکھے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے لئے قرآن حکیم میں ارشادِ خداوندی ہے "تم دنیا میں جرائم کرتے وقت جب چھپتے تھے تو تمہیں یہ خیال نہ تھا کہ کبھی تمہارے اپنے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہارے جسم کی کھالیں تم پر گواہی دیں گی بلکہ تم نے تو یہ سمجھا تھا کہ تمہارے بہت سے اعمال کی اللہ کو بھی خبر نہیں ہے۔ تمہارا یہی گمان جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا تھا، تمہیں لے ڈوبا اور اسی کی بدولت تم خسارے میں پڑ گئے۔ اس میں صبر کریں (یا نہ کریں) آگ ہی اُن کا ٹھکانہ ہے اور اگر رجوع کا موقع چاہیں تو انہیں کوئی موقع نہ دیا جائے گا۔[1]

عوام کی جہالت سے فائدہ اٹھانے کے لیے ایک اور ڈھکوسلا دیگوں کے پکنے کا بھی ہے۔ ان دیگوں کے نیچے آگ جلائی جاتی ہے مگر پھر اس آگ پر پانی ڈال دیا جاتا ہے۔ کچھ دیر کے بعد دیگ میں ابال آ جاتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان دیگوں کے دو پیندے ہیں اور جن ستون پر وہ ٹکی ہوئی ہیں، وہ اندر سے کھوکھلے ہیں۔ تہ خانے میں کثیر مقدار میں ان بجھا چونا رکھا ہوا ہوتا ہے۔ پانی ڈالنے پر بے انتہا حرارت پیدا ہوتی ہے اور دیگ میں اُبال آ جاتا ہے۔ ایسے مکر و فریب کے جال قدیم دور میں بھی پھیلائے جاتے تھے۔ قدیم یونان میں ایک دیوی کے استھان میں اس کے پروہتوں نے ایک شعبدہ تیار کر رکھا تھا تاکہ لوگ زیادہ سے زیادہ دیوی کے عقیدت مند بن جائیں۔ مختصراً اس شعبدہ کی تفصیل یہ تھی کہ عقیدت مند کو ایک مخصوص جگہ پر آگ جلانے کا حکم دیا جاتا۔ جس کے نیچے ایک پائپ کا ایک سرا ایک پانی کے برتن میں ڈوبا رہتا۔

۱۔ قرآن مجید سورۃ حٰم سجدہ آیات 23 اور 24

ایک اور بالٹی جو لٹکی ہوئی ہوتی، اس سے ایک اور پائپ پانی والے برتن میں ڈوبی رہتی۔ اس بالٹی کو ایک رسہ، جو دروازے کے دونوں پٹ سے لپٹا ہوا ہوتا، ایک وزن سے متوازن کیا جاتا۔ اس بالٹی میں بھی پانی کی ایک خاص مقدار ہوتی۔ جب آگ جلائی جاتی تو گرم ہوا پانی کو ٹنکی میں چڑھ کر بالٹی کا توازن بگاڑ دیتی اور بالٹی نیچے چلی جاتی۔ اس سے رسی دروازے کے پٹ کھول دیتی۔ جب آگ ٹھنڈی ہوتی تو پانی پھر اصلی جگہ آ جاتا اور ڈوری دروازے کو بند کر دیتی۔ اس شعبدے کی ایک معمولی نقل درج کی جا رہی ہے۔
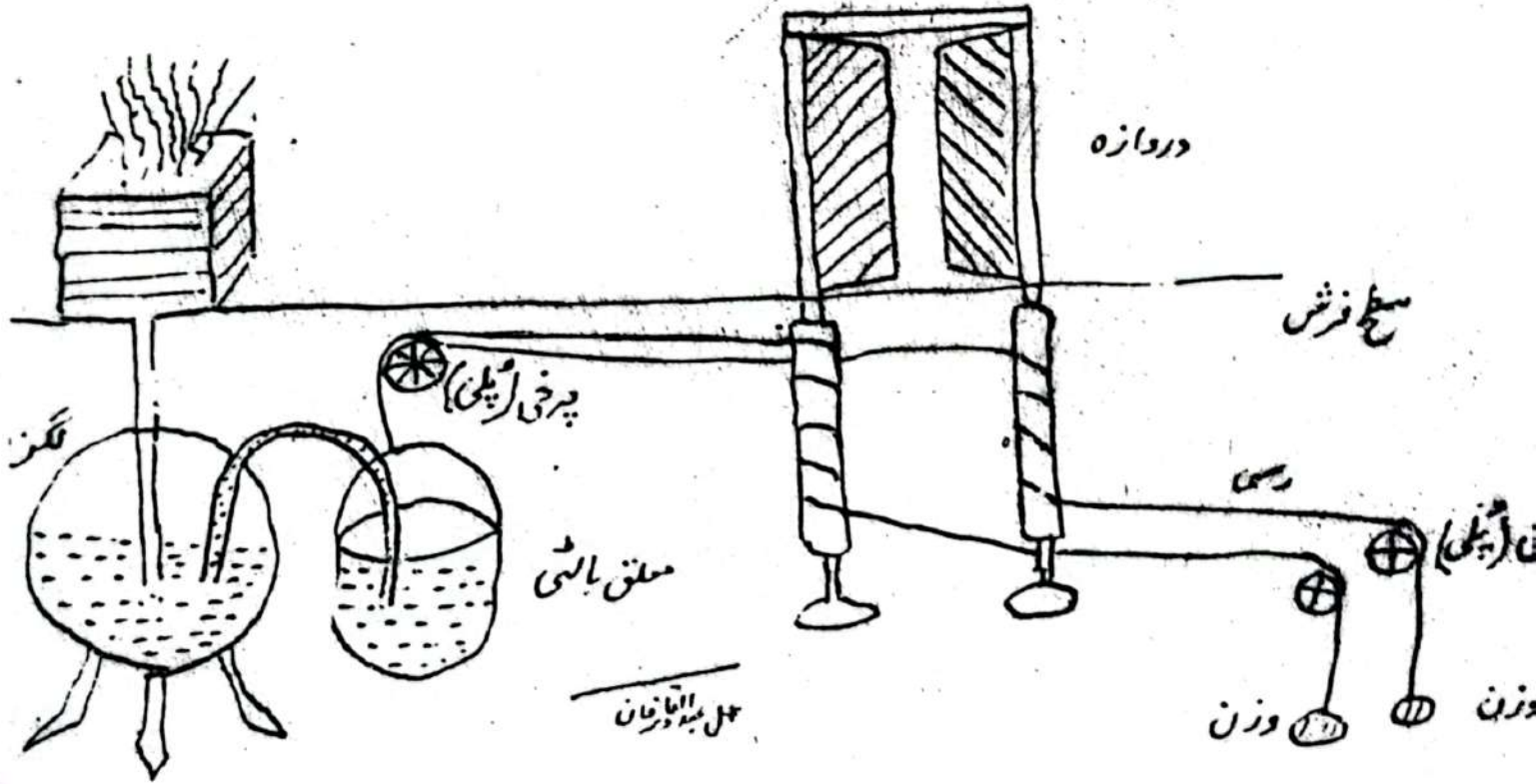
اسی طرح رود کوہی کے بعض چھوٹے چھوٹے کونوں اور چٹانوں میں اونٹ کے پاؤں کے مشابہ کوئی نشان دیکھکر مجاور جھنڈا لگا دیں گے اور بیان کریں گے کہ یہ حضرت سخی سرور کی اونٹنی کے پاؤں کا نشان ہے۔ بعض دفعہ یہ صورت مضحکہ خیز بن جاتی ہے جب مجاور اونٹنی کا پاؤں ایسی جگہ دکھاتے ہیں جہاں بکری بھی بمشکل جا سکتی ہے۔ ایک چٹان پر کھردرا سا انسانی پنجہ بنا ہوا ہے اور روایت بیان کی جاتی ہے کہ یہ چٹان گر رہی تھی کہ حضرت سخی سرور نے اپنے ہاتھ پر اسے روک لیا اور اب تک اسی حالت پر قائم ہے حالانکہ اس چٹان میں کوئی دراڑ وغیرہ نہیں جس سے یہ کہا جا سکے کہ فی الحقیقت یہ چٹان اپنی جگہ سے کھسک رہی تھی۔ یہ حسن ابدال کے پنجہ صاحب کی نقل نظر آتی ہے جس کو سکھ بڑا مقدس جانتے ہیں۔

اس دنیا میں بہت سے انسان رزق حلال حاصل کرنے کی بجائے مکر و فریب سے دولت حاصل کرتے ہیں۔ سخی سرور کی مانند شاہ مدار کی خانقاہ بھی ایسے ہی حالات کی حامل ہے جس کا بیان دلچسپی سے خالی نہ ہو گا کیونکہ اس سے پہلے ان کا ذکر

بھی سنی سرور کے ساتھ آتا رہا ہے۔

شاہ مدار: مرزا قتیل لکھتے ہیں

"شاہ مدار کے حالات کے بارے میں مختلف روایات سننے میں آتی ہیں۔ بعض اُن کو سید بتاتے ہیں مگر یہ بات بالکل غلط ہے۔ اس روایت کے منکروں کا کہنا یہ ہے کہ وہ حلب کے یہودیوں میں سے تھے۔ مدت کے بعد مشرفِ اسلام سے مشرف ہوئے اور درویشوں کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ چونکہ اُن کے سر میں فنا فی اللّٰہی کا سودا تھا اس وجہ سے اہلِ دنیا اور شریعت سے اُن کو کوئی سروکار نہیں رہا تھا۔ ہندوستانی جوگیوں اور دوسرے فقراء سے تعلیم باطنی حاصل کی۔ اکثر وہ زمین پر پڑے رہتے تھے اور فرشِ خاک اُن کا بستر تھا۔ ایک اور جماعت دوسری روایت کرتی ہے لیکن بعض لوگوں کے نزدیک تمام روایتوں اور اقوال میں یہی روایت زیادہ قوی ہے کہ وہ ایک یہودی تھے۔ مکہ کے سفر میں سید اشرف جہانگیر جن کا مزار فیض آباد اور بنارس کچھوچھہ میں واقع ہے اور خواجہ شمس الدین محمد حافظ شیرازی اور شاہ مدار ہم عصر تھے۔ وہ امیر تیمور صاحب قران کے ہم عصر تھے۔ کچھوچھہ ایک مقام کا نام ہے۔ مختصر یہ کہ شاہ مدار کی خاک نشینی اور تجرد کی وجہ سے شرافت کی قیود سے آزاد اور جاہل لوگ نیز مسلمانوں میں ضعیف عقیدے کے اور کم رو لوگ خصوصاً پیشہ ور رذیل جیسے سبزی فروش، جولاہے، بھٹیارے، تجارت پیشہ اور رنگریز اور اسی طرح کے لوگوں نے جو اُن کے معتقد تھے، انہیں مکن پور میں دفن کر دیا۔ بعضوں کے نزدیک اُن کی قبر حلب میں ہے اور مکن پور میں صرف حجرہ عبادت ہے لیکن یہ روایت کمزور ہے۔ مختصر یہ کہ اپنی حیات میں وہ شریعت اور متانت کی پابندیوں سے آزاد تھے اور دوسرے صوفیوں کے برعکس اُن کا کسی صوفیوں کے خانوادہ سے تعلق نہ تھا حالانکہ اہلِ شریعت اس بات کو حق نہیں سمجھتے ہیں۔ بہر حال اُن سے کسی سلسلے کا آغاز نہیں ہوا۔ لیکن عزت دار لوگوں کے سوا رذیل اور کم قدر مسلمان جوق در جوق اُن کے مزار کی پرستش کے لئے جاتے ہیں اور رذالت اور جہالت کی وجہ سے اُن کو مرتبہ میں رسول اور آئمہ اسلام سے بالاتر سمجھتے ہیں بلکہ خدا کے برابر پہنچا دیتے ہیں چنانچہ آج تک ہر سال دور دراز کی مسافتیں طے کر کے سیاہ جھنڈے اٹھائے ہزاروں مرد عورت بچے بوڑھے جوان جوق در جوق مکن پور آتے ہیں۔

اس زمانے میں جہاں تک نظر جاتی ہے چاروں طرف یہی زائرین اور نچلے طبقے کے لوگ اور اس سلسلے کے لاکھوں فقراء نظر آتے ہیں۔ کچھ پیشہ ور مسلمان اور بازاری ہندو بھی اس مجمع میں عقیدت کے ساتھ شریک ہوتے ہیں۔ اگر میرا اندازہ غلط نہیں ہے تو اس سلسلے کے مریدوں کی تعداد سکھوں کے پیشوا نانک شاہ پنجابی کے معتقدوں سے زیادہ ہی ہوگی۔ جس طرح ہر شہر کے امراء اور بازاری لوگوں میں نانک شاہ کے مرید پائے جاتے ہیں اسی طرح شاہ مدار کے مرید بھی جگہ جگہ ملتے ہیں بلکہ یہ کلیہ سا بن گیا ہے اگر کہیں اثنار راہ میں کسی جگہ فقیر کا تکیہ ملے، یہ آدمی خواہ کسی قصبہ یا دیہات کا ہو، غالب ہے کہ وہ تکیہ مداری کا ہو اور وہ فقیر شاہ مدار کا مرید ہو اور معدودے چند سنجیدہ اور صاحب علم مسلمانوں کے علاوہ اس گاؤں یا قصبے کے

تمام مسلمان چاہے بازاری ہوں یا خانہ نشین، سب شاہ مدار کے مرید اور غلام ہونگے۔ شاہ مدار کا نام بدیع الدین تھا اور عربی میں مدار کے معنی قرارگاہ کے ہیں اور نجومیوں کی اصطلاح میں ستاروں کے دورہ کرنے کی جگہ کو کہتے ہیں اور صوفیا کی اصطلاح میں یہ قطب کے مراتب میں سے ایک مرتبہ ہے۔ القصہ! شاہ مدار کی درگاہ کے مجاور روزانہ علی الصباح تیار ہو کر چاروں طرف قافلوں کے راستوں پر بیٹھ جاتے ہیں۔ جب کوئی قافلہ دور سے آتا دکھائی دیتا ہے تو دوڑ کر اُن کے قریب پہنچ جاتے ہیں۔ اگر قافلے کے لوگ مسلمان ہوئے تو انہیں اس طرح سے شاہ مدار کی زیارت کی ترغیب دیتے ہیں کہ مرتضیٰ علی علیہ السلام، حسن حسین اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سب القاب مدار صاحب ہی کے روپ ہیں۔ اگر ہندو ہوئے تو کہتے ہیں کہ رام، کنہیا جی اور بھوانی یہ سب کے سب شاہ مدار کے ہی روپ ہیں۔ آئیے اور زیارت کیجئے اور جو دل تمنا ہو یہاں مانگیئے۔ جلد ہی حاصل ہوگی۔ مکن پور نامی قصبہ ہے جہاں شاہ مدار کا مزار ہے لیکن یہ مشہور ہے کہ عقیدہ راسخ کے ساتھ شاہ مدار کی پرستش زیادہ تر پورب کے ہندوؤں میں اور خاص طور پر کائستھوں کے فرقے میں ہوتی ہے۔

قصہ مختصر! سخی سرور، شاہ مدار اور سالار مسعود غازی وغیرہ کی قبریں یکساں قسم کی ہیں جہاں ضعیف العقیدہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا اجتماع ہوتا ہے۔ یہ قبریں دنیاوی کمائی کی وجہ سے معرض وجود میں آئیں۔ ان کے ساتھ وابستہ مجاوروں کے پروپیگنڈا کی بدولت ان کی شہرت کو چار چاند لگ گئے۔ ضعیف العقیدہ لوگوں کو بھی صرف کوئی جگہ چاہیئے جہاں وہ خدا سے باغی ہو کر اپنے مقصد کو حاصل کرنے کی امید کر سکیں۔"[1]

۱۔ ماہنامہ برہان دہلی مرتبہ سعید احمد اکبرآبادی فروری ۱۹۶۳ء۔ ص ۱۱۷ - ۱۱۵
منقول از "ہفت تماشائے" مرزا قتیل ترجمہ ڈاکٹر محمد عمر استاد جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی۔

باب ۹

[illegible]

حضرت خواجہ غلام فریدؒ

حضرت خواجہ غلام فریدؒ کا روضہ کوٹ مٹھن میں واقع ہے۔ ان کے مریدوں کی تعداد صرف سرائیکی بولنے والے علاقے ہی میں لاکھوں ہے جبکہ [illegible] ان کے عقیدت مند پاکستان اور ہند میں موجود ہیں۔ حضرت خواجہ کوریجہ خاندان کے چشم و چراغ تھے اور اُن کی سیرت اور کلام پر لکھنے والوں نے انہیں فاروقی خاندان سے ظاہر کیا ہے۔ تاہم اس میں اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ کوریجہ، دھریجہ، نہریجہ، ابریجہ وغیرہ دراصل سمہ خاندان کی شاخیں ہیں اور سمہ سندھی النسل ہیں۔ شیخ صادق علی نے بھی اپنی کتاب میں کوریجہ کو سمہ خاندان کی شاخ قرار دیا ہے۔ دیگر بزرگوں کے حالات تحریر کرنے والوں کی مانند یہاں بھی غلو کرنے والوں نے بزرگی کا رتبہ دینے کی غرض سے شجرہ نسب میں فاروقی ظاہر کیا ہے۔ کسی شخص یا فرد کا غیر عرب ہونا اس کے لئے باعث تحقیر نہیں کیونکہ اسلام میں ذات پات کا تصور نہیں۔ بلکہ اسلام مساوات انسانیت کا داعی ہے۔ مسلمانوں میں موجودہ ذات پات کی جتھے بندیاں ہندوانہ ورثہ ہے۔ اسلام میں قوم، قبیلہ اور خاندان صرف پہچان کے لئے ہیں اور بزرگی کسی خاص قومیت کے ساتھ مخصوص نہیں۔ اسلام قوم و قبیلہ اور رنگ و نسل کے باطل تصور کو مٹانے کے لئے آیا تھا۔ رسولِ اکرمؐ نے فتح مکہ کے موقع پر طواف کعبہ کے بعد فرمایا "شکر ہے اس خدا کا جس نے تم سے جاہلیت کا عیب اور اس کا تکبر دور کر دیا۔ لوگو! تمام انسان بس دو ہی حصوں میں تقسیم ہوتے ہیں۔ ایک نیک اور پرہیزگار جو اللہ کی نگاہ میں عزت والا ہے اور دوسرا فاجر و شقی جو اللہ کی نگاہ میں ذلیل ہے ورنہ سارے انسان آدم کی اولاد ہیں اور اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا" (ترمذی، بیہقی)۔ پھر حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا "لوگو! خبردار رہو، تم سب کا خدا ایک ہے۔ کسی عرب کو عجمی پر اور کسی عجمی کو کسی عرب پر اور کسی گورے کو کالے پر اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر کوئی فضیلت حاصل نہیں مگر تقویٰ کے اعتبار سے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے"۔ ایک اور موقع پر ارشاد نبوی ہے "تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے پیدا کئے گئے تھے۔ لوگ اپنے آباؤ اجداد پر فخر کرنا چھوڑ دیں ورنہ

اسی طرح سے ؎

ہوتاں پنل لسایا ۔ تترڑی دا دل ڈکھایا

میں ہوتاں نامی نزنکی لڑکی سے محبت کی داستان چھپی ہوئی ہے ۔

آپ کا روضہ کوٹ مٹھن میں واقع ہے جہاں ہر سال عرس اور میلہ لگتا ہے اور مرید دور دراز کا سفر طے کرکے حاضری دیتے ہیں ۔ خواجہ صاحب کا دیوان سرائیکی زبان کا لازوال شاہکار ہے ۔

حضرت خواجہ سلیمانؒ تونسوی

حضرت خواجہ سلیمان تونسوی کے والد کا نام خواجہ زکریا اور والدہ محترمہ کا اسم گرامی بی بی زلیخا تھا ۔ بچپن میں آپ کو پیار سے مانہ کے نام سے پکارا جاتا تھا ۔ آپ ۱۱۸۳ھ مطابق ۱۷۶۹ء کوہستان گڑگڑجی میں پیدا ہوئے ۔ خواجہ زکریا قبیلہ جعفر سے تعلق رکھتے تھے ۔ والد کی وفات پر آپ بچپن میں یتیم ہو گئے اور والدہ کو سخت مصائب کا سامنا کرنا پڑا ۔ آپ نے حاجی صاحب کے درس میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور کھانا وغیرہ بھی اُن کے ہاں سے کھاتے تھے ۔ حاجی صاحب نے اُن کو ہدایت کی کہ مزید تعلیم کے لئے وہ تونسہ جائیں ۔ تونسہ میں آکر انہوں نے میاں حسن علی کے حلقۂ درس میں شمولیت اختیار کی ۔ پھر وہاں سے بستی لانگہ میں میاں ولی محمدؒ ارائیں کے حلقۂ درس میں شامل ہو گئے ۔ کوٹ مٹھن میں مدرسۃ العلوم تھا جس کے صدر مدرس قاضی احمد علی صاحب تھے ۔ اُن سے عربی کی تعلیم حاصل کی ۔ پھر خواجہ نور محمد مہاروی کے مرید ہوئے ۔ تونسہ میں رہائش اختیار کر کے لوگوں کو روحانی فیض پہنچاتے رہے ۔ آپ کو جس قدر آمدنی ہوتی اُسے خیرات کر دیتے ۔ ۱۲۶۷ھ میں پوراسی برس کی عمر میں انتقال فرمایا اور تونسہ میں دفن ہوئے جسے انہوں نے ۱۲۰۹ھ سے اپنا وطن بنا لیا تھا ۔ اُن کے فرزند خواجہ گل محمدؒ نے اُن کی حیات میں وفات پائی لہٰذا آپ کے بعد اُن کے پوتے خواجہ اللہ بخش سجادہ نشین بنے ۔ آپ عموماً پیر پٹھان کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں ۔

نواب بہاولپور اُن کا مرید تھا ۔ اُس نے ۱۲۷۲ھ/۱۸۵۵ء میں پچاسی ہزار روپے کے خرچ سے آپ کا روضہ تعمیر کرایا ۔ غلام مصطفٰے خان خاکوانی ملتانی نے دس ہزار روپے کے خرچ سے خانقاہ کے ملحقہ مجلس خانہ تعمیر کرایا ۔ جبکہ احمد خان افغان نے کنواں تیار کرایا ۔ آپ کا سالانہ عرس ماہ صفر میں منایا جاتا ہے جو تین دن جاری رہتا ہے ۔ خانقاہ کے ملحقہ مدرسہ میں درس کا اعلیٰ انتظام ہے ۔ اس مدرسہ میں اعلیٰ درجہ کی لائبریری موجود ہے جس میں نہایت قیمتی کتب موجود ہیں ۔ وہاں قرآن مجید کا ایک نسخہ موجود ہے جو سونے کے تاروں سے لکھا گیا ہے ۔

زندہ پیر

کوہ سلیمان میں شادن لنڈ سے مغرب میں ایک گرم پانی کا چشمہ ہے جس میں گندھک ملی ہوئی ہے چونکہ گندھک بذاتِ خود جلدی امراض کے لئے نہایت شافع ہے لہٰذا جلدی امراض کے لوگ بڑی کثرت سے وہاں جاتے ہیں ۔ وہاں کسی بزرگ کا مقبرہ وغیرہ نہیں ہے ۔ صرف ایک کمرہ چشمے کے کنارے بنا ہوا ہے ۔

جس کے اندر پلنگ پر قرآن مجید رکھے ہیں۔ لوگ چشمے میں غسل کرکے واپس آجاتے ہیں۔ اس ابلتے ہوئے تالاب کے بیرونی کناروں پر مچھلیاں تیرتی نظر آتی ہیں۔ یہ گرم پانی کی طرف ہرگز نہیں جاتیں۔

پیر عادل آپ کا اصلی نام سید سلطان تھا۔ اُن کے بیٹے سید علی نے ایک چرواہے کو بے گناہ قتل کر دیا۔ مقتول کی والدہ آپ کے پاس فریادی ہوئی اور انہوں نے اپنے بیٹے کو قصاص میں چرواہے کی ماں کے سپرد کر دیا جس نے اُسے انتقاماً قتل کر دیا۔ اس سے وہ پیر عادل مشہور ہوئے۔ اپنے بیٹے کی وفات کے بعد وہ چھبیس[۲۶] برس زندہ رہے اور 465ھ/1072ء میں وفات پائی۔

کہا جاتا ہے کہ نواب غازی خان میرانی اُن کا مرید تھا جس نے ایک لاکھ روپے کے خرچ سے ۹۱۶ھ/۱۵۱۱ء میں خانقاہ تیار کرائی۔ دو آہنی نقارے بھی خانقاہ کو دیئے۔ یہاں بھی سالانہ عرس اور میلہ لگتا ہے۔ خانقاہ کی تعمیر کا سن صحیح معلوم نہیں ہوتا کیونکہ خاندان میرانی کا عروج ۱۴۹۰ء میں شروع ہوا اور یہ امر وثوق سے کہا جا سکتا ہے کہ یہ تعمیر غازی خان اول کی بھی نہیں ہے جو ۱۴۶۶ء تا ۱۴۹۴ء ڈیرہ غازی خان کا حاکم رہا۔ پھر خانقاہ کی عمارت بھی معمولی سی ہے جس پر اُس دور میں ایک لاکھ روپیہ خرچ نہیں ہو سکتا۔

ایک اور روایت آپ کی آمد از بغداد مطابق 439ھ سے مختلف بیان کی گئی ہے۔ اس کی رو سے اس علاقے میں آمد نویں صدی ہجری میں مشہد سے ہوئی۔ اگر پہلی روایت کو صحیح تسلیم کیا جائے تو اس دور میں اس علاقے پر قرامطہ کا قبضہ تھا اور بعض شواہد پہلی روایت کے حق میں بھی ہیں۔ عوام میں مشہور ہے کہ انہوں نے کفار سے زبردست جنگ کی اور اُن کے سپہ سالار کی خانقاہ قصبہ لاڈن کے قریب جھنڈا پیر کے نام سے موسوم ہے کیونکہ لشکر کا جھنڈا اُن کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ انہوں نے قرامطہ کے خلاف جنگ میں عملی حصہ لیا۔ اس دور میں ملتان کا علاقہ قرامطہ کے قبضہ میں تھا۔ محمد غوری نے 571ھ/1175ء میں ملتان پر قبضہ کیا اور قرامطہ کو شکست دی۔ جانوروں میں جب "منہ کھر" کی بیماری پھیلتی ہے تو مقامی لوگ اپنے مویشی جھنڈا پیر کے قبرستان میں لے جاتے ہیں۔ اس قبرستان اور ملحقہ کھیتوں کی زمین نہایت شور زدہ اور کلراٹھی ہے یہ مویشیوں کی بیماری میں فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ عوام کا اعتقاد ہے کہ یہ شفا اس بزرگ کی دعا سے ہے۔

سخی سحاب رح ہڑند سے مغرب میں درہ کاہا کے اندر ایک خانقاہ ہے جس کو سخی سحاب کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ بعض لوگ اسے عاشق اصحاب بھی کہتے ہیں۔ عوام میں یہ مشہور ہے کہ یہ خانقاہ حضرت خالد بن ولید کی ہے جو سراسر غلط ہے کیونکہ انہوں نے مدینہ منورہ میں وفات پائی تھی اور وہاں دفن ہوئے۔ ویسے بھی ا

1- A Glossary of tribes and Castes in Punjab & NWFP vol. I P. 599 ed. 1919 H.A. Rose.

دور میں یہ علاقہ اسلامی سلطنت سے باہر تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صاحب مقبرہ کسی پیر یا بزرگ کے خلیفہ یا مرید تھے جو سحاب زبادل) کے نام سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔

اسی خانقاہ کے مشرقی جانب ایک بڑا پتھر ہے جس میں عربی اور کسی غیر معروف زبان میں تحریریں موجود ہیں۔ پہاڑی لوگ اسے قرآن کھو کے نام سے پکارتے ہیں کیونکہ انہوں نے اسے قرآن مجید کی کوئی آیت سمجھا ہے۔ بلوچ رزمیہ دور میں اس پتھر پر حلف لیتے تھے اور مشہور تھا جو حلف لینے کے بعد دغا کرے یہ اس پر لعنت کرنے والا پتھر ہے۔ یہ عربی تحریر سلطان شمس الدین التمش کے کسی فوجی کی تحریر ہے جو شاید قباچہ کے ساتھ جنگوں کے دوران یہاں سے گزرا۔ یہ تحریر محکمہ آثار قدیمہ کے ریکارڈ پر درج کر دی گئی ہے۔

خواجہ نور محمد نارو والا حاجی پور

خواجہ نور محمد ۱۱۳۴ھ / 1721ء میں پیدا ہوئے۔ ملتان میں ۱۱۴۸ھ تا ۱۱۵۰ھ تعلیم حاصل کی اور حاجی پور میں سکونت اختیار کر کے عبادت و ریاضت میں مشغول ہو گئے۔ چونکہ آپ نارو والا نزد سکھانی والا میں رہے لہٰذا نارو والا مشہور ہوئے۔ آپ پر ہار خاندان (راجپوت) کے چشم و چراغ تھے۔ آپ تئیس سال کی عمر میں میاں صاحب نور محمد مہاروی والی کے مرید ہوئے۔ انہوں نے ۱۲۰۵ھ مطابق ۱۷۹۰ء میں بعمر ستر سال انتقال فرمایا۔ ان کا مقبرہ اسلام خان حافظ پورہ نے تعمیر کرایا جو نواب بہاولپور کا چچا تھا۔ اس مقبرہ کے شمالی، جنوبی اور مغربی اطراف میں دروازے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مولوی عزیز اللہ جو خواجہ صاحب کے مرید تھے ایک مرتبہ مشکلات میں پھنس گئے۔ ایک رات وہ روضہ کے اندر گئے اور عبادت میں مصروف ہو گئے۔ اچانک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جنوبی دروازے سے داخل ہوئے۔ اس دیدار کے بعد مولوی مذکور کی تمام مشکلات دور ہو گئیں۔ اب اس دروازے کو بہشتی دروازہ کہا جاتا ہے یہ دروازہ سارا سال بند رہتا ہے۔ صرف دو ایام یعنی ۶ اور ۷ محرم الحرام کو زائرین کے لیے کھولا جاتا ہے۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ اس دروازے سے گزرنے والے کے تمام گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ یہ دراصل قدیم مذاہب از قسم دھرتی دھرم کی باقیات میں سے ایک اعتقاد ہے۔ قدیم دور سے انسان کا اعتقاد رہا ہے کہ شکم مادر سے نکلنے کے وقت انسان گناہوں سے پاک و صاف ہوتا ہے لہٰذا جب وہ کسی تنگ دروازے یا کھڑکی سے گزرتا ہے تو ذہنی طور پر اسے اعتماد ہوتا ہے کہ وہ پیدائش کا مرحلہ طے کر کے گناہوں سے پاک ہو جاتا ہے۔ اسی نظریے کے تحت عیسائیوں کے گرجے کے دروازے اور کھڑکیاں بعضوی صورت کے بنائے جاتے ہیں تاکہ گرجا کے اندر داخل ہونے والے ماں کے بطن سے پیدا ہونے کے وقت کی طرح گناہوں کی آلودگی سے صاف ہو جائیں۔

تنگ جگہ سے ثواب کی خاطر گزرنا صرف پاک پتن اور حاجی پور کی کھڑکیوں تک ہی محدود نہیں بلکہ لوگ ہر تنگ جگہ سے گزر کر سہل الحصول ثواب حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ ڈیرہ اسماعیل خان کورٹ کے چھوٹے سڑک پر ایک بڑا جنڈ کا درخت تھا۔ زمین اور بڑے درخت کے درمیان تھوڑی سی خالی جگہ رہ گئی تھی جس سے انسان بمشکل گزر سکتا تھا۔ اس تنگ جگہ سے گزرنے والوں کا

سارا دن تا شام بند رہتا تھا۔ اسی طرح سے ایک اور واقعہ مؤلف بھی نظر انداز نہیں کر سکتا جو اس وقت گزرا جب اپنے لڑکے لڑکیوں کو لیجا رہا تھا۔ جھوک اترا کی طرف جاتے ہوئے بر لب سڑک ایک نلکے سے پانی پینے لگے۔ وہاں سے چند عورتیں گزریں۔ بد قسمتی سے ٹرالی کے سامنے والے حصے پر زیبائش کی خاطر ایک گول چکر بنا ہوا تھا جس میں سے انسان بمشکل گزر سکتا تھا۔ ان عورتوں نے منت سماجت کی کہ انہیں اس چھلے میں سے گزرنے دیا جائے۔ انہیں بہت کچھ سمجھایا گیا مگر وہ بدستور اپنے ارادے میں اٹل رہیں اور بحالت مجبوری اپنے دوپٹے ہمارے پاؤں پر ڈالنے لگیں۔ آخر مجبوراً ان کو اجازت دی گئی اور وہ چھلے سے گزر کر خوش خوش اپنے راستے پر ہو لیں۔

خواجہ نور محمدؒ کی وفات پر مولوی نور محمد بریڑہ اور مولوی ابوبکر احمدانی اُن کے خلیفہ مقرر ہوئے۔

الحاج شیخ محمود خان احمدانی آڑہ جعفر

آپ احمدانی خاندان کے چشم و چراغ تھے جو کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے۔ آپ بڑے متوکل اور متشرع بزرگ تھے۔ اپنی روزی حلال طریقے سے کماتے تھے کیونکہ فرمان نبوی ہے کہ رزق حلال کمانا عبادت ہے اور آپ اس پر عمل پیرا تھے۔ معتقدوں سے کوئی چیز حاصل کرنا عیب اور گناہ تصور کرتے تھے۔ میاں عبدالکریم کے ہمراہ حج بیت اللہ کیا۔ انہوں نے حاجی محمد اکرم کی بیعت کی جن کا روضہ جھوک اترا کے قریب ہے۔

تارن امام

راجن پور کے قریب دریائے سندھ کی ایک شاخ سے ڈھنڈہ (جھیل) بن گئی تھی جس کو تارن امام کا نام دیا گیا تھا۔ اس مقدس جھیل کی بڑی عزت و توقیر کی جاتی تھی اور ہزاروں زائرین ہندو اور مسلمان زیارت کے لیے آتے تھے۔ پھر دریا کے رخ بدلنے کی وجہ سے یہ جھیل معدوم ہو گئی۔

لعل گیر

تارن امام جھیل کی مانند ایک اور مقدس ڈھنڈہ ڈیرہ غازی خان کے پرانے شہر کے قریب تھی جو بابا لعل گیر کے نام سے مشہور تھی۔ اس جگہ پر ایک تناور بڑ کا درخت تھا جس کے نیچے زائرین جمع ہوتے تھے۔ یہ درخت ۱۸۹۵ء تک موجود رہا پھر سب کچھ دریا برد ہو گیا۔

پیر شریف شاہ

آپ سید شریف شاہ کا روضہ نہر شوریہ کے بائیں کنارے پر گیدڑ والا اور دری میرو کے درمیان واقع ہے۔ جب ڈیرہ غازی خان کہنہ آباد تھا تو یہاں پر جون کے مہینے میں خوب میلہ لگتا تھا۔ کئی انگریز افسران بھی وہاں مل کر پالیں لگاتیں اور عوام کے مسائل حل کرتے۔ شہر ڈیرہ غازی خان کہنہ کی بربادی کی وجہ سے اس کی رونق بہت کم ہو گئی ہے۔

خواجہ محمد عاقل راجن پور

آپ کا روضہ کوٹ مٹھن کے پرانے شہر میں تھا۔ جب دریائے سندھ نے کوٹ مٹھن کو برباد کرنا شروع کیا تو ان کا تابوت نکال کر موجودہ جگہ پر دفن کیا گیا۔ خواجہ محمد عاقل اپنا شجرہ نسب عباس علی صاحب سے ملاتے تھے جو خراسان سے نقل مکانی کر کے سندھ میں آباد ہوئے۔

یہاں سے محمدؐ شریف صاحب ۱۰۹۰ھ مطابق 1679ء اس جگہ پر تشریف لائے۔ مسٹر ایچ اے روز نے اُن کا شجرہ نسب حسب ذیل دیا ہے۔[1]
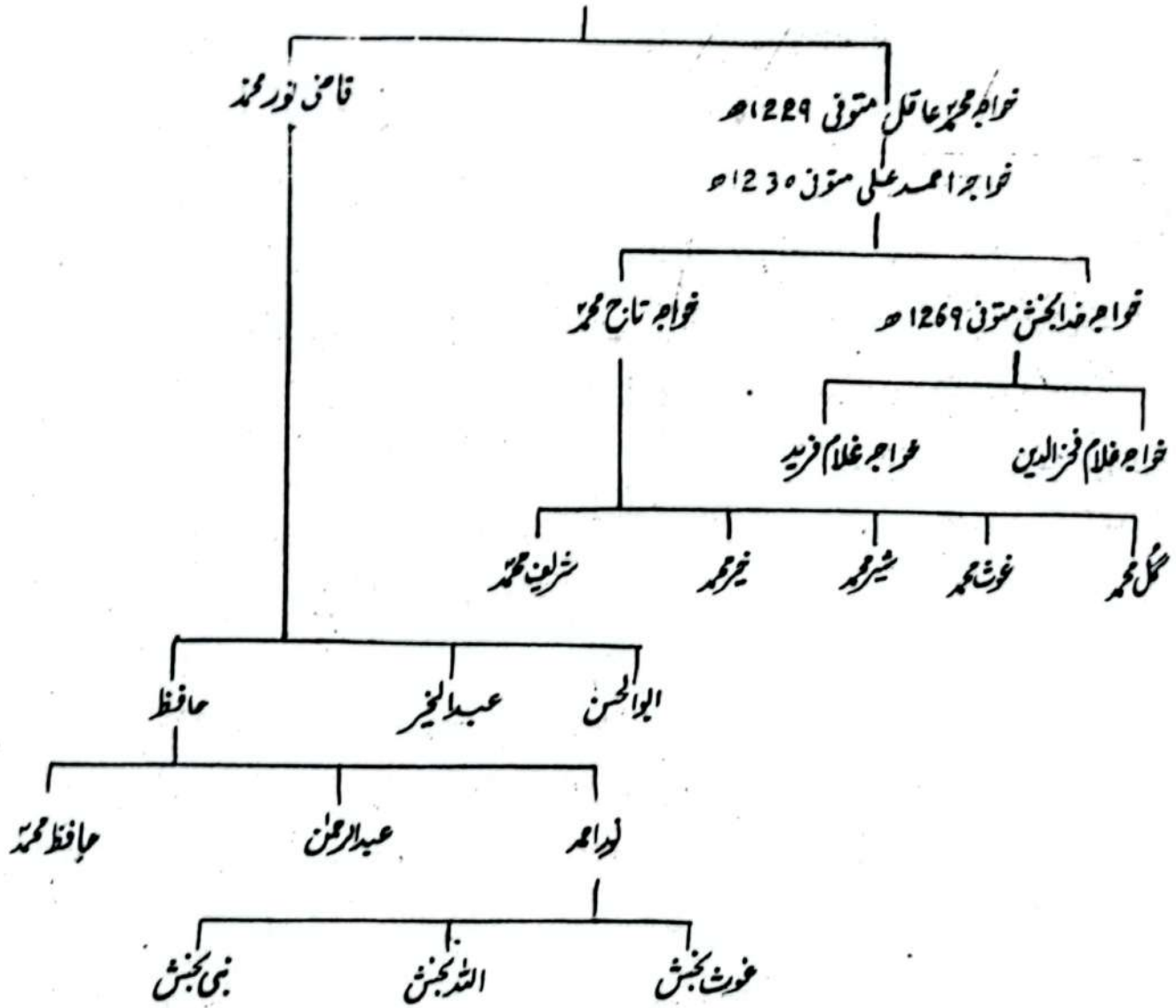
شاہ صدر دینؒ آپ کا روضہ ڈیرہ غازی خان سے انیس میل جانب شمال شاہراہ تونسہ پر واقع ہے۔ آپ حضرت بہاء الدین زکریا ملتانی کے مرید اور اُن کے خاندان سے تھے۔ اُن کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اُن کا عرس ماہ چیت میں لگتا ہے۔ اُن کا موجودہ روضہ ایک ہندو مرید نے بنوایا تھا جس نے اولاد کی منت مانی تھی۔

---

1 A glossary of Tribes and castes of Punjab and NWFP Vol. I P. 599 H. A. Rose

خواجہ نور محمد مہاروی

آپ کھرل پوانزدا راجپوت اگھرانے کے چشم و چراغ تھے۔ آپ کی ولادت 1729ء مطابق 1142ہجری شہر فرید علاقہ بہاولپور میں ہوئی۔ انہوں نے خلافت مولانا فخر الدین محب النبی دہلوی سے حاصل کی۔ وہ اپنے مریدوں میں عموماً قبلہ عالم مشہور تھے۔ اُن کے چار خلفا تھے۔ خواجہ نور محمدؒ ثانی حاجی پور والے، قاضی محمد عاقل مٹھن کوٹ، حافظ جمال ملتانی اور خواجہ محمد سلیمان تونسوی۔ ان کے علاوہ کئی مریدوں کی گدیاں بڑی نامور ہوئی ہیں جن میں جناب محمد اکبر رانیاں (ضلع سرسہ)، مخدوم سید محمود سیت پور اور محب جہانیاں شہر سلطان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ آپ چشتیہ سلسلہ سے تعلق رکھتے تھے اور اُن کا اثر جنوب مغربی پنجاب پر بڑا وسیع تھا۔

روضہ میاں پھیرو و میاں طیب

یہ دونوں بزرگ احمدانی خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور آپس میں قریبی رشتہ دار تھے۔ میاں پھیرو کا مدفن کوٹ جانوں کے مشرق میں برلب سڑک جرنیل موجود ہے جبکہ میاں طیب موضع بکھرواہ اور درخواست جمال خان کے مقامِ اتصال پر واقع ہے۔ یہ دونوں بزرگ باشریعت صوفی تھے اور اپنی روزی کاشتکاری سے حاصل کرتے تھے۔ کسی فرد سے کچھ لینا عار سمجھتے تھے۔ انہوں نے گجروں کا دورِ حکومت پایا۔

مُلا قائد شاہؒ

عوام انہیں مقلائیت شاہ کے نام سے جانتے ہیں اور آپ کا مقبرہ غازی خان کے مقبرے کے قریب واقع ہے۔ اُن کے قتل کا مفصل حال پہلی جلد میں دیا جا چکا ہے۔ لوگوں میں یہ غلط عقیدہ ہے کہ آپ کے روضے کا سایہ غازی خان کے مقبرے پر نہیں پڑتا۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ دونوں مقبرے ایک دوسرے سے ایسے زاویے پر موجود ہیں کہ اصولی طور پر اُن کا سایہ ایک دوسرے پر پڑ نہیں سکتا۔ لوگوں نے خود اعتقادی اور حصولِ دولت کی غرض سے ایسا مشہور کر رکھا ہے۔ جس غازی خان (کیونکہ غازی خان آٹھ حکمرانوں کا لقب تھا) کے وقت یہ حادثہ ہوا تھا وہ غازی خان ہشتم تھا جو حیدرآباد (سندھ) میں غلام شاہ کلہوڑہ کی قید میں فوت ہوا۔ یہ مقبرہ غازی خان اول کا ہے جو 1486ء میں فوت ہوا۔
غازی خان ہشتم (آخری) نے 1772ء میں حیدرآباد میں وفات پائی اور وہیں دفن ہوا۔

حاجی محمدؒ اکرمؒ

آپ ڈمے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ آپ نے ریاضت اور دینی خدمت میں نام پایا۔ آپ کا روضہ چوک اترا کے مشرق میں واقع ہے۔ آڑہ جعفر کے [illegible] بزرگ آپ کے مرید تھے۔

میاں طیبؒ سلطانؒ قریشی

ہڑند سے تھوڑے فاصلے پر بستی میاں پناہ علی قریشی (تنگیہ) میں آپ کا روضہ ہے۔ اُن کی نیکی، پارسائی اور باشریعت عالم کی وجہ سے بڑی شہرت تھی۔ انہوں نے علاقے میں اسلام کی بڑی خدمت کی۔ اُن کے مُرید بہت بڑی تعداد میں سندھ میں موجود ہیں۔ سید عبداللہ شاہ سمینہ آپ کے مرید تھے۔

مسن شاہ اور لعل پروانہ

آپ کے روضے جامپور میں ہیں۔ مسن شاہ کا روضہ مشرق طرف اور لعل پروانے کا شہر کے مغرب میں واقع ہے۔

روضہ حضرت دائرہ دین پناہ رہ آپ کا اصلی روضہ کوٹ ادو سے جانب شمال آٹھ میل کے فاصلے پر موجود ہے۔ جب آپ نے انتقال فرمایا تو دفن کے معاملہ میں اختلاف پیدا ہو گیا۔ آپ کے کچھ مریدوں نے آپ کے پلنگ اور دیگر زیر استعمال اشیاء کو دفن کر کے روضہ تعمیر کر لیا اور آمدنی کا ذریعہ بنا لیا۔ یہ روضہ (اگر ایسا کہا جائے) شہر دائرہ دین پناہ کے سامنے دریائے سندھ کے مغربی کنارے پر واقع ہے۔ یہ روضہ کئی بار دریا برد ہوا ہے۔

ویسے یہاں یہ بیان کر دینا بے جا نہ ہوگا کہ یار لوگوں نے اللہ کا خوف کئے بغیر فرضی قبریں کھڑی کر کے دولت کمانے کا ذریعہ بنا لیا۔ جب راقم الحروف فتح جنگ میں ملازمت کے سلسلہ میں تعینات تھا تو ایک فتح جنگ کی سڑک کے کئی خوفناک موڑوں کو درست کیا گیا۔ ایک ایسا موڑ فتح جنگ کے بالکل قریب تھا۔ اس بچی ہوئی جگہ پر ایک روز جھنڈا لگ گیا۔ پھر جھاڑو دینے کا سلسلہ جاری ہوا اور پھر چار دیواری تعمیر کر دی گئی۔ پھر ہر جمعرات کو چراغاں ہونے لگا اور پھر روضہ تعمیر ہو گیا۔ یہ سارا کام صرف چھ ماہ میں پورا ہوا اور جاہل عوام زیارت کے لئے کثیر تعداد میں آنے لگے۔ اس مکروفریب کے بانی کو کافی آمدنی ہونے لگی تو ہر موڑ پر اس کی دیکھا دیکھی جھنڈے لگ گئے اور ایک لڑکا جھنڈا لئے سارے دن وہاں سے گزرنے والوں سے پیسے مانگتا رہتا۔

پیر محمد غوری رہ موجودہ شہر ڈیرہ غازی خان سے چند میل مشرق میں پیر محمد غوری کا مقبرہ ہے۔ بعض لوگوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ یہ روضہ برصغیر کے حاکم محمد غوری کا ہے جو صحیح نہیں۔ محمد غوری کو ضلع جہلم میں دھمیک نامی قصبہ کے قریب قتل کر دیا گیا تھا۔ قاتلوں کے متعلق گمان کیا جاتا ہے کہ وہ گکھڑ تھے مگر بعض مورخ اس امر سے اختلاف کرتے ہوئے اس جرم کا الزام قرامطہ پر لگاتے ہیں جو خفیہ طور پر اس کے لشکر اور محافظوں میں شامل ہو گئے تھے محمد غوری کی میت کو ہمعصر مورخوں کی رو سے غزنی میں دفن کیا گیا۔ یہ ویسے بھی بڑا عجیب معلوم ہوتا ہے کہ دھمیک ضلع جہلم سے میت کو لا کر ایسی غیر معروف سی جگہ پر دفن کیا جائے۔ اگر انہوں نے دفن کرنے کے لئے یہ سرزمین (ہند) منتخب کر لی تھی تو وہ دھمیک ہی ہو سکتی تھی۔ دراصل یہ صرف نام کی مشابہت ہے۔ یہ صاحب روضہ کوئی اور بزرگ ہیں جو علاقہ غور (افغانستان) سے آمد کی وجہ سے اپنے وطن کی نسبت سے غوری کہلائے۔

سید لورنگ شاہ رہ آپ کا روضہ اس وقت شہر ڈیرہ غازی خان کے شمال میں واقع ہے: اس سے پہلے آپ کا روضہ پرانے شہر ڈیرہ غازی خان کے شمال مغربی طرف متصل سرکاری ہسپتال تھا۔ جب دریائے سندھ نے شہر کو تاراج کرنا شروع کیا تو آپ کی خانقاہ کے متولیوں نے تابوت کو نکال کر موجود جگہ پر دفن کیا۔ ان کی شہرت کا سبب حضرت سخی سرور کی خانقاہ پر بارہ سال تک جاروب کشی اور چلہ کشی ہے

سید عبداللہ شاہ سمینہ آپ کا روضہ قصبہ سمینہ میں واقع ہے جو موجودہ شہر ڈیرہ غازی خان سے دس کلو میٹر کے فاصلے پر بجانب مشرق آباد ہے۔ جب بلاکو خان نے

بغداد کو غارت کیا تو سادات گیلانی کا ایک گھرانہ وارد ہندوستان ہوا۔ اس خاندان کا سربراہ سید محمد غوث تھا۔ پہلے وہ دہلی میں رہے مگر پھر دکن میں آباد ہوئے۔ انہوں نے اپنے زہد و تقویٰ کی بدولت سید محمد غوث بندگی کے نام سے شہرت حاصل کی۔ اُن کے ایک فرزند سید احمد شاہ اُچ میں مقیم ہوئے۔ سید احمد شاہ کے فرزند سید لعل شاہ نے بغداد میں تعلیم حاصل کی اور عرب ممالک کی سیاحت بھی کی۔ واپسی وطن کے وقت ہڑند ضلع ڈیرہ غازی خان میں وارد ہوئے۔ اس زمانے میں ہڑند بڑا مشہور تجارتی اور علاقے کا صدر مقام تھا۔ ہڑند سے مغرب میں قصبہ میاں پناہ علی قریشی موجود ہے۔ وہاں اُس زمانے میاں سلطان طیب قریشی کے زہد و تقویٰ کی بڑی دھوم تھی۔ انہوں نے اپنی صاحبزادی کا نکاح لعل شاہ سے کر دیا جس سے عنایت شاہ پیدا ہوئے۔ لعل شاہ نے تبلیغ کے سلسلہ میں دکن کا سفر اختیار کیا۔ وہاں کسی حاسد نے اُن کو زہر دے کر ہلاک کر دیا اور وہ احمد آباد میں مدفون ہوئے۔ میاں سلطان طیب قریشی کے انتقال کے بعد عنایت شاہ کی پرورش اُن کے ماموں نے کی۔ عنایت شاہ نے ۱۷ رمضان ۱۱۹۵ھ میں وفات پائی۔ عنایت شاہ نے دو فرزند سید غلام محمد شاہ اور سید عبداللہ شاہ اپنی یادگار چھوڑے۔ غلام محمد شاہ کا مزار نوشہرہ نزد داجل میں ہے جبکہ حضرت سید عبداللہ شاہ کا مزار سمینہ میں ہے۔ سمینہ کا ایک رئیس آپ کو سمینہ میں لایا اور یہاں آپ نے درس و تدریس اور تبلیغ کے لئے مسجد اور درس گاہ قائم کی۔ آپ صاحب کرامات بزرگ تھے۔ "روایات پنجاب" مصنفہ میجر ٹمپل میں آپ کی کرامات کی کئی کہانیوں میں سے ایک میں ذکر ہے کہ کس طرح اپنی کرامات سے جام پور کے موچی کی بیوی کو قلات سے معجزانہ طور پر واپس لائے جسے خان قلات جام پور کی فتح کے بعد اپنے ہمراہ لے گیا تھا۔ آپ نے 1222ھ مطابق 1807ء میں وفات پائی۔ اُن کے مریدوں کی تعداد لاکھوں تک پہنچتی ہے جو پنجاب، سندھ اور بلوچستان میں پھیلے ہوئے ہیں۔ انہوں نے شاہ محمد، حافظ حبیب اللہ شاہ، سلطان محمد شاہ اور انور حسن شاہ اپنی یادگار چھوڑے۔ آج کل اس خانوادہ میں سے سید محمد غوث ولد سید نور محمد شاہ جو سمینہ میں تاحال مقیم ہیں، اسلامی درس و تدریس کی طرف توجہ دے رہے ہیں۔ مؤلف اُن کا مشکور ہے کہ انہوں نے معلومات جمع کرنے کے سلسلے میں بڑا تعاون کیا۔ انہوں نے حدیقۃ الابرار وغیرہ فراہم کر کے سید عبداللہ شاہ کے خاندان کے متعلق معلومات فراہم کیں۔

باب ۱۰

زبانیں اور اُن کے رسم الخط کا ارتقا

ضلع ہذا کی عوامی زبان بلوچی اور سرائیکی ہیں۔ بلوچی زبان بولنے والے ضلع کی مغربی سمت یعنی کوہ سلیمان اور اُس کے دامن کے علاقے میں آباد ہیں جبکہ مشرقی طرف سرائیکی بولی جاتی ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل روزگار اور ملازمت کے سلسلے میں آنے والے کچھ لوگ پشتو اور پنجابی بھی بولتے تھے۔ افغان پوندے جو ہر موسم سرما میں یہاں آتے تھے اُن کی زبان پشتو ہوتی تھی مگر وہ مقامی زبانیں بول اور سمجھ سکتے تھے۔ اردو کو تقریباً تمام لوگ سمجھ لیتے جبکہ انگریزی دفتری زبان تھی اور اب بھی ہے۔

بلوچی بلوچی زبان بظاہر بگڑی ہوئی فارسی معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت میں یہ ایک علیحدہ زبان ہے۔ جارج ابراہام گریرسن کی رو سے بلوچی زبان کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے۔

باب ۱۰

زبانیں اور اُن کے رسم الخط کا ارتقا

ضلع ہذا کی عوامی زبان بلوچی اور سرائیکی ہیں۔ بلوچی زبان بولنے والے ضلع کی مغربی سمت یعنی کوہ سلیمان اور اُس کے دامن کے علاقے میں آباد ہیں جبکہ مشرقی طرف سرائیکی بولی جاتی ہے۔ قیام پاکستان سے قبل روزگار اور ملازمت کے سلسلے میں آنے والے کچھ لوگ پشتو اور پنجابی بھی بولتے تھے۔ افغان پوندے جو ہر موسم سرما میں یہاں آتے تھے اُن کی زبان پشتو ہوتی تھی مگر وہ مقامی زبانیں بول اور سمجھ سکتے تھے۔ اردو کو تقریباً تمام لوگ سمجھ لیتے جبکہ انگریزی دفتری زبان تھی اور اب بھی ہے۔

بلوچی بلوچی زبان بظاہر بگڑی ہوئی فارسی معلوم ہوتی ہے مگر حقیقت میں یہ ایک علیحدہ زبان ہے۔ جارج ابراہام گریرسن کی رو سے بلوچی زبان کا شجرہ نسب حسب ذیل ہے۔
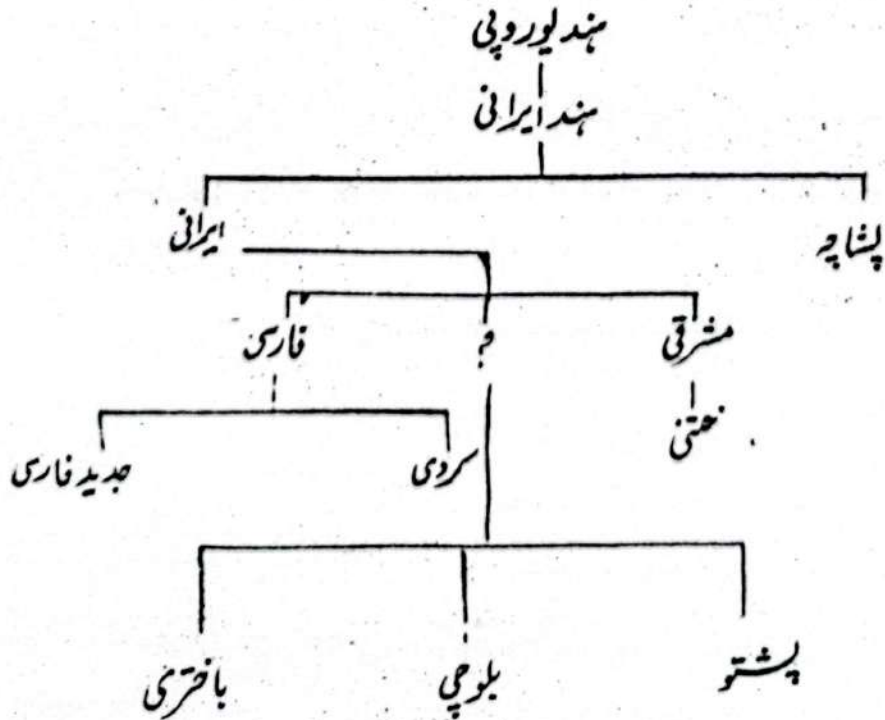
اس نسب نامہ سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ بلوچی، پشتو اور فارسی زبانوں کی ماں کون سی زبان تھی تاہم یہ واضح ہے کہ بلوچی بگڑی ہوئی فارسی نہیں بلکہ فارسی سے بہت زیادہ قدیم اور مستقل زبان ہے۔ لانگ ورتھ ڈیمز کی رو سے، بلوچی ایک ایرانی زبان ہے اور یہ اُس کی مشرقی شاخ سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ لبعض معاملات میں اوستا کی قدیم فارسی سے مشابہت رکھتی ہے۔[۱] پروفیسر جی۔ مورگن سٹرین کو البتہ اس سے اختلاف ہے اور اسے مغربی ایرانی زبانوں کے سلسلے کی زبان قرار دیتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں "یہ ایک ایرانی زبان ہے لیکن ہر چند یہ اب ایران کے مشرقی علاقے میں بولی جاتی ہے لیکن یہ مشرقی ایرانی زبانوں سے واسطہ نہیں رکھتی اور نہ پشتو سے اس کا کوئی خاص تعلق ہے جو اس کی قریبی ہمسایہ زبان ہے۔ یہ یقینی طور پر ایک منفرد اور جدا زبان ہے بصرف ونحو اور صوتیاتی نشوونما اور ارتقا کے لحاظ سے یہ اصلاً مغربی شاخ سے تعلق رکھتی ہے۔" اس نظریے کی تصدیق بلوچوں کی قدیم روایات سے بھی ہوتی ہے کیونکہ اُن کی روایات کی رُو سے وہ شام کی اطراف[۲] سے نقل مکانی کرکے مشرقِ ایران میں وارد ہوئے۔ قدیم دور میں ایران کی مشرقی سرحد دریائے سندھ تک تھی۔ شام بھی اُس کا ایک صوبہ تھا جس کی سرحدیں ہمیشہ بدلتی رہی ہیں۔ بلوچی، کردی اور پشتو کے کچھ الفاظ تقابل کے لئے درج ہیں جس سے عیاں ہوتا ہے کہ اگرچہ پشتو اُن کی ہمسایہ زبان ہے مگر بلوچی اور کردی تقریباً ایک ہی زبان معلوم ہوتی ہیں جبکہ پشتو کا ان سے بہت کم لگاؤ نظر آتا ہے۔

اردو	بلوچی	کردی	پشتو	اردو	بلوچی	کردی	پشتو
				نو	نہہ	نو	نہ
ایک	یک	یک	یاؤ	دس	دہ	دہ	لس
دو	دو	دو	دووا	بیس	گیست	بیست	شل
تین	سہ	سہ	دریح	ماں	مدر	دایک	مور
چار	چار	چار	سلور	بھائی	براس	برا	ورور
پانچ	پنچھ	پنچ	پنزر	قبرستان	گورستان	گورستان	بدرہ
چھ	شش	شش	شپار	مہمان	مہوان	میوان	میلوان
سات	ہفت	ہوت	اووا	چور	دز	دز	رغل۔ غل
آٹھ	ہشت	ہشت	اتہ	دوائی	درماں	درماں	دارو

۱۔ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام جلد اول صفحہ 633 منقولہ بلوچی ادب کا مطالعہ کامل القادری

۲۔ بلوچی ادب کا مطالعہ صفحہ 62 کامل القادری

اردو	بلوچی	کردی	پشتو	اردو	بلوچی	کردی	پشتو
آگ	آس	آگر	اَور	چرہا	مشک	مشک	مژرک
آنکھ	چم	چھاؤ	سترگ	خاوند	مڑد	میرو	خاوند
زبان	زوال	زویان	ژَب				

بلوچی زبان کے قدامت کے مختلف اندازے لگائے جاتے رہے ہیں تاہم بعض شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ پانچویں صدی ق م میں یہ زبان موجود تھی۔ ایرانی فرمانروا زرکسس (486 تا 465 ق م) نے اپنی تخت نشینی کے وقت ایک کتبہ نصب کرایا تھا جو اب پرسی پولس (قدیم ایرانی دارالخلافہ) کی کھدائی میں دریافت ہوا ہے۔ یہ کتبہ 48 سطروں پر مشتمل ہے ان میں سے 15 تا 17 سطروں کی خواندگی مروجہ بلوچی زبان سے بالکل ملتی جلتی ہے۔[1]

بلوچی زبان کی دو بڑی شاخیں ہیں جن کو سلیمانی اور مکرانی بلوچی کے نام دیئے گئے ہیں۔ ماہر لسانیات کی رائے میں بلوچی اور فارسی ژند یا پرانی باختری زبان کی دو بیٹیاں ہیں اور اس لحاظ سے بلوچی زبان علیحدہ اور مستقل زبان ہے۔ مسٹر جارج ابراہام گرائرسن لکھتے ہیں "بلوچی زبان کا حروف صحیح کا نظام بعض لحاظ سے انہی بنیادوں پر قائم ہے جس پر قرون وسطی (چھٹی صدی سے پندرھویں صدی) میں پہلوی زبان قائم تھی۔ پروفیسر گائیگر کے نظریہ کے مطابق اس میں ایسے الفاظ ابھی تک بغیر ردوبدل کے محفوظ ہیں جو آج سے ڈیڑھ ہزار سال قبل اپنی اصلی آواز کو اس زبان میں ضائع کرنے لگ گئے تھے جس کو اب جدید فارسی کہا جاتا ہے۔ بلوچی گرائمر میں اس کی بعض صورتیں اب تک برقرار ہیں"۔[2]

سرائیکی

ڈیرہ غازی خان میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان کو سرائیکی، ملتانی، ہندکو، ریاستی، جاٹکی اور لہندا کا نام دیا جاتا رہا ہے۔ مگر اب تحریر و تقریر اور سیاست میں لفظ سرائیکی استعمال کیا جاتا ہے۔ سندھ کے تین قدرتی خطے ہیں جن کو سرا، وچالو اور لاڑ یعنی شمالی، درمیانی اور جنوبی کہا جاتا ہے۔ چونکہ یہ زبان سندھ کے شمالی خطے میں بولی جاتی ہے لہٰذا اسے سرائیکی کا نام دیا جاتا ہے۔ پنجابی میں مغرب کو عموماً لہندا کہا جاتا ہے یعنی وہ سمت جدھر سورج غروب ہوتا ہے۔ چونکہ یہ زبان اُس خطے میں بولی جاتی ہے جو پنجاب کے مغرب میں واقع ہے لہٰذا اس زبان کو لہندا بھی کہا جاتا رہا ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے اہل ہند دکن (جنوب) اور اہل عرب یمن بولتے ہیں جس میں سمت کی نسبت سے علاقوں کے نام پڑ گئے ہیں۔ اکثر اوقات سرسری نظر رکھنے والے لوگ غلطی سے اسے مغربی پنجابی کہہ جاتے ہیں جو حقیقت سے کوسوں دور ہے

۱۔ بلوچی ادب کا مطالعہ ص 83 کامل القادری

۲۔ Linguistic Survey of India vol. I Part I Page 104
George A Grierson.

دراصل سرائیکی اور پنجابی دو مختلف زبانیں ہیں جن کی ابتدا دو مختلف زبانوں کے اختلاط سے ہوئی ہے۔ مسٹر ایچ۔ ٹی۔ سورلے لکھتے ہیں "پنجاب دو مختلف النوع زبانوں کا مقامِ اتصال ہے۔ لہندا کی ماں دردی زبان ہے جو دریائے سندھ کی وادی سے مشرق کی طرف پھیلی اور علاقہ متوسط (ہندوستان) کی زبان جس کے اجداد مغربی ہندی تھے، جمنا کی وادی سے مغرب کی طرف پھیلی۔ پنجاب میں وہ ایک دوسرے پر کسی حد تک منطبق ہوگئیں۔ لہندا کو ایک دردی زبان کہا جا سکتا ہے جس میں مغربی ہندی کے الفاظ کسی حد تک شامل ہوگئے ہیں"۔[1] سرائیکی کی بہن سندھی زبان ہے۔ دردی زبانیں کشمیر، شمالی علاقہ صوبہ سرحد پشاور اور مشرقی افغانستان میں بولی جاتی ہیں۔ سرائیکی زبان جس علاقے میں بولی جاتی ہے اُسے عہدِ قدیم سے ایک علیحدہ ملکی یا جغرافیائی وحدت شمار کیا جاتا رہا ہے۔ اس کو عموماً صوبہ ملتان یا اُچ کا نام دیا جاتا تھا۔ انگریزوں کی عملداری سے قبل اس علاقے کو صوبہ ملتان کا نام دیا جاتا تھا۔ یہ صوبہ جغرافیائی بنیادوں کی بجائے لسانی وحدت کی وجہ سے علیحدہ صوبہ شمار کیا جاتا تھا۔

سرائیکی کے متعلق جناب عین الحق لکھتے ہیں کہ "پنجابی، سرائیکی اور سندھی تینوں وادی سندھ کی ہمسایہ زبانیں ہیں۔ لہٰذا پنجابی، سرائیکی، سرائیکی سندھی اور سندھی پنجابی میں ایک قریبی مماثلت پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض علماء نے سرائیکی کو سندھی کا جزو تسلیم کیا ہے اور ہمارے فاضل مصنف اس کو پنجابی کا ایک محاورہ شمار کرتے ہیں۔ سرائیکی جو کہ مختلف محاوروں (ملتانی، بہاولپوری، ڈیرہ وال وغیرہ) پر مشتمل اور پنجابی و سندھی کی درمیانی کڑی ہے، اپنی انفرادی خصوصیات کی حامل ہے۔ لہٰذا سرائیکی کو وادیِ سندھ کی ایک مستقل زبان تسلیم کرنا حقائق کے زیادہ قریب ہوگا۔ برصغیر کے لسانی جائزہ میں جارج ابراہام گریرسن نے بھی یہی مسلک اختیار کیا ہے"۔[2]

اسی نقطے کو واضح کرنے کے لئے میرے پاس جناب زمان جعفری سے بہتر استدلال اور الفاظ نہیں لہٰذا اُن کے مضمون کا ترجمہ بعد شکریہ درج ذیل کر رہا ہوں۔ وہ لکھتے ہیں "...... اگرچہ زبان کی اہمیت پر بہت زیادہ زور دینا غیر ضروری ہے کیونکہ صرف یہی امر قوم اور قومیتوں کی تشکیل و تنظیم میں اہم کردار ادا نہیں کرتا تاہم پنجاب کے بعض نام نہاد افلاطون دانشور یہ بیان کرنے میں ذرہ جھجک محسوس نہیں کرتے کہ سرائیکی زبان ہی سرائیکی قومیت کی تشکیل کا باعث ہے اور پھر یہ ثابت کرتے ہیں کہ سرائیکی پنجابی کا ایک محاورہ یا بولی ہے۔ ان حالات میں لازمی ہو جاتا ہے کہ ان دو زبانوں کا تقابل کرکے ثابت کیا جائے کہ سرائیکی پنجابی کی ایک بولی نہیں ہے بلکہ ایک علیحدہ زبان ہے۔

1- Gazetteer of the Province of W. Pakistan (Sind Province) ed 1968 P. 269-70 H.T. Sorley

۲۔ اردو زبان کی قدیم تاریخ صہ ۱۷ عین الحق فرید کوٹی

روس کے نامور ماہر لسانیات جناب وی۔ اے سمرنوف لکھتے ہیں "یہ بات قابل توجہ ہے کہ بعض اوقات کچھ مصنفین یہ لکھنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے اور لہندا (سرائیکی) کو پنجابی میں شامل کر دیتے ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ نہیں یا تو پوری طرح سے حقائق کا علم نہیں ہوتا یا وہ جان بوجھ کر پنجابی کی اہمیت کو بڑھا چڑھا کر بیان کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ اس جذبے کے تحت بعض ماہرین نے یہ غلط نظریہ قائم کیا ہے جس کے تحت وہ پنجابی اور کئی دیگر ہندوستانی زبانوں کو ہندی کی بولیاں تصور کرتے ہیں۔" پنجاب کے ماہر لسانیات پریم پرکاش سنگھ کے مطابق "پنجابی کے مخصوص خط و خال اکثر و بیشتر اولاً لہندا (سرائیکی) سے ماخوذ ہیں۔ وہ سرائیکی کے اثرات کا اردو میں بھی ذکر کرتا ہے"

وی۔ اے سمرنوف کے مطابق پنجابی اور سرائیکی کے تقابل میں حسب ذیل بنیادی تفاوت صاف طور پر موجود ہیں۔

۱۔ پنجابی زیادہ تر ایک ایسی زبان ہے جو مختلف اجزا سے مل کر کلام کو مکمل شکل دیتی ہے مگر سرائیکی اپنی بناوٹ کے لحاظ سے منفرد ترکیب رکھتی ہے اور اس کے فقرے ایک دوسرے سے بندھے ہوتے ہیں۔

۲۔ سرائیکی میں بہت سی مخصوص آوازیں اور لہجے ہیں جو اسے پنجابی سے مختلف بنا دیتے ہیں۔

۳۔ پنجابی کے متضاد سندھی اور سرائیکی زبانوں کی یہ خاص شکل ہے کہ اسم ضمیر کسی فعل کا جزو بن جاتا ہے۔ یہ صورت پنجابی میں کہیں کہیں ارتقائی صورت میں موجود ہے جو سرائیکی سے پنجابی میں اُن مصنفین کے ذریعے شامل ہوئی ہے جو سرائیکی جانتے ہیں مگر پنجابی میں لکھتے ہیں

۴۔ یہ سرائیکی کی مخصوص طرز ہے کہ فعل مستقبل بنانے کے لئے "س" کا اضافہ کیا جاتا ہے جبکہ پنجابی میں "گ" "کا"۔ دیگر اختلافات کے ذکر کرنے کی حاجت ہی نہیں۔

۵۔ ہندی اور پنجابی کا حرف فعل جو مدت یا دوام (Durative form of Predicate) ظاہر کرتا ہے ویسا سرائیکی میں موجود نہیں۔ سرائیکی میں ایک علیحدہ طرز ہے جس سے فعل کی متبادل صورت کو ظاہر کیا جاتا ہے

۶۔ سرائیکی میں فعل مستقبل میں نہی کی مخصوص گردان ہے جو پنجابی میں نہیں۔

۷۔ سرائیکی اور پنجابی میں فعل مستقبل میں واضح اختلاف ہے۔ سرائیکی میں مختلف اور متضاد نظام ہے۔

۸۔ . . . .

۹۔ . . . .

۱۰۔ . . . .

۱۱۔ سرائیکی کی گرائمر میں گردان کا خصوصی نظام ہے جو پنجابی سے قطعاً مختلف ہے۔

۱۲۔ سرائیکی میں اندرونی تصریفی حالتوں کا نظام موجود ہے جو گرائمر کی بعض اقسام میں استعمال ہوتا ہے۔

۱۳۔ اسی طرح سرائیکی گفتگو کے دیگر اجزا مثلاً اسم ضمیر، مصدر، حروف جار بھی پنجابی سے مختلف ہیں جو ایک مخصوص طرز کے

حامل ہو حامل ہوتے ہیں۔

۱۴۔ سرائیکی کے فقروں کو جوڑنے والی بعض خاص تراکیب ہیں مثلاً ایک لفظ سے مکمل فقرہ بنانا یا دو فقروں کے درمیان رابطہ فعل کی عدم موجودگی وغیرہ۔

۱۵۔ سرائیکی زبان کا ذخیرہ الفاظ اکثر و بیشتر پنجابی سے مختلف ہے۔ مسٹر اے۔ جوکس، جس نے سرائیکی کی سب سے ضخیم لغات تیار کی تھی، تحریر کرتے ہیں کہ مغربی پنجاب کی بولی سرائیکی یا جٹکی ایک بالکل علیحدہ زبان ہے جو مشرقی پنجاب کی زبان سے قطعاً مختلف ہے۔ مسٹر جوکس کا کہنا ہے کہ ماہر لسانیات مسٹر ایچ۔ مارٹن کلارک نے جب سرائیکی اور پنجابی کا تقابل مائی سنگھ کی لغات سے کیا جس میں اوسطاً چھتیس الفاظ فی صفحہ تھے، تو وہاں ان دونوں زبانوں کے صرف تقریباً دو الفاظ یکساں تھے۔

قدرتی طور پر یہ لازم ہو جاتا ہے کہ دیہاتی علاقوں کے لوگوں کی زبان کی بنیاد پر اس زبان کی لغات تیار کی جائے کیونکہ وہاں کی زبان پنجابی اور اردو کے اثرات سے کم متاثر ہوئی ہے۔ مزید براں وہاں کی کثیر آبادی ناخواندہ ہونے کے سبب شائع ہونے والے جرائد و رسائل نہیں پڑھتی جو اردو اور پنجابی میں عربی رسم الخط میں لاہور سے شائع ہوتے ہیں۔

۱۶۔ محولا بالا سرائیکی زبان کی خصوصیات کی بنا پر پنجابی بولنے والوں کے لئے اسے سمجھنا قدرے مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی وضاحت عملی طور پر بھی ہو جاتی ہے۔

سرائیکی اور پنجابی زبانوں کے بنیادی اختلافات کو سمجھنے کے لئے اضافی اسم ضمیر کا استعمال، فعل مستقبل بنانے کی طرز، فعل منفی کی خصوصی طرز، فعل کی گردان، مصادر اور ترکیبی فعل مجہول بنانے کی چند مثالیں دی جاتی ہیں۔

اسم ضمیر کے لاحقہ کو واضح کرنے کے لئے سرائیکی کا لفظ "مرلیسن" (وہ ماریں گے) لیا جاتا ہے۔ اسی ایک لفظ کے مدعا کو پنجابی کے تین الفاظ "اوہ مارن گے" سے ادا کیا جاتا ہے۔ جب "مرلیسن" کے ساتھ "س" کا اضافہ کیا جاتا ہے تو ایک نیا لفظ "مرلیسنس" (م ری س ن س) یعنی وہ اُسے ماریں گے (سرائیکی کا ایک فقرہ = جے او چوری کرتیں گیا تیں پیو مرلیسنس یعنی اگر وہ چوری کر کے گیا تو باپ مارے گا۔ مولف) بن جاتا ہے جسے پنجابی میں "اوہ انہوں مارن گے" سے ادا کیا جائے گا سرائیکی کا ایک لفظ "مرلیسنس" پورے فقرے کا مفہوم بن جاتا ہے جس میں اسم فاعل کو اسم مفعول کے پہلو بہ پہلو شامل کرتا ہے سرائیکی میں "س" کا اضافہ کیا جاتا ہے جبکہ پنجابی میں "گ" کا اضافہ کر کے فعل مستقبل بنایا جاتا ہے۔ محولہ بالا فقرہ پنجابی میں "گا"، "گے" کے اضافہ سے بنتا ہے۔ مثلاً "اوہ اوہنوں مارن گے"۔ مزید براں سرائیکی میں "سی" کا اضافہ کر کے بھی فعل مستقبل بنتا ہے۔ مثلاً "آسی" (وہ آئے گا) مگر اس کے برعکس پنجابی میں یہی "سی" فعل ماضی کو ظاہر کرنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً "اوہ آیا سی" (وہ آیا تھا)۔ اس کی مزید وضاحت فعل مستقبل کی گردان سے کی جاتی ہے۔

صیغہ	واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
سرائیکی	ولیسی	ولیسن	ولیسیں	ولیسو	ولیساں	ولیسوں
پنجابی	جاوانگا یا یا جاؤ گا	جان گے	جاپئن گے	جاؤ گے	جانواں گا	جانواں گے

سرائیکی اور پنجابی میں ایک اہم فرق فعل نہی کے استعمال کا ہے جو سرائیکی کی ایک مخصوص طرز ہے۔ یہ طرز کلام پنجابی اور دیگر زبانوں میں عدم موجود ہے۔ ایک مثال ملاحظہ ہو۔

صیغہ	واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
سرائیکی	لسی کھادا	نہیں کھادا	نوہی کھادا	نوہے کھادا	نمہیں کھادا	نسے کھادا (ہم نے نہیں کھایا)

اب فعل "ہونا" کے ذریعہ پنجابی اور سرائیکی کے بنیادی فرق کو واضح کیا جاتا ہے۔ سرائیکی لفظ "ہونونڑ" (ہونا) کے مصدر کی دو تصریحات بیان کی جاتی ہیں جو سرائیکی اور پنجابی میں موجود ہیں۔

صیغہ ماضی	واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
سرائیکی	ہئس	ہائین	ہاوی	ہادے	ہائم	ہاسے

پنجابی اوہدے پاس ہیناسی ۔ ہینےسن وغیرہ۔

اب اسی لفظ کا فعل نہی ملاحظہ ہو۔

صیغہ	غائب واحد	غائب جمع	واحد حاضر	جمع حاضر	متکلم واحد	متکلم جمع
سرائیکی	ہنسی	ناہیں	نادھی	نادے	ناہیں	نہسے

پنجابی میں منفی مفہوم کو ادا کرنے کے لئے مثبت لفظ کے ساتھ "نہیں" کا اضافہ کیا جاتا ہے

سرائیکی اور پنجابی و اردو کا ایک اور فرق یہ ہے کہ فعل مجہول بناتے وقت فعل کے ساتھ مصدری حالقہ مث "جانا" کا اضافہ پنجابی اور اردو میں کیا جاتا ہے جبکہ اصل مصدر اپنی اصلی صورت میں برقرار رہتا ہے۔ صیغوں کی تبدیلی کے وقت حالقہ مصدر کو تبدیل کیا جاتا ہے۔ مثلاً پنجابی لفظ "کھادا" (کھانا) کھانا کا فعل ماضی ہے، اس کے ساتھ "جانا" کا اضافہ کر کے (کھادا جانا) فعل مجہول بنایا جاتا ہے سرائیکی میں تاہم فعل مجہول اصل مصدر کو تبدیل کر کے بنایا جاتا ہے مثلاً روٹیاں کھویسن (روٹیاں کھائی جائیں گی) تو فعل مجہول ہے پنجابی میں "روٹیاں کھادیاں جان گیاں" ہے۔ مزید براں سرائیکی میں مصدر میں تبدیل کر کے نیا مصدر تیار کر لیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر "ماروں" کا فعل مجہول "مریجن" سمجھا جاتا ہے۔ سرائیکی میں VERBAL - ad - VERBIAL کو بھی تبدیل کرنے کی خاصیت ہے

مثلاً "رکھݨ" کا فعل متعدی یا معروف "رکھاوݨ" ہے اور اس کا verbal ad-verbial "رکھواوݨ" ہو جاتا ہے۔

سرائیکی زبان کے نامور محقق ڈاکٹر مہر عبدالحق لکھتے ہیں "تحقیق لسانیات کے مسلمہ اصولوں کے مطابق زبانوں کی موافقت اور عدم موافقت کو جاننے کا طریقہ یہ ہے کہ فعل اور حرفِ جار کو جانچا جاتا ہے تاہم اسم اور اسم صفت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کیونکہ زبان کی بنیادی بناوٹ صرف حرف فعل کی تبدیلیوں سے معلوم ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد مذکر مونث، اسم ضمیر کی تبدیلیوں اور آخر پر اسم اور اسم صفت کی باری آتی ہے۔ تاہم اس کے ساتھ ہی یہ بھی مدِنظر رہے کہ اسم اور اسم صفت کسی زبان کے شجرہ نسب کو معلوم کرنے میں زیادہ معاون ثابت نہیں ہوتے کیونکہ زبانیں ایک دوسرے کے الفاظ جذب کرتی رہتی ہیں۔ کچھ عرصہ بعد یہ الفاظ اُسی زبان کے ذخیرہ الفاظ کا حصہ بن جاتے ہیں خواہ اس کے معنی اور صورت اسی زبان کے اسلوب کے مطابق بن جائیں۔ اس کو واضح کرنے کے لئے اردو زبان کے نامور شاعر مرزا غالب کا ایک شعر لیا جاتا ہے۔ ؎

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تیری بزم سے نکلا، سو پریشان نکلا!

اس شعر میں کل پندرہ الفاظ ہیں جن میں سے نو فارسی زبان کے ہیں مگر پھر بھی اردو زبان کا شعر رہتا ہے۔ اس شعر کو پنجابی میں ڈھالنے پر اس کی صورت یہ ہوگی۔ ؎

بوئے گل، نالہ دِل، دودِ چراغِ محفل
جو تیری بزم توں نکلیا، سو پریشان نکلیا!

یہ شعر اب پنجابی زبان کا بن گیا کیونکہ حرفِ جار "توں" اور فعل "نکلیا" دونوں پنجابی زبان کے الفاظ ہیں۔ حرفِ جار "جو" اور "سو" دونوں زبانوں میں مشترک ہیں۔

اب اسی شعر کو یوں پڑھیئے ؎

بوئے گل، نالۂ دِل، دودِ چراغِ محفل
جو تیݙی بزم توں نکھتا، سو پریشان نکھتا!

اب یہ شعر سرائیکی زبان میں ڈھل گیا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کون سے الفاظ ہیں جو فارسی کو اردو، اردو کو پنجابی اور پنجابی کو سرائیکی میں تبدیل کر رہے ہیں۔ یہ پانچ الفاظ جو، تیری، سے، سو، اور نکلا ہیں۔ ان میں سے دو الفاظ "جو" اور "سو" پنجابی، سرائیکی اور اردو میں مشترک ہیں۔ بقایا تین الفاظ "تیری"، "سے" اور "نکلا" ہیں جو گرائمر کے لحاظ سے بالترتیب اسم ضمیر، حرف جار اور فعل ہیں۔ اردو اور پنجابی میں "تیری" مشترک لفظ ہے۔ البتہ لفظ "تیری"، سرائیکی میں "تیݙی" میں بدل جاتا ہے۔ پنجابی اور سرائیکی دونوں میں لفظ "توں"، اردو کے لفظ "سے" کے معنی میں

مستعمل ہے۔ لہٰذا لفظ "توں" بھی پنجابی کو سرائیکی میں تبدیل کرنے میں کوئی کردار ادا نہیں کر رہا۔ ایسی صورت میں صرف ایک لفظ "نکلا" بچ جاتا ہے جو فعل ہے اور زبانوں کے تفاوت کو ظاہر کرنے والا شعر میں واحد لفظ ہے۔ اگر یہ لفظ "نکلا" سے "نکلیا" بنایا جائے تو یہ شعر پنجابی بن جاتا ہے کیونکہ "نکلنا" کا ماضی "نکلیا" بنتا ہے۔ جب "نکلیا" کی جگہ لفظ "نکھتا" شعر میں لگایا جائے تو کئی مشترک الفاظ کے باوجود سرائیکی زبان کا شعر بن جاتا ہے۔ اس مرحلے پر یہ بھی ذہن نشین رہے کہ "لفظ" نکلنا" کی جڑ ان تمام زبانوں میں ایک ہی ہے۔ اس کے باوجود چونکہ Inflextional form کی گردان ان تمام زبانوں میں مختلف ہے لہٰذا مصدر کی یکسانیت کے باوجود ان کے ایک زبان ہونے کی تصدیق نہیں کرتے۔

سرائیکی میں یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ جہاں ——— مصدر کا اختتام "س" پر ہوتا ہے وہاں ماضی مطلق بنانے کے لئے "تھا" یا "تھا" کا اضافہ کیا جاتا ہے۔ یہ سرائیکی اور دردی زبانوں کا کلیہ ہے۔ جن زبانوں کی بنیاد ہندوستانی زبانیں ہیں، اُن میں "یا" کا اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً "نکس" سے "نکھتا" سرائیکی میں نہ کہ "نکلیا" جیسا کہ پنجابی میں ہے۔

سرائیکی اور پنجابی کے فرق کو واضح کرنے کے لئے عام بول چال کا ایک فقرہ بطور مثال کافی ہوگا۔ "ہسبینڈ اینڈ وائف روزانہ شام کو فلم شو دیکھتے ہیں"۔ اس فقرے میں کل نو (۹) الفاظ ہیں چونکہ "دیکھتے ہیں" مرکب فعل ہے لہٰذا اُسے نو الفاظ میں ایک لفظ شمار کیا گیا ہے۔ ان تمام الفاظ میں سے پانچ الفاظ انگریزی کے ہیں۔ دو الفاظ فارسی کے اور صرف دو اردو کے ہیں۔ اس کے باوجود اس تمام فقرے کو اردو کا فقرہ سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس فقرے میں مستعمل فعل اور حرفِ جار اردو زبان کے ہیں۔ اگر یہ دونوں حروف یعنی فعل اور جار پنجابی کے حروف فعل و جار سے بدل دیئے جائیں تو فقرہ پنجابی زبان کا بن جائے گا اور پھر اُس کی صورت یہ ہوگی۔

"ہسبینڈ اینڈ وائف روزانہ شام نوں فلم شو ویکھدے نیں"۔ اگر اُن الفاظ کی جگہ پر سرائیکی کے حروف بدل دیئے جائیں تو فقرہ یوں بن جائیگا۔ "ہسبینڈ اینڈ وائف روزانہ شام کوں فلم شو ڈیدھن۔"

محولا بالا تین مثالوں سے بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ خاص فرق زبانوں میں حروف فعل اور جار سے پیدا ہوتا ہے۔ لہٰذا سرائیکی اور پنجابی میں بنیادی فرق فعل کے تصریف اور بناوٹ کے سبب سے ہے۔ آخر میں یہ کہنا صحیح ہوگا کہ زبانوں کا اختلاف بالخصوص فعل کی اشکال اور تصریف کی بدولت ظہور پذیر ہوتا ہے۔ ماضی مطلق کی ایک گردان اس نقطے کو سرائیکی اور پنجابی کا فرق اکو پوری طرح سے واضح کریگی

صیغہ	واحد غائب	جمع غائب	واحد حاضر	جمع حاضر	واحد متکلم	جمع متکلم
سرائیکی	کھاڈس	کھدُنیں	کھدوئی	کھدوہے	کھاڈم	کھدوسے
پنجابی	کھادا	کھادا	کھادا	کھادا	کھادا	کھادا

آخر میں یہ بھی مختصراً بیان کرنا مناسب ہوگا کہ جہاں الفاظ کی شکل میں یکسانیت ہے، وہاں بھی حروف جار کی صورت میں خاص طور پر غور کرنا ہوگا۔ جہاں حروف جار بھی مشترک ہوں وہاں پر واحد جمع، مذکر مونث، ذخیرۂ الفاظ، امثال اور لب و لہجے کو مدِ نظر رکھا جائے۔

رسم الخط

ضلع ڈیرہ غازی خان کے علاقے میں عہد قدیم میں مختلف رسم الخط مروج رہے ہیں جن میں ارامی، فروختی، یونانی، سنسکرت وغیرہ قابلِ ذکر ہیں مگر عربوں کی آمد سے اس خطے میں بھی عربی رسم الخط کا استعمال شروع ہوا جو اب اردو، بلوچی، پنجابی، سرائیکی، سندھی اور پشتو میں معمولی ترامیم کے ساتھ مستعمل ہے۔ اب چونکہ اس ضلع کا رسم الخط بھی عربی ہے لہٰذا ضروری ہے کہ عربی رسم الخط کی ابتدا اور نشوونما پر کچھ اظہارِ خیال کر لیا جائے۔

ہر جاندار اپنی نوع تک اپنے جذبات اور خیالات پہنچانا چاہتا ہے مگر اُن کے جذبات کی نوعیت جاندار کی جسمانی ضروریات تک محدود ہوتی ہیں۔ اکثر جانور اپنے غصے کا اظہار کرنے کے لئے خوفناک آوازیں پیدا کرتے ہیں۔ کتا اپنے مالک سے اظہارِ محبت کے لئے اُس کے آگے دم ہلاتا ہے یا اُس کے آگے لوٹ پوٹ ہو جاتا ہے۔ تاہم جب کتا اپنی قوم کے درمیان سے دُم دبا کر چلے تو اس کا مطلب ہوتا ہے کہ دوستو! میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچانا چاہتا۔ اگر اُس کی دُم اُوپر اُٹھ کر بل کھائے تو اس سے مراد ہوتی ہے کہ وہ حالات کے مطابق اپنا دفاع کریگا تاہم اگر اُس کی دُم زمین کے متوازی اور پیٹھ کے ساتھ خطِ مستقیم بنالے تو اس کا مطلب جارحانہ عزائم ہیں۔

انسان نے جب ترقی کرلی تو اس نے نہ صرف حاضر کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہا بلکہ وہ غائب کو بھی اپنے جذبات اور خیالات سے آگاہ کرنا چاہتا تھا۔ اسی طرح سے حساب کتاب رکھنے کی غرض سے بھی فن تحریر کا رواج ہوا اور اس طرح سے انسان نے تمدن کی ابتدا کی۔ سورۃ العلق آیات 3 تا 5 میں فرمانِ خداوندی ہے "پڑھو اور تمہارا رب بڑا کریم ہے جس نے قلم کے ذریعے علم سکھایا، انسان کو وہ علم دیا جسے وہ نہ جانتا تھا"۔ ابتدا میں جنوبی عراق (سومیرا) میں جو زقورہ (مندر) جو سات منزلہ ہوتے تھے تعمیر ہوئے، وہ دیوتاؤں کے نام سے منسوب ہوتے تھے اور علاقے کی حکومت دراصل اُس دیوتا کے نام پر چلائی جاتی تھی۔ علاقے کے تمام لوگ اور املاک دیوتا کی ملکیت تصور ہوتے تھے۔ سرکاری ٹیکس از قسم غلہ وغیرہ مندروں کے پروہتوں کی تحویل میں ہوتا تھا۔ ان مندروں سے کاشتکاروں کو بیج اور آلات زراعت جاری کئے جاتے تھے ان کا حساب کتاب رکھنے کی غرض سے تحریر کی ابتدا ہوئی۔

فن تحریر کی اقسام تصویری، رموز اور صوتی یا حروف تہجی ہیں۔

1- The National Question in Pakistan with special Ref. to S.S.B (Saraiki. Sindhi Baluchistan) P: 30 to 38 Zaman Jaffery.

تصویری رسم الخط یہ طرزِ تحریر دنیا کے مختلف ممالک میں انسانی تمدن میں سب سے پہلے مروج ہوا۔
عراق (سومیر)، مصر، وادیٔ سندھ، وسطی امریکہ اور چین میں اس کا چرچا کافی مدت
تک رہا۔ عراق میں یہ طرزِ تحریر ۳۵۰۰ ق م میں موجود تھا۔ آدم حوا اور شیطان کے بہکانے کے واقعہ کو اہل سومیر (جنوبی عراق)
نے اس طرح تحریر کیا:۔
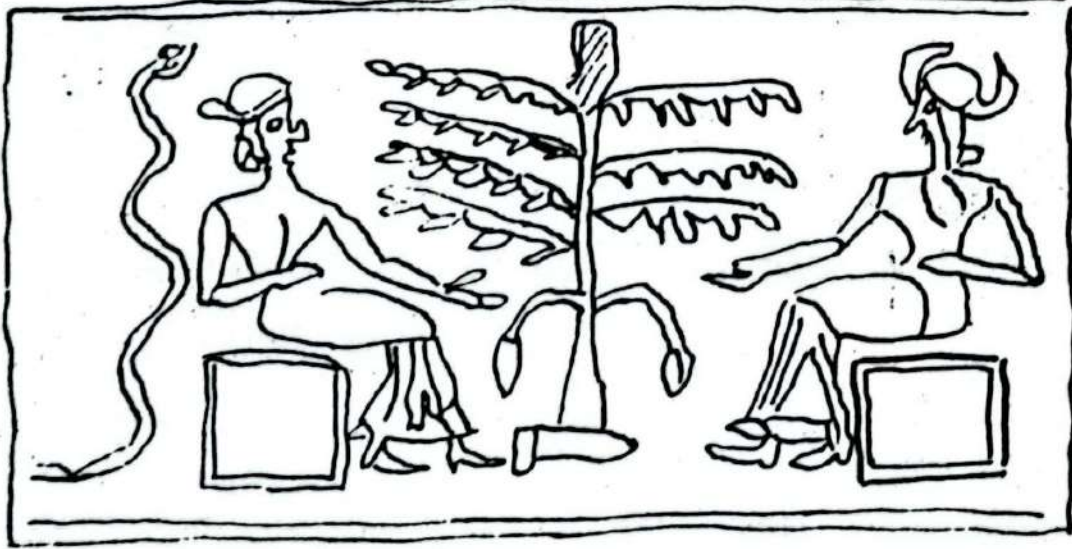
کچھ علاقوں میں طرزِ تحریر (تصویری) میں کچھ اختصار سے بھی کام لیا جانے لگا۔ مثلاً عورت ▽ اور مرد △ کی مکمل تصویروں
کی بجائے جسم کے ایک مخصوص حصے کو علامت بنا دیا گیا۔ اس طرح الٹی یا سیدھی مثلث سے مراد عورت یا مرد لیا جاتا تھا
یہودیوں کا قومی شعار ✡ بھی دراصل عورت اور مرد کا اتصال ہے جسے اب در نقشِ سلیمانی کہتے ہیں۔ تصویری رسم الخط
چین میں اب بھی مروج ہے۔ اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ وہاں پر ایک ہی تحریر کو مختلف زبانوں اور لہجوں میں پڑھا
جا سکتا ہے مگر معنی میں کوئی فرق نہ آئیگا۔ مثال سے یوں واضح کیا جا سکتا ہے
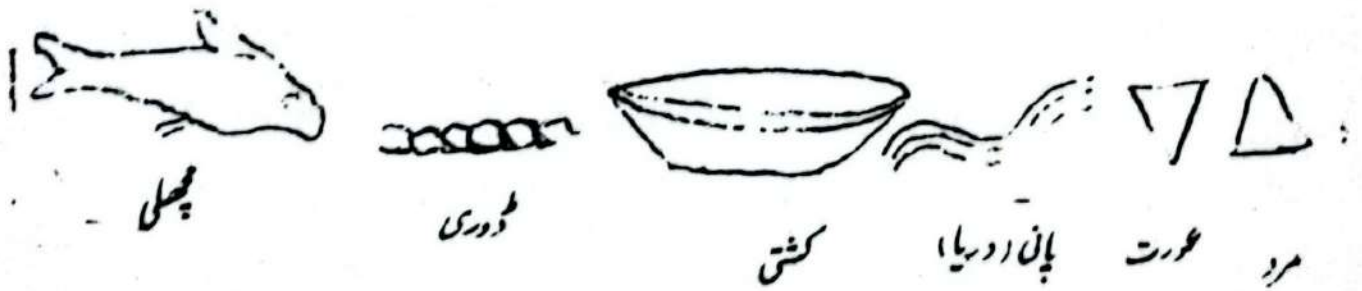
یعنی ایک مرد اور ایک عورت دریا میں کشتی پر سوار ہو کر ڈوری سے مچھلی پکڑنے گئے۔ اب اس تحریر کو
کسی بھی زبان میں پڑھیں تو مطلب میں کوئی فرق نہ آئیگا۔ چینی رسم الخط کا یہی کمال ہے کہ مختلف علاقوں کے لوگ ایک دوسرے
کی زبان نہ سمجھنے کے باوجود ہر خطے کے لوگ ایک ہی تحریر کے ذریعہ سے ایک دوسرے کا مافی الضمیر سمجھ لیتے ہیں۔

رموز اس طرزِ تحریر میں کوئی علامت کسی مقصد کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ مصر کے ہیرو غلافی طرز تحریر میں بیل کی شبیہ سے مراد خالق، شیر سے مراد حکومت، سانپ سے حکمرانی، بھڑ سے اقتدار اور مینڈک سے مراد الف لیا جاتا تھا۔ ایسی تحریر دائیں یا بائیں دونوں اطراف سے لکھی جاتی تھی البتہ پڑھنے کے وقت جانوروں کے رخ کے مطابق پڑھنا پڑتا تھا۔ سومیر (جنوبی عراق) میں دیوتا ننگر سو یا تموز، دیوتا زرخیزی یا تولیدی تھا۔ اس کی علامت نسر یعنی گدھ تھی یہ مذہب یمن تک پھیل گیا اور وہاں کے معابد کو بیت نسور کہا جاتا تھا۔ قرآن مجید کی سورۃ نوح آیت نمبر 23 میں نسر دیوتا کا ذکر ہے۔ ان معابد کے دروازوں کے اوپر گدھ کی تصویر بنی ہوئی ہوتی تھی۔ اسی طرح سے چاند دیوتا جس کو ننار یا سین کہا جاتا تھا، اس کی علامت ہلال تھی۔ اسی طرزِ تحریر میں دیوتاؤں کی سربلندی اور طاقت کو ظاہر کرنے کے لئے مخروطی ٹوپی کی علامت استعمال کی جاتی تھی جس پر دھاریاں اوپر کو اٹھی ہوئی ہوتی تھیں۔ اب یہ انسانی فطرت کا خاصا بن چکا ہے کہ وہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتا ہے یا خدا کا تصور دلانا چاہتا ہے تو منہ اوپر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتا ہے۔ خدائے برتر یا عظیم دیوتا کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے علامتی طور پر دھاریاں اوپر کو اٹھتی ظاہر کی جاتی تھیں۔
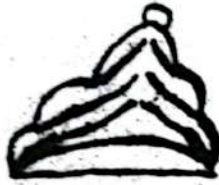
اسی طرح سینگ اور ڈنڈا قوت کا مظہر تھے۔ قدیم بادشاہوں کے سروں پر سینگوں کا اظہار قوت کی علامت تھی۔ دائرہ لافانی اور غیر انتہا کے معنی میں استعمال ہوتا تھا۔ قدیم دور کے یونانی شاعر اسکلیوس نے صدائے بلبل سے اتو اتو اتیز کی آواز لی ہے جس کا یونانی زبان میں معنی ہے "منظور ہے، منظور ہے ابدالاباد تک۔ کیونکہ اتیز کے معنی دائرہ کے ہیں جو لا انتہا ہے۔

خط میخی قدیم دور میں ایران، عراق، شام وغیرہ میں مروج رہا مگر یہ بہت مشکل طرزِ تحریر تھی لہٰذا یہ صرف کتبوں میں مستعمل رہا۔ اسے عوامی مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔

صوتی حروفِ تہجی کو سب سے پہلے اہلِ کنعان (لبنان) نے استعمال کیا۔ اُن کے ہاں ستر حروفِ تہجی تھے مگر کوئی حرفِ علت نہ تھا۔ اہلِ کنعان گھونگھوں سے ایک قسم کا ارغوانی رنگ تیار کر کے فروخت کرتے تھے جس کی وجہ سے یونانی انہیں فنیقی یعنی ارغوانی کے نام سے پکارتے تھے اور پھر وہ یورپ میں بھی اسی نام سے مشہور ہو گئے۔ اہلِ کنعان سے حروفِ تہجی کا استعمال اہلِ یونان نے سیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ یونانی، انگریزی اور دیگر یورپین زبانوں میں

---

1. An Egyption — Princess George Morton.

ا ت ح ذ ص ک
ء ط ھ ز س ق
ع ض ش
ظ

مندرجہ بالا حروف کی آواز اگرچہ عرب کے لئے مختلف ہے مگر غیر عرب اُس آواز کو نکالنے یا ادا کرنے سے عموماً عاری ہوتا ہے۔

کنعان سے حروف تہجی کی کئی شاخیں بن گئیں جن میں سے یمنی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کیونکہ قیامِ پاکستان تک اونٹ رکھنے والے لوگ اپنے اونٹوں پر جو نشان لوہے کو گرم کرکے لگاتے تھے وہ یمنی زبان کے حروف تھے جن کو وشم کہا جاتا ہے۔ اب ذرا ایک چھوٹی سی مثال واضح ہو۔

عربی	د	م	ح	ا	احمد
فنیقی	Δ	ᛗ	H	H	
یمنی	⊓	ᛦ	Ψ	ﺭ	

جب یمن وغیرہ کے شتربان اپنے اونٹ پر نشان لگاتے تھے تو وہ اُن کا حرف مُغزا ہوتا تھا۔ مثلاً لشبیر بادی تمیم کا طغرا ب ھ ت اس طرح سے ہوگا۔

X ⅄ ⊓

اہلِ یمن (سبا) نہایت ترقی یافتہ لوگ تھے۔ مشرق اور مغرب کے درمیان تقریباً ایک ہزار سال تک تمام تر تجارت اہلِ یمن کے ذریعہ سے ہوتی رہی کیونکہ اُس دور کی دو عظیم ترین طاقتیں ایران اور روم کافی مدت سے ایک دوسرے سے بر سرِ پیکار تھیں جس سے خشکی کا راستہ بند ہوگیا تھا۔ علاوہ ازیں اہلِ یمن بحیرہ قلزم کی خطرناک سمندری چٹانوں سے بخوبی واقف تھے۔ باب المندب (آنسوؤں کا دروازہ) سے صرف اُن کے بحری جہاز بخیر و خوبی گزر سکتے تھے۔ بعد میں اہلِ روم نے یمن اور دیگر عربوں کی تجارت کو تباہ کرنے کی غرض سے مذہب کا بہانہ بنا کر کعبہ کی مرکزیت کو ختم کرنا چاہا۔ سورۃ فیل آیت ۲ میں اللہ تعالےٰ نے جس خفیہ منصوبہ کی طرف اشارہ فرمایا ہے وہ دراصل اسی تجارت کو تباہ کرنے کا منصوبہ تھا۔ یمن نہایت زرخیز ملک تھا اور اُن کی شادابی کا باعث سد مارب تھا جو انھوں نے پہاڑوں کے درمیان گھاٹیوں کو بند کرکے مصنوعی جھیل بنائی تھی۔ اس جھیل کا پانی نہری نظام کے تحت تقسیم ہو کر کھیتوں کو سیراب کرتا تھا۔ صحیح مقدار میں آبپاشی کا پانی ملنے سے زرعی پیداوار میں خوب اضافہ ہوا۔ قرآن کریم کے الفاظ میں "سبا کے لئے اُن کے مسکن ہی میں ایک نشانی موجود تھی، دو باغ دائیں اور بائیں (یعنی ہر طرف)۔ کھاؤ اپنے رب کا دیا ہوا رزق اور شکر بجا لاؤ اُس کا، ملک ہے عمدہ و پاکیزہ اور پروردگار

بخشش فرمانے والا۔ مگر وہ منہ موڑ گئے۔ آخر کار ہم نے اُن پر بند توڑ سیلاب بھیج دیا اور اُن کے پچھلے دو باغوں کی جگہ دو اور باغ انہیں دیئے جن میں کڑوے کسیلے پھل اور جھاؤ کے درخت تھے اور کچھ تھوڑی سی بیریاں۔"[1] ۵۰ ق م تک یمن کا دارالخلافہ مرواح تھا جہاں کی تلواریں بڑی مشہور تھیں۔ بلوچی اشعار میں بھی جب کسی تلوار کی تعریف کرنا مقصود ہوتی تو شاعر اُسے مرواحی کہتا تھا۔ ۵۴۷ء میں سد مارب ٹوٹ گیا اور سیل العرم کا حادثہ پیش آیا اور ملک سبا پر سخت مصیبت

رسول اللہ کی ولادت کے وقت عرب کی سیاسی تقسیم (571ء)
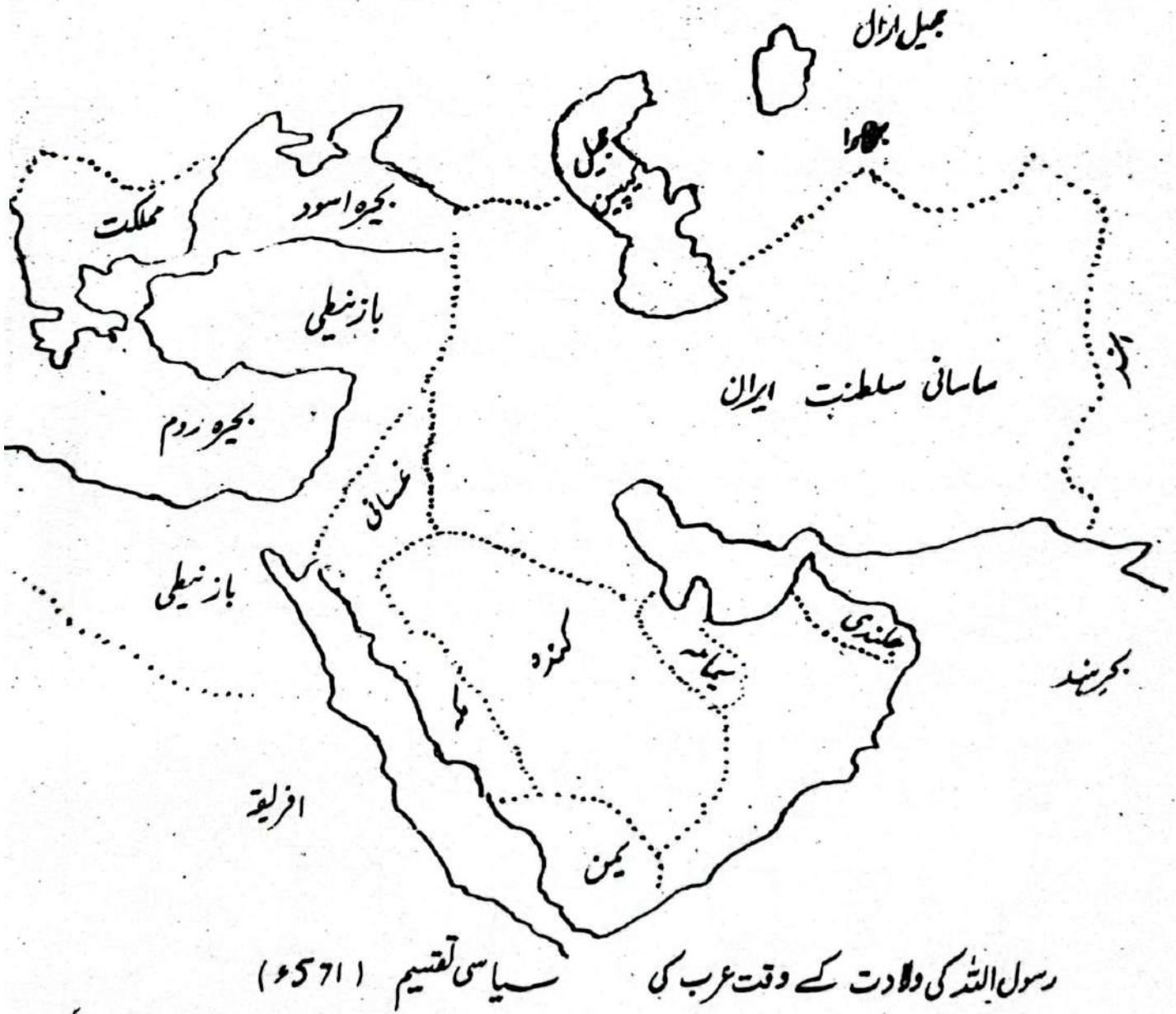
آئی۔ تمام نہری نظام سیلاب میں تباہ ہو گیا۔ گاؤں اور مال مویشی بہہ گئے۔ وہ ملک جس میں ہر طرف باغ ہی باغ ن

۱۔ قرآن کریم سورۂ سبا آیات ۱۵، ۱۶

آتے تھے اب ویرانہ بن گیا۔ ملک اس قابل نہ رہا کہ عوام کو غذا بہم پہنچا سکے۔ لہٰذا جس قبیلہ کو جہاں کوئی موزوں جگہ نظر آئی تو ادھر ہجرت کی اور اس طرح سے تمام قوم منتشر ہو گئی۔ اسی بنا پر جب انتشار اور پراگندہ ہونے کا ذکر ہوتا تو عرب محاورۃً کہتے "تفرقوا ایدی سباء" یعنی وہ قوم سبا کی طرح منتشر ہو گئے۔ قبیلہ غسان نے اردن اور شام، اوس و خزرج نے یثرب (مکہ)، خزاعہ نے تہامہ (جدہ)، ازد نے اومان، لخم نے حیرہ (نزد نجف اشرف) اور کندہ نے حجاز کے مشرق میں سکونت اختیار کی۔

یمن سے نقل مکانی کرنے والے لخمی قبیلہ نے حیرہ پر حکومت کی۔ وہ ایرانیوں کی سرپرستی میں حکومت کرتے تھے۔ کندہ نے پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں عرب امارات کے مغرب اور حجاز کے مشرق میں الکندہ کا ایک وفاق قائم کیا۔ اس وفاق کا بانی حجُر عاقل المرار تھا جس کے پوتے حارث بن عمر نے بڑی ناموری حاصل کی۔ حارث الکندی نے حیرہ پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا جہاں منذر ثالث حکمران تھا۔

529ء میں منذر نے حیرہ (جو اب نجف اشرف سے آٹھ کلومیٹر جنوب مشرق میں چھوٹا سا قصبہ ہے) پر پھر قبضہ کر لیا اور کندہ خاندان کے پچاس افراد کو قتل کر دیا۔ امرؤالقیس (دورِ جاہلیت کا نامور شاعر) بھی الکندہ کے آخری حکمران حجُر (بمعنی صاحب فراست) کا سب سے چھوٹا بیٹا تھا۔ امرؤالقیس کے باپ نے اُسے دو مرتبہ فحش کلامی کی بنا پر دربار سے نکلوا دیا تھا۔ حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ "روزِ قیامت جاہلیت کی شاعری کا جھنڈا امرؤالقیس کے ہاتھ میں ہوگا اور عرب جاہلیت کے تمام شعراء اسی کی پیشوائی میں دوزخ کی راہ لیں گے"۔ اہلِ عرب اُسے "الملک الضلیل" یعنی سلطنت ضائع کرنے والا بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے باپ کی سلطنت گنوا بیٹھا۔ اس کے باپ کو بنی اسد نے قتل کر دیا جس سے انتقام لینے کی خاطر وہ ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے میں امداد لینے گیا مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر کار غسانی حکمران کی معرفت بازنطینی حکمران جسٹنین کے پاس امداد کے لئے پہنچا تو وہ اس کی امداد پر تیار ہو گیا مگر پھر اُس کی کسی بات پر بگڑ گیا اور اُس سے جان چھڑانے کے لئے اُسے زہریلا کمبل دیا جس سے اُس کی موت انقرہ میں واقع ہوئی۔ اُسے قصیدہ کا بانی مانا جاتا ہے۔ حجُر کے قتل کے بعد یہ وفاق چار حصوں میں بٹ گیا جو بنی اسد، بنی تغلب، بنی قیس اور بنی کنانہ پر مشتمل تھا۔ اسلام کے ابتدائی دور میں مجاہدین کو ان قبائل سے واسطہ پڑا۔

حیرہ پر اہلِ لخم نے بڑی شان و شوکت سے حکومت کی اور اُن کے ایک حکمران منذر کے پاس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک خط بھی پہنچا تھا۔ لخمی دربار میں اولیں مرتبہ عربی رسم الخط کا رواج ہوا جو انہوں نے سریانی رسم الخط سے اخذ کر کے تیار کیا۔ سریانی آرامی زبان کی ایک شاخ تھی اور یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مادری زبان تھی۔ اس حروف تہجی میں بہت سے حروف تصویری رسم الخط کو مختصر کر کے باقاعدہ حروف کی شکل دے دی گئی۔ چند مثالیں قارئین کے لئے باعث دلچسپی ہوں گی۔

عربی میں گھر کو بیت کہا جاتا ہے لہٰذا کمرہ کا خاکہ ب بنا کر اُسے ب کر دیا گیا۔
عربی میں اونٹ کو جمل کہا جاتا ہے لہٰذا اونٹ کا خاکہ بنا کر صرف گردن کو ج بنایا گیا۔
عربی میں آنکھ کو عین کہا جاتا ہے لہٰذا آنکھ کا خاکہ بنا کر ع بنایا گیا۔
عربی میں منہ کو فم کہا جاتا ہے لہٰذا منہ کا خاکہ بنا کر ف بنایا گیا۔
عربی میں کھونٹا کو وتد کہا جاتا ہے لہٰذا کھونٹا کا خاکہ بنا کر و بنایا گیا۔

عربی میں ہاتھ کو ید کہا جاتا ہے ی۔ اُس میں سے درمیانی تین انگلیاں غائب کر کے ی بنائی گئی۔

یہ حروف تہجی مکہ کے تاجر حیرہ سے لائے اور قرآن کریم کو اسی رسم الخط میں لکھا گیا۔ ابتدا میں اُن پر کوئی نقطے نہ تھے مگر جب اسلام غیر عرب اقوام میں پھیلا تو صحیح قرات کے لئے مناسب مقامات پر نقطے اور اعراب لگائے گئے۔ اسلامی دنیا میں اس کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ ایران اور دیگر غیر عرب ممالک نے عربی حروف تہجی میں مناسب ترامیم و اضافہ کر کے اس کو اپنی زبان کی تحریر میں استعمال کیا۔

ضلع ڈیرہ غازی خان میں ابتدائی دور کی جو تحریریں ملی ہیں وہ ابھی تک پڑھی نہیں جا سکیں جن کی چند مثالیں اسی کتاب میں درج کی گئی ہیں۔ اُس کے بعد سنسکرت، یونانی اور ایرانی آئیں۔ جب وادی سندھ پر مسلمانوں کا قبضہ ہوا تو یہاں پر عربی مروج ہو گئی۔ عرب حکومت وادی سندھ میں تھوڑے عرصے تک قائم رہی۔ اس کے بعد فارسی کا اثر و رسوخ بڑھ گیا۔ اُس وقت سے یہاں لکھنے میں اردو رسم الخط استعمال کیا جاتا ہے جو عربی رسم الخط کو ترمیم کر کے تیار کیا گیا ہے۔ سرائیکی، سندھی، پشتو، بلوچی اور پنجابی اسی رسم الخط میں معمولی تغیر و تبدل کے بعد لکھی جاتی ہیں۔

باب ۱۱

قدیم تحریریں اور تاریخی نوادرات

ضلع ہذا میں قدیم کتبوں اور تحریروں کی چنداں کثرت نہیں۔ اگر ایسی کوئی تحریریں فی الحقیقت موجود ہیں تو وہ ابھی تک مدفون ہیں کیونکہ اکثر و بیشتر قدیم کھنڈرات پہاڑی ندی نالوں سے آنے والی مٹی کے نیچے دفن ہو چکے ہیں۔ یہاں کسی مقام پر بھی کوئی باقاعدہ کھدائی نہیں ہوئی۔

سنگ بُزکُشی فورٹ منرو سے جانب جنوب مشرق تقریباً تین میل کے فاصلے پر ایک مقام "بُزکُشی" کے نام سے موسوم ہے۔ اگرچہ بزکشی کا لفظی معنی تو بکری کو ذبح کرنا ہے۔ مگر حقیقت میں یہ ایک کھیل کا نام ہے جو اب بھی شمالی افغانستان اور ترکی میں کھیلا جاتا ہے، یہ کھیل منگول (مغلوں) کا قومی کھیل تھا جو دیگر اقوام میں بھی مروج ہو گیا۔ اس کھیل میں دو ٹیمیں حصہ لیتی ہیں۔ کھلاڑی گھوڑوں پر سوار ہو کر ایک بے سری بکری کو ایک دوسرے سے بزورِ بازو چھین کر مخالف کے گول میں لے جانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گویا مردہ بکری گیند کا کام دیتی ہے۔ یہ مقام بھی شاید کسی دور میں اس کھیل کے مقابلوں کی جگہ ہو۔ اس مقام پر ایک پتھر پر ایک تحریر کندہ تھی۔ راقم الحروف نے اس مقام پر 23 اگست 1956ء کو اس پتھر سے وہ عبارت نقل کی تھی جو حسب ذیل تھی۔

معلوم ہوا ہے کہ اب سے چند برس قبل سردار الطاف خان لناری اس پتھر کو اٹھوا کر اپنے گھر (جو لی زیرین)
لے گئے ہیں۔ انہیں نوادرات جمع کرنے اور اُن پر تحقیق کرنے کا بڑا اشتیاق تھا مگر افسوس! عمر نے وفا نہ کی۔
اگرچہ اس تحریر کو پڑھا نہیں جا سکا، تاہم "بلتستان پر ایک نظر" مصنفہ محمد یوسف حسین آبادی سکردو نظر سے
گزری۔ اس کتاب میں ایک کتبہ کا عکس موجود ہے جو سکردو کے قریب ایک چٹان پر کندہ ہے۔
اس کا عکس درج ذیل ہے۔

متصل سکردو میں ایک چٹان پر قدیم بلتی رسم الخط میں کندہ عبارت

قدیم بلتی رسم الخط جو تبتی زبان اور رسم الخط سے ماخوذ تھا، اب سے پچھلے تقریباً پانچ صد برس سے
متروک ہو چکا ہے۔ لوگوں کے اسلام قبول کرنے پر اب اس کی جگہ عربی رسم الخط نے لے لی ہے۔ اس تحریر کو
پڑھنے کی کوشش ضرور کی گئی ہے جس کی بنا پر اندازاً اُن کی ملتی جلتی آواز کے اردو لفظ باریک الفاظ میں لکھ دیئے
گئے ہیں تاہم صحیح معنی اور آواز صرف وہ ماہر کر سکتا ہے جس کو بلتی زبان پر قدرت حاصل ہو۔ متصل سکردو کے کتبہ
اور دیگر متعلقہ حوالہ جات کے لئے جناب محمد یوسف کا مشکور ہوں جسے نقل کرنے کی اجازت انہوں نے تحریری طور پر
عنایت کی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہاں کسی زمانے میں منگول یا وسط ایشیا کے کسی وحشی قبیلے کے لشکر نے پڑاؤ
کیا یا بز کشی کھیل کا مقابلہ ہوتا ہوگا، تو تبتی یا بلتی باشندہ نے جو اُن میں شامل تھا، شغل بے شغلی میں اس پتھر
پر یہ تحریر کندہ کر دی۔ ویسے یہ بھی ممکن ہے کہ یہ علاقہ عہدِ قدیم میں ایسے لوگوں کا وطن رہا ہو جو یہ زبان بولتے
اور لکھتے ہوں۔ پرانے زمانے میں تبت ایک عظیم سلطنت تھی جس نے شمالی ہند کے بہت بڑے حصے
پر قبضہ کر لیا تھا۔

میرے ایک دوست کو ایک پکی مٹی کی مہر دلورائے کے کھنڈرات سے ملی تھی جس کو میں حاصل کرنے میں

ناکام رہا۔ ویسے یہ تحریر کرنا بے جا نہ ہوگا کہ مدت دراز تک مقامی لوگ کھنڈر سے ملنے والی اشیاء افسران بالا کو خوش کرنے کے لئے دیتے رہے جو اب پاکستان اور انگلینڈ میں بکھری ہوئی ہیں۔ اس پکی مٹی کی مہر پر یہ تحریر تھی۔
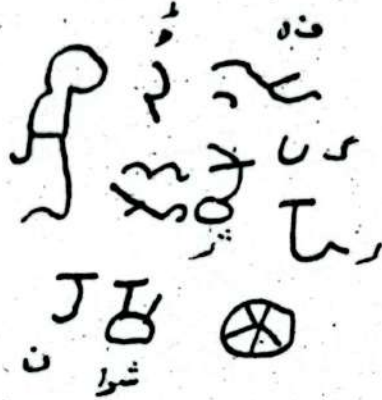
اگر اسے بھی بلتی زبان کی تحریر مانا جائے تو اُن کی آواز کے اردو مترادف نیچے تحریر کر دیئے گئے ہیں۔ یہاں یہ امر مدِ نظر رہے کہ یہ مہریں مالِ تجارت کی پہچان اور حفاظت کے لئے لگائی جاتی تھیں اور یہ صرف طغرا یعنی پہلا لفظ بطور علامت ہوتا تھا۔

دلورائے کے کھنڈرات سے کمہار کا تھاپا (ہتھوڑا) ملا جس پر یہ کندہ ہے۔

ایک گول پکی مٹی کی ٹکیہ ملی جس پر گنیش کا دوہرا نقش (سواستیکا) بنا ہوا ہے۔ سواستیکا دراصل سورج دیوتا کی علامت ہے۔ وہ نقش یہ ہے۔

ہڑبند کے مغرب میں پہاڑ کے اندر سخی سحاب کی خانقاہ کے نزدیک جانب مشرق ایک بڑے پتھر پر جسے مقامی طور پر قران کھوہ (قران والا پتھر) کہا جاتا ہے، ایک تحریر کندہ ہے۔ چونکہ اس پتھر پر عربی رسم الخط میں سلطان التمش کے ایک فوجی محمد بن عمر نے اسے کندہ کیا تھا لہٰذا عوام عربی رسم الخط کی وجہ سے قرآن کی عبارت سمجھتے رہے۔ اس کے علاوہ اسی پتھر پر ایک غیر معروف زبان میں بھی کچھ مرقوم ہے جس کا کوئی سر پیر معلوم

نہیں ہوتا۔

بسم اللہ الرحمن الرحیم

لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ

یا اللہ العبد الفقیر محمد ابن عمر

بوزنہ سلطان اعظم ....

التمش السلطان خیر باللہ ملکہ

دلو رائے کے کھنڈر سے مٹی کی ایک چھوٹی سی ٹکیہ پر ایک مہر کی چھاپ تھی جس پر حسب ذیل نقوش تھے۔

فورٹ منرو کے قریب کھدائی میں کانسی کا بنا ہوا خنجر ملا تھا۔ ہائین گیلڈرن نے اس عجوبۂ آفاق خنجر کا ذکر کیا ہے جس کے متعلق اندازہ کیا جاتا ہے کہ اسے ۱۲۰۰ ق م میں تیار کیا گیا تھا۔ ماہرین کا اندازہ ہے کہ یہ کسی بیرونی ملک سے لایا گیا تھا۔[1] اس کا عکس اصل سے نصف کر کے دکھایا گیا ہے۔
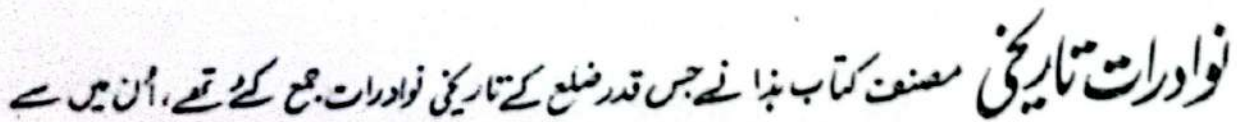
نوادرات تاریخی مصنف کتاب ہذا نے جس قدر ضلع کے تاریخی نوادرات جمع کئے تھے، اُن میں سے کچھ کی فوٹو کتاب ہذا میں شامل ہے البتہ جو نوادرات بہاولپور عجائب گھر کو دیئے تھے، اُن کے فوٹو شامل نہیں۔ بعض

1. India and Pakistan p. 85 Sir Mortimer wheeler.

نوادرات کو جو کسی کے پاس تھے اور اسی علاقے سے متعلق ہونے کے باوجود کسی قیمت پر حاصل نہ کئے جا سکے، ان میں سے چند کا تعارف کیا جاتا ہے۔

مصالحہ رگڑنے کی اینٹ

مصالحہ رگڑنے کی ایک اینٹ جس کا پتھر سرخ رنگ کا تھا، مستطیل شکل میں تھی۔ اس کی لمبائی ایک فٹ ساڑھے پانچ انچ اور چوڑائی آٹھ انچ تھی۔ اس کی اوپر والی سطح میں کثرت استعمال سے گڑھا پڑ چکا تھا۔ اس اینٹ کی پشت (نچلی طرف) کو نقوش سے مزین کیا گیا تھا۔ ایک جنگلی گھوڑے نے چار ہاتھوں والے دیوتا پر حملہ کرکے اس کے ایک ہاتھ کو اپنے منہ میں دبایا ہوا تھا۔ دیوتا نے شانِ استغنا میں ایک ہاتھ اپنی کمر پر رکھا ہوا تھا اور دوسرے ہاتھ سے گھوڑے کو تھپڑ مارنے کی حالت کو ظاہر کرنے کے لئے ہاتھ پہلو سے بڑھا رکھا ہے۔ دیوتا نے ایک ہاتھ سے گھوڑے کی گردن کو بھی دبوچ رکھا تھا۔

چار چہروں والا بت

سفید رنگ کے بیلن نما نرم پتھر پر چار چہرے بنے ہوئے تھے۔ حادثاتِ زمانہ سے صرف ایک چہرہ مکمل طور پر موجود تھا۔ تین چہرے کھدائی کے دوران مزدوروں کی ضربات سے ٹوٹ گئے تھے مگر ان میں سے دو ٹکڑے راقم نے جوڑ لیے مگر چوتھا چہرہ مسخ ہو چکا تھا مکمل چہرہ ایک مرد کا تھا جس کی داڑھی مونڈی ہوئی تھی البتہ مونچھیں لمبی اور نیچے کو جھکی ہوئی تھیں۔ دو چہرے عورتوں کے تھے جن میں سے ایک کی ٹھوڑی پر چاہِ ذقن (گڑھا) نمایاں تھا۔ ہر چہرے کی گردن میں ہار بنے ہوئے تھے مگر ہار کی بناوٹ ہر جگہ مختلف تھی۔ مرد اور ایک عورت کا تعویذ چوکور ہیں البتہ دوسری عورت کا بیلن نما ہے اور اس کے ماتھے پر قطرۂ آب نما تلک موجود ہے۔ اس عورت کے بال ماتھے سے کھینچ کر گوندھے گئے تھے۔ اس عورت کا منہ مسکراہٹ کے سبب نیم وا ہے جس سے خوبصورت دانت تھوڑے تھوڑے نظر آتے تھے۔ اس کے کانوں میں گول بندے آویزاں دکھائے گئے تھے۔ مرد نے سر پر تاج پہن رکھا تھا۔ اس کی زلفوں نے اگرچہ اس کے دونوں کان ڈھانپ رکھے تھے مگر کانوں کے بندے نمایاں طور پر نظر آ رہے تھے۔ یہ بندے لمبوترے تھے۔ مرد کے ماتھے پر ایک چھوٹا سا گول تلک بنا ہوا تھا۔ دوسری عورت جو مرد کے دائیں جانب ہے، اس کے بھی کان بالوں سے چھپے ہوئے تھے مگر لمبے بندے نظر آ رہے تھے۔ اس عورت اور مرد کے تاجوں کے درمیان کنول کی کلی بنی ہے جبکہ بائیں طرف والی عورت اور مرد کے درمیان چھ پنکھڑیوں والا پھول بنا ہوا تھا۔ اس عورت کا چہرہ سنجیدہ ہے اور ہونٹ آپس میں ملے ہوئے تھے۔

سیاہ رنگ کا بت

ایک بت جو سنگ سیاہ سے تراشا گیا تھا تقریباً دو فٹ بلند تھا۔ تاہم اس کا سر اور ایک بازو ٹوٹے ہوئے تھے۔ انسانی بت ایک بلند گدیلے

پر بیٹھا ہوا بنایا گیا تھا جس کا دایاں پاؤں لباس سے باہر نظر آتا تھا جبکہ بایاں پاؤں مکمل طور پر مستور ظاہر کیا گیا تھا۔ بایاں ہاتھ گود میں رکھا ہوا تھا جبکہ دایاں ہاتھ جو ٹانگ پر رکھا دکھایا گیا تھا، کہنی کے قریب سے ٹوٹا ہوا تھا۔ سر مجسمہ گردن سمیت ندارد تھے۔ بت کی پشت ہموار تھی۔ اسے حاصل کرنے کی بڑی کوشش کی گئی تھی مگر متعلقہ شخص فروخت کرنے پر راضی نہ ہوا۔ سنا ہے کہ اُس نے کسی تحصیلدار کو تحفہ کے طور پر دے دیا تھا۔

مندرجہ ذیل نوادرات موجود ہیں۔

مہاتما بدھ کی زندگی کے واقعات

مہاتما بدھ کی زندگی کے واقعات پر مبنی کئی ابھرواں نقوش ملے ہیں۔ چند ایک میں ہاتھی سجدہ کر کے اُن کی تعظیم کر رہا ہے۔ ایک نقش میں وہ رتھ پر سوار دکھائے گئے ہیں۔ مہا تما بدھ کے زمانے میں ایک ڈائن رہتی تھی جس کے ایک سو ایک بچے تھے۔ وہ ڈائن دوسرے لوگوں کے بچوں کی دشمن تھی اور موقع ملنے پر ان کو پکڑ کر کھا جاتی تھی۔ لوگوں نے آخر کار تنگ آ کر مہا تما بدھ سے شکایت کی۔ مہاتما بدھ کے کہنے پر لوگوں نے اس ڈائن کا ایک بچہ پکڑ کر چھپا لیا۔ ڈائن اپنے بچے کی گمشدگی پر بڑی پریشان ہوئی اور مہاتما بدھ سے اس معاملے میں طالب امداد ہوئی۔ ڈائن کی بے انتہا آہ و زاری پر انہوں نے فرمایا کہ تمہارے ایک سو سے زائد بچے ہیں۔ اگر اُن میں سے ایک کم ہو گیا تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے حالانکہ تم لوگوں کے بچے کھا جاتی ہو جن کی اولاد ایک ایک بچہ ہوتا ہے۔ ڈائن پر ان الفاظ سے جادو کا اثر ہوا اور وہ توبہ و تائب ہو کر بچوں کی محافظ دیوی بن گئی اور اُسے ہرتی دیوی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس کا بھی ایک نقش ہاتھ لگا جس میں بچے اس کی ٹانگوں اور چھاتیوں سے چمٹے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ یہ نقش بطور عطیہ جناب مسرت حسین زبیری سابق کمشنر بہاولپور کی وساطت سے بہاولپور عجائب گھر کو دیا گیا تھا۔

مورتیاں

دلورائے کے کھنڈرات سے بہت سی مورتیاں پکی ہوئی مٹی کی ملی ہیں۔ ان مورتیوں کو سانچوں پر بنایا گیا ہے۔ ایسا ایک سانچہ بھی ملا ہے جو اگرچہ غیر مکمل ہے مگر اُس سے دیوی کے جسم کا کچھ حصہ بن جاتا ہے۔ اُن لوگوں کا اعتقاد تھا کہ جو جتنا دیوی اور دیوتاؤں کے بت بنائے گا، اُسے اُتنا ثواب ملے گا۔ لہٰذا بھگت قسم کے لوگ گیلی مٹی لے کر سانچوں پر اپنے برگزیدہ دیوتاؤں اور دیویوں کے بت بناتے رہتے اور پھر اُن کو بھٹی یا آوے میں پکا لیتے۔ اس شہر کے مکین اپنے گھروں کو سجانے کے لئے کئی قسم کے بت اور مورتیاں بنا کر دیواروں میں پیوست کر دیتے تھے۔ ایک بڑے چہرے والے بت کی ساخت یونانی ہے۔ بالوں کی بناوٹ سے محسوس ہوتا ہے کہ یونانی دیوتا ہیلیوا سورج دیوتا کی شکل بنائی گئی ہے۔ اگر اسے یونانی کی بجائے ایرانی دیومالا کا مترا یا متھرا (سورج) مانا جائے تو بھی یہ یونانی ہے کیونکہ متھرا کا مذہب یونانی فوجی اپنے ہمراہ یورپ لے گئے اور یہ مذہب وہاں بھی خوب پھیلا۔ مکانوں کی آرائش و زیبائش کی غرض سے مٹی کے علاوہ نرم پتھر پر بیل بوٹے بنا کر بھی استعمال کئے

گئے ہیں۔ کہیں کہیں ان کو دیواروں میں بھی چن دیا جاتا تھا۔ دلورائے کی دیواروں کی چنائی میں صرف ریت استعمال کی گئی ہے اور کہیں بھی گارے کا استعمال نظر نہیں آیا۔ دیوار کے تعمیر ہونے کے بعد البتہ اس پر گندم کے بھوسے کو ملا کر گارے کا پلستر کر دیا جاتا تھا۔ اس کے برعکس قدیم دور میں عراق میں تمام اہم عمارتوں کی چنائی ٹک اراال یا تارکول سے کی جاتی تھی۔

مہریں: دلورائے کے کھنڈرات سے پکی مٹی کی مہریں بڑی کثرت سے ملی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مال تجارت پر ان سے مہریں لگائی جاتی تھیں۔ اکثر و بیشتر مہریں جو کھنڈر کی بالائی سطح سے ملی ہیں، اُن کی طرز یونانی ہے جس میں عموماً شیر کو ہرن پر حملہ کرتے دکھایا گیا ہے۔ بعض مہریں پھول دپتی سے مزین ہیں۔

نیزے کی انی دلورائے کے کھنڈرات میں آوارہ گردی کرتے ہوئے دیوار میں پیوست زنگ آلود لوہے کا ٹکڑا نظر آیا۔ جب اسے کھینچ کر باہر نکالا تو یہ نیزے کی انی معلوم ہوتی تھی۔ چونکہ بہت زنگ آلود تھی لہٰذا ٹوٹ کر دو ٹکڑے ہو گئی۔ اس انی کے سائز کو دیکھ کر یہ گمان بھی ہوتا ہے کہ نیزے کی انی کی بجائے چکی کا کیل ہو۔ تاہم اس کا امکان خفیف ہے کیونکہ اس کی جسامت اُس مقصد سے بڑی ہے اور اس کا دیوار میں گڑا ہوا ہونا اس امر کا امکان پیدا کرتا ہے کہ نیزے کو حملے کے دوران دشمن پر پھینکا گیا تھا۔ نیزہ دیوار میں ترازو ہو گیا اور وقت گزرنے کے ساتھ باقی حصہ گل گیا۔

کھلونے دلورائے اور دیگر کھنڈرات میں بچوں کے کھلونے بڑی کثرت سے ملے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اپنے بچوں سے بے انتہا پیار کرتے تھے اور اُن کی خوشی کی خاطر کئی قسم کے کھلونے تیار کرتے تھے۔ مٹی سے بیل، پرندے، بیل گاڑیاں، گھوڑے، شیر وغیرہ کی شکل وصورت کے کھلونے بنائے جاتے تھے۔ وہاں سے ایک مینڈھا کا کھلونا بھی ملا جس کو کمہار نے چک پر تیار کیا تھا۔ اس کے پاؤں میں سوراخ ہیں جہاں پہیئے لگا کر بچے اسے رسی سے کھینچتے ہونگے۔

مٹی کے برتن کھنڈرات سے مٹی کے پیالے اور پیالیاں بڑی کثرت سے ملی ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ پیالیاں ایک دفعہ استعمال ہونے کے بعد پھینک دی جاتی تھیں۔ قیام پاکستان تک ریلوے اسٹیشن پر کھانا اس طرح کی پیالیوں میں ملتا تھا۔ کھانا کھا کر ان پیالیوں کو پھینک دیا جاتا تھا۔ مٹی سے بنے ہوئے قربان گاہ کے طور پر استعمال ہونے والی مخروطی کرسیاں STAND کافی تعداد میں ملے ہیں۔ ان پر چھوٹی چھوٹی پیالیاں اور دیئے رکھ کر دیوتاؤں کے آگے مراسم ادا کیئے جاتے تھے۔

ایک دستے والی طشتری نما پلیٹ ملی ہے جس کے چاروں کونوں پر دیا جلانے کی جگہیں بنی ہوئی ہیں۔ سمتین لڑکیاں اپنی ایک رسم ادا کرنے میں اسے استعمال کرتی تھیں تاکہ اُن کا مناسب جگہ پر رشتہ ہو جائے۔ اسی طرح سے سمتین دور کا ایک مٹی کا لوٹا ملا ہے جس کی ٹونٹی مردانہ عضوِ تناسل سے مشابہ ہے۔

گورنر غلام جیلانی خان (پنجاب) مصنف کے تاریخی نوادرات کی نمائش منعقدہ ۱۲-۳-۱۹۸۶ ملاحظہ فرما رہے ہیں
کمشنر ڈیرہ غازی خان چوہدری محمد اشرف بھی ہمراہ ہیں

گورنر پنجاب جنرل غلام جیلانی خان مصنف کے کسی نقطہ پر محظوظ ہو رہے ہیں۔

دلورائے کے کھنڈر سے ایک شخص کو مٹی کا ایک برتن ملا جسے مصنف حاصل نہ کر سکا۔ یہ برتن پرات کی شکل میں ہے اور اس کے وسط میں گملا بنا ہوا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کھانے پینے کی اشیاء کو اس گملے نما پر رکھ کر پانی ڈال دیا جاتا تاکہ کھانا چیونٹیوں سے محفوظ رہے۔

ایک پیالہ مٹی اسی کھنڈر سے ملا تھا۔ اس کے کناروں پر تین چھوٹے چھوٹے بت لگے ہوئے تھے۔ جب وہ کوئی مشروب پیتے تو دیوتاؤں کے بت پینے والے کے چہرے سے لگ جاتے۔ اس طرح سے ان دیوتاؤں کا احترام بطور رازق کیا جاتا۔ خیال ہے کہ یہ تین دیوتا ہندو تثلیث کے شو، برہما اور وشنو ہوں گے۔ اب یہ پیالہ بہاول پور عجائب گھر میں بطور عطیہ دیا گیا ہے۔

دلورائے کے کھنڈر سے بہت سی مستطیل پکی مٹی کی ٹکیاں ملی ہیں جن پر ۳ یا ۶ یا ۹ لکیریں لگی ہیں۔ یہ ایک قسم کے کھیل میں استعمال ہوتی تھیں۔ یہ کھیل عراق میں اب بھی دودشا کے نام سے کھیلا جاتا ہے۔

سکّے مختلف جگہوں سے کئی اقسام اور زمانے کے سکے دستیاب ہوئے ہیں۔ دارا اول کا ایک سکہ جو چاندی کا ہے اور اب ٹکڑے ٹکڑے ہو کر رہ گیا ہے۔ قدیم ترین سکے جنہیں پنچ مارک یا ٹھپہ مار کہا جاتا ہے کثرت سے ملے ہیں۔ چند ایک سکے جو ایرانی ہیں، اُن پر تحریر فروشتی میں ہے۔ مسلم دور کے بھی کئی سکے ملے ہیں۔ دلورائے کے کھنڈرات کی اوپری سطح پر باختری یونانی سکے ملے ہیں۔ اس سے عیاں ہوتا ہے کہ یہ شہر سکندر اعظم کے کچھ عرصہ بعد مردہ ہو گیا۔ نچلی سطحوں سے جو سکے ملے ہیں اُن پر ایک طرف شاہ اور دوسری طرف ملکہ کی شکل ہے۔ البتہ شاہ کے سامنے آتشکدہ بنا ہوا ہے جو اس بات کی نشانی ہے کہ یہ سکہ ساسانی یا کیانی دور کا ہے۔

چاول کئی برتنوں سے چاول (چھلکے سمیت) ملے ہیں جو کوئلہ کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ ویسے یہ اصول سائنس ہے کہ ہر نباتاتی مادہ طویل مدت کے بعد کوئلہ کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ چونکہ دلورائے کا شہر تقریباً دوسری صدی قبل مسیح میں برباد ہوا۔ لہٰذا ان چاولوں کی عمر دو ہزار سال سے زیادہ ہے۔ سابق گورنر پنجاب جنرل غلام جیلانی خان نے جب میرے نوادرات کا مشاہدہ کیا تو چاولوں کو دیکھ کر فرمایا کہ انہوں نے اس سے پہلے پرانے چاول صرف نالندہ (ہند) میں دیکھے تھے۔

آئینہ سلیٹ نما سیاہ رنگ کے چوکور پتھروں کے درمیان آئینہ لگایا جاتا تھا۔ یہ مختلف شکل و صورت کے ہیں مگر بدقسمتی سے کسی میں بھی شیشہ لگا ہوا نہیں ملا۔

کانسی کی دیوی ایک چھوٹا سا دیوی کا بت ملا ہے جو تانبے کے ایک مرکب سے تیار ہوا ہے۔ اس بت کے کچھ حصے ضائع ہو چکے ہیں۔ یہ بت نہایت قدیم معلوم ہوتا ہے۔ اس کو اندازاً چھ ہزار سال پرانا تصور کرنا چاہیے۔

تین چہروں والا بت

وہی بت دوسرے پہلو سے
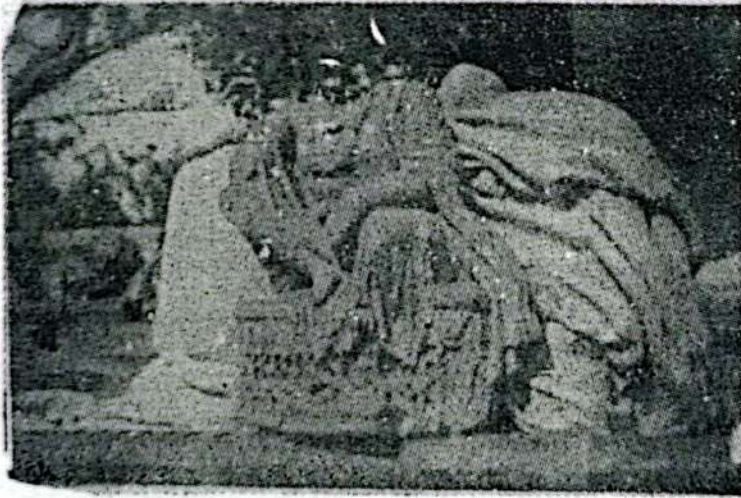
سیاہ پتھر کا بنا ہوا بت

دلوراٹے شہر کی بیرونی حفاظتی چوکی کا منظر جو شمال مشرق میں واقع تھی یہ فوٹو مصنف نے ۱۹۵۲ء میں لیا تھا۔
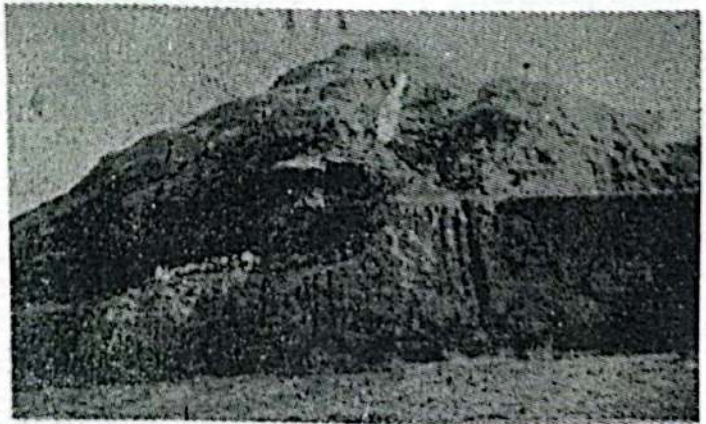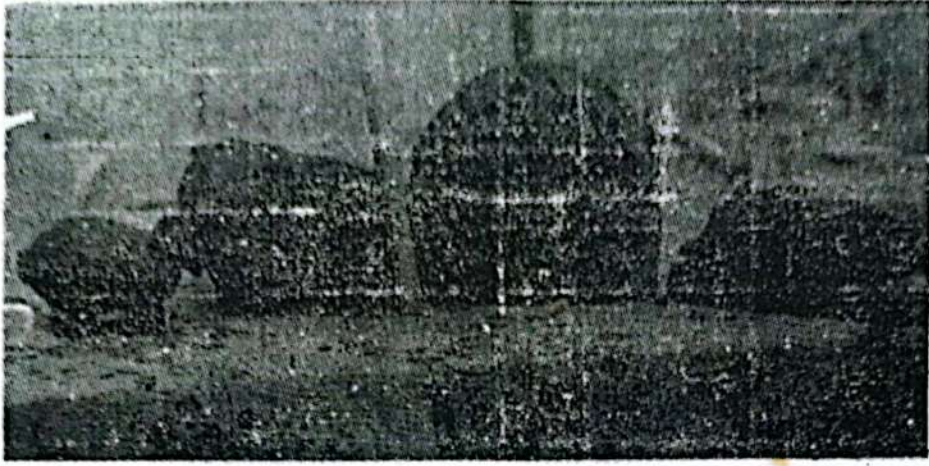
مینڈھا، نمائشی پھول۔ سورج دیوتا متھرا۔

مصالحہ رگڑنے والی اینٹ پر نقش

ضلع ہذا سے کافی تعداد میں مجرات جمع کئے گئے ہیں۔ ان میں بیج، پھل، گھونگے وغیرہ شامل ہیں۔

مجرات : سمندری گھونگے کوہ سلیمان کی چوٹیوں سے بھی جمع کئے گئے ہیں۔ عجیب وغریب بیج بھی ملے۔ سخی سرور کے قریب سے ایک پتھر ملا جس میں مکمل مجرآم کا پھل موجود ہے۔ مچھلی کے پروں اور کانٹوں کے مجرات بھی ملے۔ کئی عظیم الجثہ جانوروں کے دانت اور پرندوں کے انڈے بھی دستیاب ہوئے جو ڈائنوسار کی چھوٹی نسل کے ہیں۔

جدول رسم الخط چونکہ یہاں تا حال کوئی باقاعدہ کھدائی نہیں ہوئی اس لئے کہا نہیں جا سکتا کہ زیر زمین کیا کچھ دفن ہے؟ باہر کی علامات سے جن رسوم الخط کا امکان ہو سکتا ہے اُن کی جدول مستقبل کے مورخین کی سہولت کی خاطر کتاب ہذا میں درج کی جا رہی ہے۔

قدیم یونانی	انگریزی		یمنی	فنیقی	مینی	یونانی	لاطینی	عربی
A P	A		ከ	≮	⋿	A	A	ا
B	B		∩	9	II	B	B	ب
∠	G		٦	^	T	Γ	C G	ج
Δ	D		9	Δ	[illegible]	Δ	O	د
E	E		Y Y	∃	⋿	E	E	ء
F	F		Φ	Y	Ў	Y	F V	و
I	Z		8	≖	π	I	...	ر
θ	H		Ψ ᛉ	⊟	⋀	B	H	ح
⊗ ⊕	TH		◫	⊕	⫩	⊗	...	ط
I	I		9	Z	≢	S	I	ی
K	K		ኣ	⋠ ⋡	⊶	K	...	ک
Λ	L		1	6 L	ᛖ	L Λ	L	ل
⌒	M		8	ᛗ	⊸	M	M	م
N	N		ᒉ	५ ᒉ	⫩	N	N	ن
☰	X (SH)		X	≡	Ϙ	☰	X	س
O	O		O	O	Δ	O	●	غ
Γ	P		◇	1J)	⋿	Γ	P	ف
Ϙ	Q		ሸ ሽ	Z	ᛗ	...	...	ص
P	R		9	Φ	⊢⊣	9	Q	ق
M S	S		))	4	[illegible]	P	R	ر
T	T		3	W	⊲	ξ	S	س ش
V	U		X	X	⊢	T	T	ت ٹ
Φ	PH							
X	KH							
Ψ	PS							

باب 12

تحریک پاکستان

ضلع ڈیرہ غازی خان کے عوام جس طرح دیگر اضلاع کے مقابلے میں اقتصادی، تعلیمی، زرعی لحاظ سے پسماندہ تھے، اُسی طرح سے سیاسی لحاظ سے بھی بے خبر تھے۔ اُن کی اکثریت اس قدر غریب اور مفلس تھی کہ اُسے دو وقت کی روکھی سوکھی روٹی تک میسر نہ تھی۔ دیہات میں لوگ قوت خرید نہ ہونے کے سبب کئی کئی روز تک فاقہ کرتے۔ علاقے میں بدترین قسم کا جاگیردارانہ نظام قائم تھا جس کی وجہ سے تمام دولت اور ذرائع پیداوار چند لوگوں کے ہاتھ میں تھے۔ اس ہولناک جاگیردارانہ نظام کی انگریز پوری طرح سے پشت پناہی کر رہے تھے۔ انگریزوں کے اصولِ سیاست دیگر علاقوں میں خواہ کچھ ہوں مگر اس بدنصیب خطے میں جاگیرداروں کی تجوریاں کو پُر کرنے کے لیے لوگوں کی بیٹیوں تک قرق کیا گیا۔ ذرہ چشم تصور سے اُس وقت کا اندازہ کریں جب ایک بے گناہ بچی کو قرق کر کے زبردستی ماں باپ سے جدا کیا جا رہا ہو۔ ان حالات میں عوام کے لئے تعلیمی مواقع نہایت محدود تھے۔ مسلمانوں کی مالی حالت اس قدر کمزور تھی کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم پر اٹھنے والے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ تعلیم کے حصول کی مشکلات کے باوجود جب غریبوں کے بچے تعلیم حاصل کر لیتے تھے تو ان کو ملازمت نہیں ملتی تھی۔ کارخانے اور فیکٹریاں اُس دور میں مفقود تھیں۔ اُس دور میں صرف طبقہ امراء ان جسے اُس دور میں طبقہ شرفاء کہا جاتا تھا اور باقی لوگوں یعنی عوام کو کم ذات اور کمین تصور کیا جاتا تھا۔ یعنی تمندار ان کے خاندان یا سفارشی ہی سرکار انگریزی کے ہاں ملازمت حاصل کر سکتے تھے۔ عوام کو ہر طریقے سے سرکاری ملازمت سے دور رکھا جاتا تھا تاکہ لوگ پڑھ لکھ کر اپنے شہری اور انسانی حقوق سے واقف نہ ہو جائیں۔ جب حالات ایسے ہوں تو عوام میں سیاسی بیداری کا کوئی امکان نہیں ہو سکتا۔ ایسے ہمت شکن حالات میں ایک معجزہ ظہور پذیر ہوا۔

قائداعظم محمد علی جناح نے جب نعرۂ حق بلند کیا کہ برصغیر میں صرف ایک قوم آباد نہیں بلکہ اس میں رہنے والی دو قومیں مسلمان اور ہندو ہیں جن کے تمدن بالکل جدا ہیں تو اس آواز پر سارے برصغیر میں بیداری کی لہر دوڑ گئی اور مسلمانوں کی خوابیدہ قوم انگڑائی لے کر اپنے حقوق حاصل کرنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس سلسلہ میں اس ضلع کے عوام نے جاگیرداری کی تمام زنجیریں توڑ کر ثابت کر دیا کہ اگر انہیں صحیح قسم کا راہنما مل جائے تو وہ بہت کچھ کرنے کے قابل ہیں۔ علامہ اقبال نے اپنی قوم کی خوابیدہ قوتوں کا صحیح اندازہ کر کے فرمایا

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اور پھر ثابت کر دیا کہ یہاں کے باسی اپنے قائد کے فرمان پر لبیک کہنے والے ہیں۔ تحریکِ پاکستان کے بالکل ابتدائی ایام میں جناب شیخ شیر محمد پاکستانی نے پاکستان کے حق میں قلمی جہاد کیا۔ اُس نے جب بھی قلم اٹھایا، حق گوئی کے ساتھ قلم کا حق ادا کر دیا۔ اُس کا قلم صرف اور صرف حق کے لئے اٹھا۔ شیخ شیر محمد پاکستانی شہر ڈیرہ غازی خان کے سکونتی تھے اور صحافت سے منسلک تھے۔ پاکستان کے حق میں اُس کے مضامین قندیل، مخزن، نوائے وقت، امروز وغیرہ میں شائع ہوتے رہے اور انہوں نے قیامِ پاکستان کے حق میں انتھک جدوجہد کی۔ پاکستان سے محبت اور خلوص کی انتہا یہ تھی کہ قیامِ پاکستان سے قبل اپنے نام کے ساتھ پاکستانی لکھتے تھے۔ میرا اندازہ ہے کہ یہ اعزاز صرف انہیں حاصل ہے۔ وہ کوئی صاحبِ ثروت نہ تھے۔ اپنی معمولی مالی حیثیت کے باوجود پاکستان کے حصول کو اپنی زندگی کا مطمع نظر بنا لیا اور اس غرض سے کسی بھی قربانی سے دریغ نہ کیا۔ پاکستان کے حق میں انہوں نے مضامین اور فیچر لکھے اور پاکستان کے لئے قلمی جہاد کیا۔ جو ضلع ڈیرہ غازی خان میں مسلم لیگ کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کا باعث بنا۔ قیامِ پاکستان کے بعد بھی اُن کی روش میں کوئی فرق نہ آیا اور ان میں پاکستان کو طاقتور اور مضبوط دیکھنے کی لگن زندہ رہی۔ جب وہ کوئی کام ملک و ملت کے حق میں غیر مفید دیکھتے تو بغیر کسی خوف، اس کے متعلق اخبارات میں تذکرہ کرتے۔ پاکستان میں غیر جمہوری کردار والے سیاستدانوں اور غلط کار سرکاری افسران اُن کے سخت خلاف ہو گئے۔ ان لوگوں نے اُسے اپنے حق میں کانٹا سمجھ کر کئی بار زدوکوب کیا اور جسمانی اذیت دی۔

اس دور میں پنجاب میں یونینسٹ حکومت قائم تھی جس میں اکثر و بیشتر بڑے بڑے زمیندار شامل تھے۔ اس ضلع سے بھی صرف تمندار نمائندے بن کر جاتے تھے جو اسمبلی میں جا کر سوتے یا گپ شپ لڑاتے تھے۔ ان لوگوں کو علاقے کی فلاح و بہبود سے قطعاً کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اُن کی بلا سے! لوگ بھوکے مرتے ہیں تو انہیں کیا۔ اُن کی تجوریاں سیم و زر سے پُر تھیں۔ سابقہ پنجاب اسمبلی کا ریکارڈ اس امر کا شاہد ہے کہ اس ضلع کے کسی ممبر، جو سب تمندار ہوا کرتے تھے، انے اسمبلی میں کبھی کسی بحث میں حصہ نہیں لیا اور نہ ہی علاقے کے مسائل کو پیش کیا۔ ایسے پُر آشوب دور میں شیر محمد پاکستانی نے وہ فرض ادا کیا جو اس ضلع کے ممبرانِ اسمبلی کو کبھی نصیب نہ ہوا۔

دسمبر ۱۹۴۵ء میں دو قومی نظریے کی بنیاد پر پنجاب میں الیکشن کرانے کا فیصلہ ہوا۔ حکومت ہند، پنجاب میں یونینسٹ جماعت کو کامیاب دیکھنا چاہتی تھی تا کہ کہا جا سکے کہ پنجاب میں مسلم لیگ کو کوئی وقعت اور قوت حاصل نہیں۔ یونینسٹ پارٹی کا ... ملک خضر حیات خان ٹوانہ تھا۔ اُسے قوی امید تھی کہ وہ جاگیردار طبقے کی امداد سے مسلم لیگ کو شکست دینے میں کامیاب ہو جائیگا اور اس طرح اپنی حکومت کو برقرار رکھ سکے گا۔ ضلع ڈیرہ غازی خان کے حلقہ شمالی ریاہ یگاد سے ضلع کی شمالی حد تک اس میں کئی امیدوار الیکشن کے لئے کھڑے ہوئے، مسلم لیگ کی طرف سے سردار عطا محمد خان بزدار کو نامزد کیا گیا۔ افسر مجاز نے

فنی وجوہات کی بنا پر تمام امیدواروں کے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیئے ماسوا سردار عطا محمد خان جو اس سیٹ پر بلا مقابلہ کامیاب ہو گئے۔ پنجاب میں وہ واحد امیدوار تھے جو بلا مقابلہ کامیاب ہوئے اور اس طرح سے حکومت کے ایوانوں میں زلزلہ آ گیا۔ خضر حیات خان کا ایک خصوصی نمائندہ سردار عطا محمد خان کے لئے یہ پیش کش لے کر آیا کہ اگر وہ مسلم لیگ سے مستعفی ہو جائیں تو وزارت کے علاوہ دو مربعہ اراضی بھی دی جائے گی۔ مگر خضر حیات نے سرزمین ڈیرہ غازی خان کے اس سپوت کے کردار کا اندازہ لگانے میں سخت غلطی کی تھی۔ انہوں نے اس پیش کش کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا۔ کاغذاتِ نامزدگی کی جانچ پڑتال کرنے والے افسر کے فیصلے کے خلاف حکومت نے اپیل دائر کی اور فیصلہ سردار عطا محمد خان کے خلاف ہوا۔ جب انتخاب کرانے کا فیصلہ ہوا تو یونینسٹ پارٹی کی طرف سے امیر محمد خان قیصرانی کو امیدوار کھڑا کیا گیا۔ (یہاں یہ یاد رہے کہ یہ صاحب سربراہ تمنداررہ چکے تھے اور وفات پر انہیں مسجد کے احاطے میں دفن کرنے پر مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا اور آخر کار میت کو وہاں سے نکالنا پڑا)۔ اُسے کامیاب کرانے کے لئے حکومتِ وقت کی تمام مشینری اس کی امداد میں بروئے کار لائی گئی۔ مسلم لیگی امیدوار کے لئے اللہ کی امداد اور عوام کا خلوص تھا۔ یہ انتخابی مقابلہ آزمائش حیثیت اختیار کر گیا۔ کیونکہ اس دور میں ضلع ڈیرہ غازی خان نہایت پسماندہ علاقہ تھا۔ جس کے چاروں طرف جغرافیائی رکاوٹوں نے آمدورفت کے تمام ذرائع کو اگر مسدود نہیں کر رکھا تھا تو مشکل ضرور بنا دیا تھا۔ مشرق میں بے لگام ٹھاٹھیں مارتی ہوئی دریائے سندھ کی لہریں تھیں جن کو پار کرنے کا موسم گرما میں واحد ذریعہ ایک بحری جہاز تھا جس کے سفر میں بعض اوقات بیس گھنٹے تک لگ جاتے تھے ورنہ عام حالت میں بھی پانچ گھنٹے لگ جاتے۔ باقی اطراف میں سڑکیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ اُس دور میں ڈیرہ غازی خان کو "کالا پانی" سمجھا جاتا تھا اور یہاں عموماً سرکش اور عتاب زدہ افسران کو بطور سزا تعینات کیا جاتا تھا۔ جس ضلع کی یہ حالت ہو، وہاں کے عوام کی پسماندگی کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔ مسلم لیگ کو اپنی مقبولیت ثابت کرنے کے لئے یہی کافی تھا کہ اگر ایسے پسماندہ علاقے میں عوام پاکستان چاہتے ہیں تو دیگر علاقوں کے لئے مزید ثبوت فراہم کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس انتخاب کی اہمیت کے پیشِ نظر پنجاب کے وزراء میاں محمد ابراہیم برق، لہری سنگھ اور مظفر علی خان قزلباش نے یہاں مستقل ڈیرے ڈال دیئے۔ مسلم لیگ کے نامی گرامی اکابرین مثلاً میاں ممتاز دولتانہ، نواب ممدوٹ، میاں اللہ یار خان، میاں افتخار الدین، نواب عاشق حسین قریشی، راجہ غضنفر علی خان وغیرہ نے ڈیرہ غازی خان کا رخ کیا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے پانچ صد طلبا کا ایک گروہ بھی اس کارِ خیر کے لئے آیا۔ اسی طرح سے ایمرسن کالج ملتان اور اسلامیہ کالج لاہور کے طلبا بھی اس مہم کی کامیابی کے لئے ڈیرہ غازی خان پہنچے۔ ڈیرہ غازی خان سے بھی بہت سے کارکن ان میں شامل ہو گئے۔ ان کارکنوں میں ڈاکٹر محمد فضل الرحمٰن خان بلاک ۱۳ اور اخوند عبدالحمید خان خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ فضل الرحمٰن خان اپنے دیگر رفقاء کے ہمراہ قریہ قریہ پیدل گھومتے رہے۔ دیگر زعما کا بھی یہی حال تھا کیونکہ اُس دور میں آج کی طرح سفری سہولتیں میسر نہ تھیں۔ ان طلباء، کارکنان اور مسلم لیگی اکابرین نے سخت موسم میں جبر جانفشانی کا مظاہرہ کیا

وہ قابلِ ستائش ہے۔ انہوں نے بھوکا پیاسا رہ کر اور آرام و سکون سے محروم ہو کر قیامِ پاکستان کی خاطر دوڑ دھوپ میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ انہوں نے تمام ذاتی آسائشوں کو چھوڑ کر کام کی لگن میں طویل سفر کئے مگر حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے حکومتِ وقت لوگوں کے جذبہ اور شوقِ حصولِ پاکستان کو دیکھ کر گھبرا گئی اور اپنے امیدوار کو کامیاب کرانے کے لئے ڈیرہ غازی خان میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دیا تاکہ لوگ اکٹھے نہ ہو سکیں۔ اس حکم کی پرواہ نہ کرتے ہوئے عوام نے زبردست جلوس نکالا اور پاکستانی چوک میں ایک عظیم الشان جلسہ عام میں میاں افتخار الدین نے دفعہ ۱۴۴ کو توڑ دیا۔ عوام کا جذبہ اور شوق اپنی انتہا کو پہنچ گیا۔ پولیس نے عوام پر لاٹھی چارج کیا۔

جب جلوس پر لاٹھی چارج ہوا تو لوگوں میں افراتفری پھیل گئی مگر بہت سے لوگ پولیس کے تشدد کے باوجود اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ مسلم لیگ کا پرچم استاد غلام حیدر المعروف "بھٹر" کے ہاتھ آ گیا۔ پولیس نے اس پر لاٹھیوں کی بارش کر دی مگر اُس نے علم کو سرنگوں نہ ہونے دیا۔ جب اُس نے ہر ضرب کو اپنی جان پر پڑنے کے باوجود پرچم کو نہ چھوڑا تو پولیس والوں نے اُس کے ہاتھوں پر شدید ضربات لگائیں جس سے اُس کے ہاتھوں سے خون جاری ہو گیا۔ اس کے باوجود اس مردِ دلیر نے قرونِ اولیٰ کے مسلمان مجاہدوں کی مانند ہر ضرب کو اپنے بدن پر برداشت کیا مگر ملی عَلم کو سرنگوں نہ ہونے دیا۔ جب اُس کے ہاتھوں میں عَلم سنبھالنے کی طاقت نہ رہی تو اُسے اپنے سینے سے لگا لیا تاکہ گرنے سے بچایا جا سکے۔ پولیس نے اپنی پوری طاقت صرف کی مگر اس جیالے کے منہ سے آہ تک نہ نکلی۔ پولیس نے اُسے درسِ عبرت دینے کے لئے اُس کے گلے میں انگلیاں ڈال کر چیرنے کی کوشش کی جس سے اُس کے منہ سے خون جاری ہو گیا۔ زندہ قومیں اپنے ایسے جیالوں اور جانفروشوں کو ہمیشہ عقیدت اور احترام سے یاد رکھتی ہیں۔

جب ووٹ ڈالنے کا مرحلہ ختم ہو گیا تو ووٹ والا صندوقچہ کمرہ خزانہ میں افسر خزانہ کی تحویل میں دے دیا گیا تاکہ دوسرے روز ووٹوں کی گنتی کی جا سکے۔ لوگوں کے جذبات دیکھ کر حکومت کو اندازہ ہو چکا تھا کہ مسلم لیگ کا امیدوار بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گا لہٰذا انہوں نے بیلٹ بکس (ووٹوں والا صندوقچہ) کو توڑ کر ووٹ والی پرچیاں تبدیل کرنے کا پروگرام بنایا۔ میاں محمد ابراہیم برق نے چودھری قادر بخش افسر خزانہ کو بلوایا اور اُسے مال خانہ کی چابیاں لا دینے کا حکم دیا اور اُسے اعلیٰ ترقی کی نوید بھی سنائی۔ چودھری قادر بخش نے معاملہ اگلی رات پر ٹال کر نواب عاشق حسین قریشی کو کل حالات سے مطلع کر دیا۔ انہوں نے مسلم لیگی زعماء کو آگاہ کر دیا جنہوں نے مسٹر سلیڈ ڈپٹی کمشنر ڈیرہ غازی خان سے وہاں پر مسلم لیگی پہرہ دینے کی اجازت حاصل کر لی۔ تاکہ تالا نہ توڑا جا سکے۔ جب نتیجہ نکلا تو سردار عطا محمد خان بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے اور سرکاری امیدوار کی ضمانت بھی ضبط ہو گئی اس ناکامی سے بوکھلا کر حکومت پنجاب نے مسلم لیگ کے صدر دفتر لاہور کی تلاشی لینے کی کوشش کی مگر مسلم لیگ نے اس کی اجازت نہ دی اور اس کی وجہ سے نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی جس کے نتیجہ میں خضر حیات خان نے 3 مارچ ۱۹۴۷ء کو اپنا استعفیٰ پیش کر دیا۔ اس ضلع میں تمنداروں نے عوام کی رگِ جاں میں اپنے خونیں پنجے گاڑ رکھے تھے اور حکومت کے ایماء پر تمندار

نے لوگوں سے دھونس اور دھمکی کے ذریعہ ووٹ امیر محمد خان کے حق میں حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ویسے بھی سرکاری امیدوار اُن کے گروہ کا آدمی تھا تاہم اس علاقے کے غریب مگر غیور عوام نے سردار عطا محمد خان بزدار کو واضح اکثریت سے کامیاب کیا۔ یہ الیکشن یونینسٹ پارٹی کے تابوت میں آخری کیل ثابت ہوا اور عوام نے ثابت کر دیا کہ لوگ قیام پاکستان کے حق میں ہیں اور مسلم لیگ اُن کی نمائندہ جماعت ہے۔

ضمیمہ نمبرا

ذگری

تاریخ ڈیرہ غازی خان جلد اوّل کے صفحہ 260 پر ذگریوں کا کچھ حال ہے۔ یہ حالات نہ صرف نامکمل اور تشنہ تھے بلکہ اس میں تاریخی حقائق پر مکمل روشنی نہیں پڑتی۔ ان حالات میں ذگریوں کے حالات کو ضمیمہ کی صورت میں درج کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔

ذگری سیّد محمدؒ کے پیروکار ہیں۔ تاریخ میں اس نام کے دو حضرات کا پتہ چلتا ہے۔ ایک سیّد محمدؒ اٹکی (رہائشندہ اٹک پنجاب) اور دوسرے سیّد محمدؒ جون پوری ہیں اور اکثر اوقات ان کو خلط ملط کر دیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ سیّد محمد جون پوری کے پیروکار جو مہدوی کہلاتے ہیں، سیّد محمدؒ اٹکی کے پیروکاروں کو یہ باور کرانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ سیّد محمدؒ جون پوری اور سیّد محمدؒ اٹکی ایک ہی شخص ہے۔ اس سلسلے میں مہدوی فرقے کے رہنما شہاب الدین عبداللہی اپنے مذہب کی کتب لے کر موضع کمگ، مکران آیا اور ذگری سربراہوں کو یقین دلایا کہ ملا اٹکی اور جون پوری ایک ہی شخصیت ہیں۔ کچھ ذگری اس پر ایمان لائے اور اپنے مذہب کو ذگری مہدوی لکھتے ہیں تاہم ان میں مذہبی تضاد پایا جاتا ہے۔ بہرحال سن وسال کو مدنظر رکھتے ہوئے اس امر پر یقین کرنا مشکل ہے کیونکہ سیّد محمدؒ جونپوری 1443ء تا 1505ء زندہ رہے جبکہ ملا اٹکی مکران میں 1569ء میں ظاہر ہو کر 1619ء میں روپوش ہوا۔

ذگری مذہب کا بانی ملا محمدؒ اٹکی 977ھ مطابق 1569ء مکران میں وارد ہوا۔ وہ پنجاب کے ضلع اٹک کا رہنے والا تھا۔ شاہ فقیر اللہ قسکار پوری کی تحقیق کے مطابق ذگری دراصل خلقیہ فرقہ ہے جو خارجیوں کی ایک شاخ ہے۔ یہ فرقہ بلوچستان میں دامی یا ڈامی کے نام سے بھی جانا جاتا ہے۔ ملا محمد اٹکی نے بلوچستان کے جاہل لوگوں کو اپنے دام فریب میں پھنسایا اور مہدی کا دعویٰ کیا۔ اس نے ایک کتاب لکھ کر ایک پرانے جنڈ کے کھوہ میں رکھ دی اور لوگوں کو بتایا کہ اُسے الہام کے ذریعہ کتاب کا بتایا گیا ہے جو اس پر نازل ہوئی ہے۔ اس نے مریدوں کے ساتھ جا کر وہ کتاب اٹھائی کتاب کا نام برہان یا برہان التاویل رکھا۔

تربت (مکران) میں ملا مراد ایک بااثر شخص تھا جو اس کا حلقہ بگوش ہو گیا جسے اُس نے اپنا خلیفہ مقرر کیا اسلامی ناموں کی طرز پر ایک درخت، کوہ مراد، میدان عرفات کے لئے گل گیاڈان، زمزم کے لیے کاریز ہزاڑ وغیرہ مقرر کئے جو مقدس قرار دیے گئے۔ کوہ امام غارِ حرا قرار پایا۔ جب ملا اٹکی وہاں سے روپوش ہوا تو اپنی چادر کو زمین میں اس طرح دفن کیا کہ

اس کا ایک سرا زمین سے باہر رہا۔ مریدوں نے مشہور کیا کہ مہدی ایک نور تھا اور آسمانوں میں چلا گیا ہے۔

ذگری عقائد

ذگری اپنے عقائد کو خفیہ رکھتے ہیں۔ لہٰذا زیادہ معلومات حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ ذگریوں کا مہدی محمد اٹکی ہے۔ وہ خدا کا نور ہے۔ جب مہدی (اٹکی) آسمانوں کی سیر کر رہا تھا تو فرشتے اُس کے نور کو دیکھ کر ستر ہزار برس تک بے ہوش پڑے رہے۔ مہدی ایسا نور ہے جس کا نہ باپ ہے نہ ماں۔ بلوچی میں ذگریوں کو ڈاہی یعنی داعی کہا جاتا ہے۔ قرآن چالیس اجزاء پر مشتمل تھا جن میں سے مہدی نے دس جزو نکال لئے جو قرآن کا مغز تھے۔ ذگری اپنے کو چہروک یعنی آنکھوں کی روشنی والا یعنی صاحب بصیرت کہتے ہیں جبکہ وہ مسلمانوں کو کین قول یعنی چوتڑوں کو اوپر اٹھانے والے، کیونکہ مسلمان سجدہ کرتے ہیں۔ اس کا مطلب بے وقوف بھی ہے۔

ذگریوں کا مہدی ملا محمد اٹکی 69 15ء میں ظاہر ہو کر 1029ھ مطابق 1619ء روپوش ہوا۔ اس کا خلیفہ ملا مراد گچکی بنا۔ 1627ء میں ابوسعید بلیدی نے میر عیسیٰ گچکی کے تعاون سے کیچ مکران کے حاکم ملک مرزا کو قتل کر کے فرمانروا بن گیا۔ اُس نے کیچ اپنے پاس رکھا مگر پنجگور کا علاقہ گچکیوں کو دے دیا۔ بلیدی خاندان میں کل نو حکمران ہوئے جن کے نام
۱۔ میر ابوسعید۔ ۲۔ شیخ شکر اللہ ۳۔ شیخ قاسم۔ ۴۔ شیخ زہری۔ 5۔ شیخ حسین۔ 6۔ شیخ احمد۔ 7۔ شیخ عبداللہ 8۔ شیخ قاسم۔ 9۔ شیخ بلال۔ آخری حکمران شیخ بلال نے اسلام قبول کر لیا۔ اس وقت ملا مراد فوت ہو چکا تھا اور اس کا بیٹا ملک دینار ذگری مذہب کا خلیفہ تھا۔ اُسے شیخ بلال کے اسلام قبول کرنے پر سخت غصہ آیا اور کیچ پر حملہ کر کے علاقے پر قابض ہو گیا۔ اس جنگ میں شیخ بلال مارا گیا اور 1153ھ میں تمام مکران پر گچکی قابض ہو گئے اور بلیدی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ شیخ بلال کے علاوہ تمام بلیدی حکمران ذگری مذہب کے پیروکار تھے۔ بلیدی اقتدار کے دوران ذگری مذہب کا خوب پرچار کیا گیا جس کی وجہ سے یہ مذہب دیگر قبائل میں بھی پھیل گیا۔

میر نصیر خان والئے قلات اسلامی جذبے سے سرشار حکمران تھا اور وہ فقیر اللہ شاہ ساکن شکارپور (سندھ) کے معتقد تھے۔ اُن کی تاکید پر 1774ء میں تربت پر حملہ کیا گیا۔ ملک دینار فرار ہو کر تمپ پہنچا۔ وہاں اُسے گرفتار کر لیا گیا۔ اُسے تین دن تک دعوتِ اسلام دی گئی مگر وہ اپنے اعتقادات پر قائم رہا۔ آخر کار اُسے مرتد قرار دے کر سر قلم کر دیا گیا۔ سر قلم کرتے وقت میر نصیر خان نے یہ شعر پڑھا۔

دینِ احمد چونکہ بر ما یار شد
طوقِ لعنت بر ملک دینار شد

یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دین نے جب ہماری مدد کی تو لعنت کا پھندا ملک دینار کی گردن میں پڑا۔ ملک دینار کا بیٹا شیخ عمر ناصر آباد کے قلعہ میں محصور ہو گیا مگر جلد ہی گرفتار کر لیا گیا۔ وہ قید میں اپنے اعتقادات سے تائب ہو گیا۔ میر نصیر خان نے اُسے دوبارہ کیچ کا سردار مقرر کر دیا۔ اس نے اسلام کے لئے بہت کام کیا تاہم ذگری اُس کے مخالف بن

گئے اور موقع پاکر اُسے قتل کردیا۔

اعتقادات

1۔ فرشتوں نے مہدی (اٹکی) کے نور کو دیکھ کر جب پوچھا کہ یارب! تیرے اور محمدؐ مہدی کے درمیان کیا فرق ہے؟ فرمایا کہ وہ مجھ سے اور میں اُس سے ہوں۔

2۔ مہدی (اٹکی) تمام انبیاء سے افضل ہے۔ ہر پیغمبر کو مہدی کا اقرار لازمی ہے خواہ وہ اولوالعزم پیغمبر ہی کیوں نہ ہو۔

3۔ خدا عاشق ہے اور مہدی (اٹکی) اُس کا معشوق ہے۔

4۔ خاتم النبین نور محمدؐ اٹکی ہے۔

5۔ معراج کی رات اللہ نے رسول اللہ (محمدؐ عربی) کا مہدی (اٹکی) سے تعارف کراتے ہوئے فرمایا یہ "مہدی" ہیں۔ اُن کے اعتقاد کے مطابق رسول اللہ (محمدؐ عربی) کا نام احمدؐ ہے۔ محمدؐ تو مہدی کا نام ہے۔ رسول اللہ (محمدؐ عربی) نے تسلیم کیا کہ وہ احمدؐ ہیں، محمدؐ نہیں کیونکہ نور محمدؐ ہی، خاتم النبین اور محمدؐ تم ہو۔

6۔ اللہ نے حضرت موسیٰ سے فرمایا کہ تم اگر "مہدی" کا اقرار نہ کرو گے تو آگ میں جلا دیئے جاؤ گے۔

7۔ مہدی کا منکر کافر ہے اور اس کو جھوٹا کہنے والا بھی کافر ہے۔

8۔ قرآن مجید اگرچہ محمدؐ عربی پر اُترا لیکن مہدی (اٹکی) کے لئے نازل ہوا۔ لہٰذا وہی اسکی تفسیر و تعبیر معتبر ہوگی جو مہدی (اٹکی) سے منقول ہونگی۔ اسی بنا پر صاحب تاویل مہدی (اٹکی) ہے۔

9۔ ملا شہدوست (ذگری ملا) کے مطابق قرآن کی باتوں پر یقین رکھو کیونکہ قرآن میں ہے کہ حضرت محمدؐ عربی) کا زمانہ گذر گیا۔ اب اس دنیا میں مہدی (اٹکی) کا نور ظاہر ہوگیا ہے۔

10۔ محمدؐ (عربی) کا زمانہ گزر گیا۔ اب مہدی کا زمانہ ہے لہٰذا مہدی کا کلمہ پڑھنا ضروری ہے جو لا الہ الا اللہ نور پاک نور محمد مہدی رسول اللہ ہے اس کا منکر کافر ہے۔

ذگریوں کے کلمے حسبِ ذیل ہیں۔

1۔ لا الہ الا اللہ نور پاک نور محمدؐ مہدی رسول اللہ

2۔ لا الہ الا اللہ نور پاک نور محمدؐ مہدی مراد اللہ

3۔ لا الہ الا اللہ نور پاک نور محمدؐ مہدی خلیفۃ اللہ

4۔ لا الہ الا اللہ نور پاک نور محمدؐ سرِ مکنون اللہ

1۔ اس مضمون میں زیادہ تر حالات لبصد شکریہ "ذگری مذہب اور اسلام" از [illegible] اسحاق 1978ء سے لیئے گئے ہیں۔

تاریخِ ڈیرہ غازی خان (حصہ دوم)

کتاب مملوکہ: محمد رمضان معینی (التونسہ شریف)

Mob.# 0337-7163762

PDF کاپی: محمد عامر ملغانی (پی ایچ ڈی اردو سکالر)

Mob# 0345-7141361